قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2020 قیمت ₹15

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

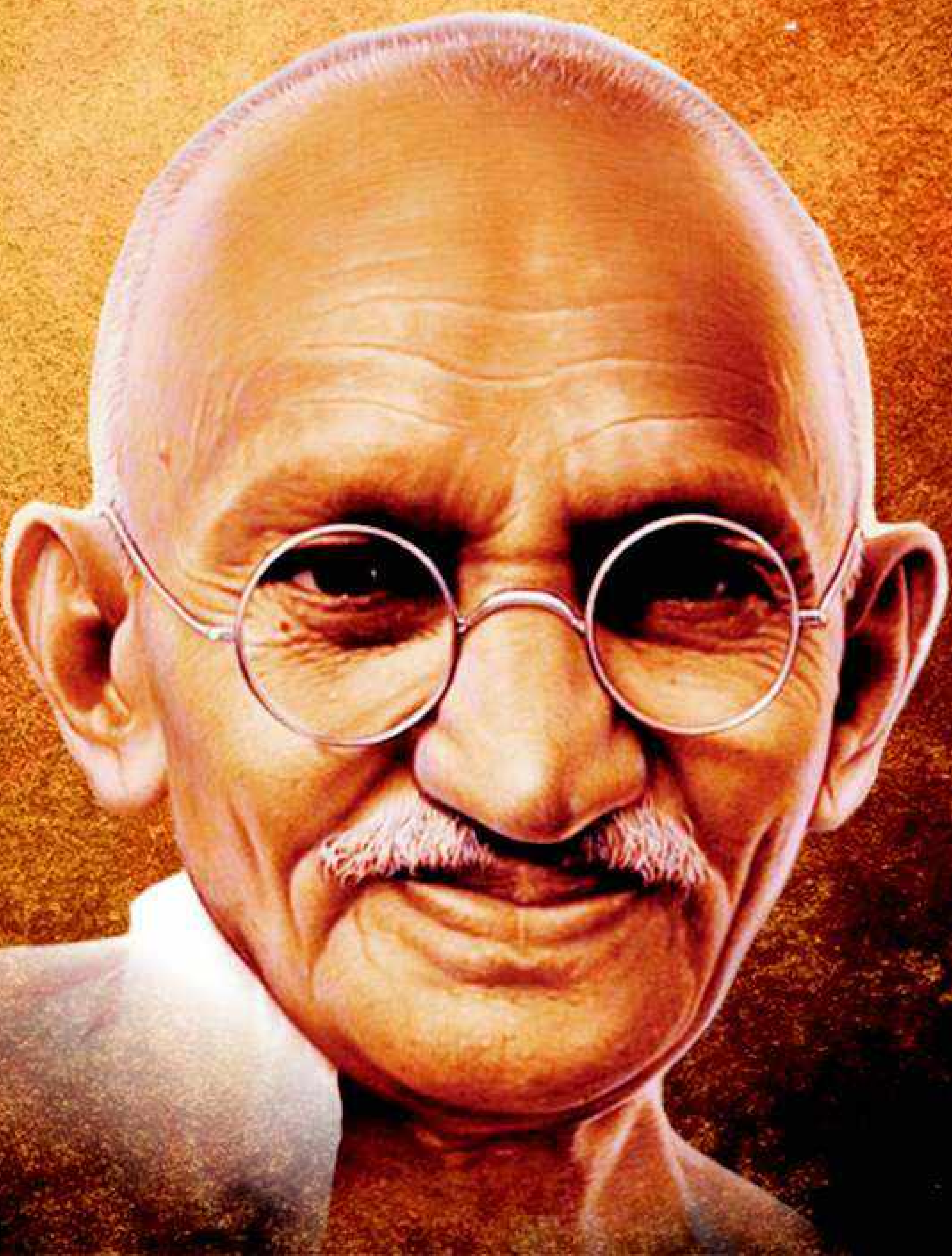

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159   E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

اُردو دُنیا

ماهنامه

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22، شمارہ:10، اکتوبر2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت-/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون:49539000 شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس:26108159

ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون:040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

رپورٹ

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے عہد میں اردو قلمکاروں کی ذمے داریاں نایاب حسن 7

زبان اور زمینی صورت حال

زبان قوموں کی ترقی کی ضامن ہے محمد اسد اللہ 11

نقد و نگاہ

غالب، ہاکنگ، خدا اور کائنات سلیم محی الدین 14

پروفیسر لطف الرحمٰن کا ادبی سرمایہ مشتاق احمد وانی 17

حقوق نسواں کی ایک بلند آواز پروفیسر شمیم نکہت پروین شجاعت 19

سفرنامے کی تاریخی اور سماجی اہمیت ارشد جمیل 22

اکتوبر کے آفتاب

مکتوباتِ سرسید سلطانہ واحدی 24

اختر انصاری کا افادی ادب عادل حیات 27

خواجہ غلام السیدین محمد احمد دانش رونوی 31

رباعیات اور کلیم عاجز یاسمین خاتون 33

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد سفیان احمد انصاری 35

انسان دوستی کا پیغامبر آنند نرائن ملا محمد افضل خان 37

چراغ دل

بدھ مت، اس کا صحیفہ دھمپد اور اردو ابوبکر عباد 40

روح کے کاغذ پر کبیر کا حرفِ محبت حقانی القاسمی 44

خراج عقیدت

ساحر لدھیانوی جی ایم پٹیل 47

باد نسیم

مولانا محمد علی جوہر، تعلیمی نقطہ نظر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ایم نسیم اعظمی 50

ڈاکٹر ایم نسیم بہ حیثیت محقق و تنقید نگار عتیق الرحمٰن 55

جنھیں ہم نے بھلا دیا

شاہ تراب علی قلندر کی اصلاحی شاعری جاوید احسن 57

کتاب دریچہ

جن کتابوں نے متاثر کیا محمد فاروق اعظم 59

طب

نظامیہ طبی کالج کا تعارف اور کتب خانہ جہانگیر احساس 61

نیا آسماں نئے ستارے

اردو تحقیق اور مولانا امتیاز علی عرشی نوشین حسن 63

اردو رسم الخط ریاض احمد 67

فلم

ڈراما 'انار کلی' اور فلم 'مغل اعظم' افسانہ حیات 70

کمپیوٹر

ورک شیٹ کو از سر نو ترتیب دینا 73

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ ادارہ 77

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 87

ہماری بات

ہندوستان کی کوکھ سے ہر عہد میں ایسی شخصیات جنم لیتی رہی ہیں جنھوں نے ملک کے مزاج کے مطابق امن وسلامتی، اخوت وبھائی چارگی اور سادگی وسچائی کی صدا بلند کی اور اپنی ہستی کو امن وامان کے فروغ کے لیے وقف کر دیا۔ ملک کی سچی خدمت کرنے والی ان عبقری شخصیات میں مہاتما گاندھی کا نام سرفہرست ہے۔ مہاتما گاندھی نے ہمیشہ دو چیزوں کو پیش نظر رکھا۔ ایک ملک اور دوسری انسانیت۔ ان کی پوری زندگی انھی دونوں محور کے گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ جب انھوں نے آنکھ کھولی تو دیکھا کہ ہندوستان انگریزوں کے آہنی شکنجہ میں کراہ رہا ہے اور باشندگان ہند غلامی کے احساس میں گھلتے جا رہے ہیں۔ گاندھی جی ملک اور ملک کے لوگوں سے بے انتہا محبت کرتے تھے، وہ ملک کو غلام اور ملک کے عوام کو اس قدر بے بس ولاچار نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے ملک کو آزاد کرانے کا عزم مصمم کیا اور وسائل وذرائع کی پرواہ کیے بغیر اپنی منزل کی جستجو میں نکل پڑے، پھر انھوں نے اس وقت تک مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا جب تک کہ ملک آزاد نہیں ہوگیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ آزادی کی طویل جدوجہد میں گاندھی جی نے کبھی ہتھیار نہیں اٹھائے۔ ان کا ہتھیار 'عدم تشدد' تھا جس کی دھار کو انگریز برداشت نہ کرسکے اور انھیں ہندوستان سے واپس جانا پڑا۔ آزاد ہندوستان کی تاریخ گاندھی جی اور ان کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی اور نہ ہی ان کے فلسفۂ عدم تشدد کو جس کے جلو میں بڑی بڑی کامیابیاں مضمر ہیں۔

گاندھی جی کی تعلیمات صرف ہندوستان یا ہندوستانیوں کے لیے نہیں تھیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے تھیں۔ انھوں نے پوری انسانیت کا گہرائی سے مطالعہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ وہ انسانی معاشرے میں پائی جانے والی خرابیوں سے بھی واقف تھے اور ان کو دور کرنے کے رازہائے سربستہ بھی جانتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بلاتفریق مذہب وملک انسان اور انسانی سماج کی اصلاح کے لیے نہایت موثر، مفید اور قیمتی باتیں بتائیں۔ اگر بنی نوع انساں ان پر عمل پیرا ہو تو دنیا سے بدامنی ختم ہو جائے گی اور ہر طرف امن وسلامتی کی ہوائیں چلنے لگیں گی۔ گاندھی جی اپنی وسیع تر تعلیمات کی وجہ سے پوری دنیا میں متعارف ہیں بلکہ عالمی سطح پر ان کی مقبولیت کا دائرہ بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ اب یہ بات بلا تردد کہی جاسکتی ہے کہ گاندھی جی کی تعلیمات آج ایک اہم فلسفہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہیں اور وہ عظیم رہبر کے ساتھ ایک رفارمر کے طور پر بھی دنیا بھر میں پہچانے جا رہے ہیں۔

گاندھی جی نے 'سچائی' پر بہت زیادہ زور دیا ہے اس لیے کہ سچائی خیر اور اچھائی کی بنیاد ہے۔ اگر سچائی کو لازم پکڑ لیا جائے تو نہ صرف انسان کی انفرادی زندگی پرامن ہو جائے گی بلکہ اس کی اجتماعی زندگی بھی بہت سی برائیوں سے پاک اور نیکی وکامیابی کا نمونہ بن جائے گی۔ جب کہ سچائی کا دامن چھوڑ دینے سے برائیوں کا ایک نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو افراد یا اقوام سچ بولنا چھوڑ دیتی ہیں وہ اندر سے کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور برائیوں کی دلدل میں دھنستی چلی جاتی ہیں۔

گاندھی جی کے نزدیک انسان بہت عظیم ہے۔ چاہے وہ کسی بھی مذہب کا ہو۔ اس لیے ان کے یہاں مذہب کی سطح پر کوئی اونچ نیچ نہیں پائی جاتی۔ انھوں نے ہمیشہ گنگا جمنی تہذیب سے محبت کی اور اسے قولاً وعملاً فروغ بھی دیا۔ انھوں نے مذہبی، تہذیبی، علاقائی اور لسانی تنازعات کو ختم کرنے کے لیے جو حل پیش کیا، اسے اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ ہر جگہ محبت ویگانگت اور انسانیت کی بالادستی قائم ہو۔ 2/ اکتوبر گاندھی جی کا یوم ولادت ہے۔ آئیے اس موقع پر گاندھی جی کی حیات وخدمات کو یاد کریں اور ان کے چھوڑے ہوئے نقوش پر چلنے کا عہد کریں۔

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

آپ کی بات

'ماہنامہ اُردو دنیا دہلی' مئی 2020 کے شمارے میں ایک مضمون بعنوان 'دور بھ میں معاصر اُردو تحقیق و تنقید' مصنف خان حسنین عاقب پر نظر پڑی...... چونکہ میرا تعلق بھی علاقۂ دور بھ سے ہے۔ گوکہ بحیثیت محقق نہیں...... مگر ایک عام قاری کی طرح تو ہے۔ اس لیے سب سے پہلے وہی مضمون پڑھا۔ مضمون پڑھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ اس قدر مقتدر عنوان کے تحت دی گئی تفصیل کو چوں چوں کا مربہ بنا کر ایک موقر جریدہ کے معتبر بیش قیمت صفحات ضائع کر دیے گئے ہیں۔

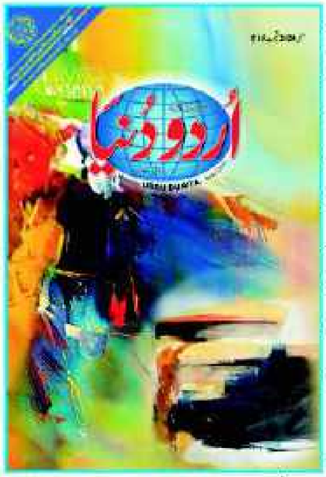

تحقیقی مضامین لکھنا انتہائی ذمہ داری، دیانتداری، وسیع مطالعہ، جہد مسلسل، حقائق کی تلاش سے اصل بنیاد تک رسائی کا متقاضی ہوتا ہے۔ یوں تو کسی بھی موضوع پر قلم اٹھانے سے قبل مفکرین فن کی ان آرا کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ!

''اتنا پڑھو کہ آپ کو اپنا ذہن ودماغ اپنی جگہ چلتا ہوا محسوس ہو۔''

''ہزاروں صفحات کا مطالعہ کرو۔ تب چند صفحات لکھ سکو گے۔'' وغیرہ

یہاں ایک نقطہ اور ابھرتا ہے کہ یہ ہزاروں صفحات الم غلم نہ ہوں۔ بلکہ تحریری مضمون سے مربوط، منسلک ہوں اور تحقیقی کام کے لیے تو موضوع کی موزونیت، مناسبت، نفس مضمون کی روح سے ہم آہنگ ہوں۔

مصنف نے مضمون میں کئی بار اپنی کوتاہ بینی، رسائی کی مجبوری، تحقیقی کاوشات کی اطلاع نہ پہنچنا، حافظہ کی کمزوری، وسائل کا فقدان، بشری حافظے کی فروگذاشت جیسے عذر لنگ کا سہارا لیا ہے۔ دراصل یہ عذر لنگ عذر گناہ..... بدتر از گناہ کے مصداق مصنف کی کاوش پر ہی سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔ تحقیقی کام حافظ کی مدد سے نہیں بلکہ حقائق کی مدلل تلاش اور مطالعے سے کیا جانا چاہیے۔

دور بھ میں ایسے کئی محققین ہیں جن کو اس مضمون میں شمولیت سے دانستہ یا نادانستہ نظر انداز کیا گیا ہے اور اس کی وجہ مصنف نے حافظ (مطالعہ نہیں) کی کمزوری، وسائل کی عدم فراہمی اور اطلاع یا معلومات از خود پہنچنا پر محمول کیا ہے۔ یہ تینوں دلائل پھسپھسے، بودے اور مصنف کی تن آسانی، جلد بازی، عجلت پسندی ظاہر کرتے ہیں۔

تحقیق حافظ سے نہیں مطالعہ کی وسعت سے، وسائل کی عدم فراہمی پر نہیں جہد مسلسل پر مبنی ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کی دی جانے والی مستند اور غیر مستند معلومات پر نہیں، بذات خود تمام حقائق کو جاننے کی سعی مسلسل پر ہوتی ہے۔

❖ **ایڈوکیٹ حبیب رتھ پوری**: ترتھپور، ضلع امراوتی (مہاراشٹر)

اپریل ماہ کا شمارہ تاخیر سے دستیاب ہونے کے باوصف اس میں تمام مشمولات کے علمی پایہ ہونے نے گویا ساری کسر پوری کر دی ہے۔ چونکہ یہ خاکسار لسانیات کی تحقیق وتنقید میں رومانی صاحب کی ہی مانند خاص رغبت رکھتا رہا ہے، لہٰذا جناب تنویر اختر رومانی کا از حد محنت ومشقت طلب مضمون زیر عنوان 'اردو پر دوسری زبانوں کے اثرات' سب سے پہلے پڑھا اور پسند کیا ہے۔

اسی شمارے کے تحت جناب رؤف خیر کا مضمون زیر عنوان 'اقبال اور غالب' از حد تقابلی اور تنقیدی بلندیوں کو چھونے والی ایک معیاری تحریر ہے۔

اس جریدے کی ایک خاصیت اس میں قدرے کم مقبول ادبا کی ادبی خدمات کی بھی وقتاً فوقتاً خط کشی کرنے والے مضامین کی اشاعت کرتے رہنا بھی گردانی جائے گی۔ اسی ضمن میں جناب شوق نیموی کی غزل گوئی پر مبنی نسیم احمد نسیم صاحب کے مقالے کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنے طنز وتشنیع کے ترش تیروں کو چلانے کے علاوہ اپنے ہمعصر معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے اپنے بلند پرواز تخیل کی جو متعدد مثالیں پیش کی ہیں، وہ بھی بے مثال ہی مانی جائیں گی۔ مثلاً 'ہوا جب جل کے سرمہ.....' اور 'پریشان اپنے حال میں ہے، دیکھیے جس کو.....' وغیرہ۔

مئی ماہ کے شمارے میں اگرچہ کثیر اللسان ادیب، معلم، خطیب ومدیر جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی پر مبنی دیگر تین مضامین بھی معیاری ہیں، تاہم جناب حقانی القاسمی کا مقالہ گویا کوزے میں سمندر مقید کرنے کے ضرب المثل کو ہی کاملاً صادق کرنے والا ہے۔ اس میں شبلی نعمانی وشاعر مرزا داغ کے اسلوب نگارش کا تقابل معرکہ آرا ہونے کے موجب از حد قابل ستائش ہے۔ اس میں مولانا صاحب کے تعلیمی، ادبی، دینی، تخلیقی، جمالیاتی وتنقیدی خصوصیات کی بلندی ہے اور حقانی القاسمی کا محاکمہ اور بالخصوص 'مغربی' ایک لفظ یا صفت کے نظریے کو سراسر غائرانہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ بیشتر اساتذہ، طلبا ومحققین کے لیے قابل تقلید ثابت ہو سکتا ہے۔

عبدالاحد ساز صاحب کی وفات اسی سال 22 مارچ کو ہوئی تھی اور اسی شمارے میں جناب صدر عالم گوہر نے ساز صاحب اور ندا فاضلی دونوں کے دولت خانوں پر

ہمیشہ (ادبی و فلمی شخصیات سے مل کر ان کے مصاحبے یا مشافہے حاصل کرنے کی طرح ہی) اپنے خرچ پر جا جا کر قارئین کے استفادے کے مقصد سے جو بے بہا معلومات کا ذخیرہ اپنے مقالے میں پیش کیا ہے، وہ فقط انھیں کا حصہ ممکن ہوسکتا تھا۔ اس ایک مضمون سے ہمیں ندا فاضلی کے علاوہ ان کی نیک سیرت اہلیہ مالتی جوشی جی کی بابت بھی متعدد باتیں پتا چلتی ہیں۔ دراصل میں آج سے چند سال پہلے اسی نام کی ہندی زبان کی ایک کہانی کار مالتی جوشی سمجھنے کا مغالطہ اپنے دماغ میں پالے ہوئے تھا، جبکہ اور زیادہ تحقیق کرنے اور اب گوہر کے مضمون سے میرے خیال کی تصحیح ہوگئی ہے کہ وہ تو گجراتی زبان کی ایک مقبول و معروف ایکٹریس رہی ہیں۔

موصوف نے اپنے مقالے کے تحت شہرۂ آفاق شاعر و ادیب کا ایک غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کیا ہے اور اس پر مستزاد یہ بطور تحسین و عقیدت ان کا ایک تعزیتی مقالہ بھی بن پڑا ہے۔ مقالے کے آخر میں محولہ شعر کے شاعر کا نام مفقود ہے۔ اس ناچیز کی دانست میں ایسے محولہ اشعار کے خالقوں کے نام ان کے تئیں عزت بخشنے کے نظریے سے دینا لازمی ہونا چاہیے۔ شاعر کا نام ہے نواب مرزا شوق لکھنوی۔

جون ماہ کے شمارے میں اگرچہ تمام مضامین کا انتخاب مدیر اور مشیر صاحبان کے ذوقِ سلیم کا ہی واضح شاہد ہے، تاہم میں لسانیات میں بالخصوص ذاتی رغبت کے باعث فقط ادیب جناب ابوبکر عباد کے از حد معلوماتی و طلبہ و اساتذہ کے تئیں زیرِ عنوان 'اردو زبان و تلفظ کا مسئلہ اور نئی نسل' کارآمد مقالے کی بابت اظہارِ خیال کر رہا ہوں۔ ان کے ذاتی تعلیمی و تدریسی تجربات کی بنا پر یہ مقالہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ٹی۔وی پر مختلف چینلوں وغیرہ پر بسا اوقات غلط املے و تلفظ سن کر ہمارے تو کان ہی پک چکے ہیں، مثلاً حالاتوں، جذباتوں اور اسی شمارے میں ص 59 پر ایک مقالے کی سُرخی میں 'حب الوطنی' (جبکہ صحیح لفظ ہے 'حب الوطن') لفظ بھی غور طلب ہے۔ آخری صفحے 98 پر مستعمل لفظ 'رسومات' بھی یکسر غلط ہے، کیونکہ 'رسم' عربی زبان کے مؤنث لفظ کی جمع کا لفظ 'رسوم' ہے، اس کا اعادہ کر کے دوبارہ جمع بنا کر 'رسومات' درج کرنا بھی غلط ہے۔

ادبی و فلمی شاعر جناب 'اختر الایمان' کے نام کی ساخت تک غلط ہے، کیونکہ اس میں 'ال' لفظ کو بموجب اردو قواعد جوڑا ہی نہیں جا سکتا ہے۔ اسی شمارے کے اسی مقالے میں اول تا آخر 'طلبہ' املا درج کیا گیا ہے، وہاں ص 13 پر 'طلبا' املا ہمارا دھیان کھینچتا ہے۔ اسی طرح کا ایک دیگر لفظ ہے 'پتہ'۔ آپ ہی کے ادارے سے شائع ایک موقر کتاب 'صحتِ الفاظ' میں 'پتا' املا کو صحیح ٹھہرایا گیا ہے۔ ایک ہی معنی میں ہمیشہ دو مختلف املوں کا تصرف کب تک اردو زبان و ادب میں چلتا رہے گا؟ ٹی وی چینلوں کے مالک اپنے پروگراموں پر ویسے تو کروڑوں روپے صرف کر دیا کرتے ہیں۔ کیا وہ اپنے سیریلوں یا ڈراموں کے اداکاروں کی زبان میں مستعمل اردو الفاظ کی تصحیح کی خاطر ایک معیاری مدرس متعین (تعینات' لفظ بھی غلطی سے رائج ہو چکا ہے) نہیں کر سکتے ہیں؟

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر 18-K، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

■

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے لیے موصول ہونے والے مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر مضمون کی اشاعت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ہر مضمون نگار سے رابطہ آسان ہے۔ اسی لیے دسمبر 2018 تک موصول ہونے والے مضامین کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اب مضامین کی اشاعت یا عدم اشاعت کی اطلاع مضمون موصول ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی دے دی جائے گی۔ اگر اطلاع نہ ملے تو آپ مندرجہ ذیل نمبر 011-49539009 پر اپنے مضمون کے بارے میں استفسار کر سکتے ہیں۔

ایک اور گذارش یہ ہے کہ میر، غالب، اقبال یا ان ادبا پر جن کے حوالے سے کافی کتابیں اور مقالے لکھے جا چکے ہیں، مضامین بھیجنے سے اولاً تو گریز کریں اور اگر ان شخصیات پر مضامین بھیجیں بھی تو مضمون میں نئے زاویے یا نئی جہت کی نشان دہی ضرور فرمائیں، اس کے بغیر اس نوع کے مضامین شائع نہیں کیے جائیں گے۔ اردو زبان کی زمینی صورتِ حال، تاریخ، آثارِ قدیمہ، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، علاقائی ادبی صورتِ حال، ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا ادب، عالمی ادبیات، تکنیکی اور سائنسی ترقیات اور گمنام، فراموش کردہ قلم کاروں، رسائل کے خصوصی شماروں اور نئے موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے۔

نایاب حسن

الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے عہد میں اردو قلمکاروں کی ذمے داریاں

قومی اردو کونسل کا عالمی ویبنار 2020

اکیسویں صدی اطلاعاتی انقلاب اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی بے پناہ ترقیات کی صدی ہے۔ علم اور معلومات کے ذرائع روز بروز بڑھتے جارہے ہیں اور انسان اپنے ذہن وفکر کی بلندی و گہرائی کی نت نئی منزلیں سر کررہا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی نے سیکھنے کے عمل کو آسان کردیا ہے اور ابلاغ وترسیل کے عمل کو برق رفتاری عطا کردی ہے۔ ایسے میں دنیا کی بہت سی زبانوں کو یہ اہم مسئلہ درپیش ہے کہ وہ روز بروز سامنے آنے والی ٹیکنکل ترقیات وتغیرات کا ساتھ کیسے دے سکتی ہیں اور انھیں ان زبانوں کی ترویج واشاعت کے لیے کس کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟ انٹرنیٹ، گوگل، سوشل میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا پر عموماً انگریزی زبان کا بول بالا ہے، مگر جیسے جیسے لوگ ٹکنالوجی سے مانوس ہورہے ہیں، دوسری زبانیں بھی ان مقامات پر اپنی موجودگی درج کرارہی ہیں، جن میں سے ایک اردو زبان بھی ہے۔ شروعاتی دور میں گوگل اور دیگر سوشل سائٹس پر اردو رسم الخط اور اردو زبان کا استعمال قدرے مشکل تھا، مگر پھر ماہرین نے اس مشکل پر قابو پالیا اور آج نہ صرف یہ کہ اردو زبان میں گوگل سرچ کی سہولت موجود ہے بلکہ فیس بک، واٹس ایپ، ٹوئٹر اور دیگر مشہور سوشل سائٹس کو مکمل اردو میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ پر ادبی ولسانی سرگرمیوں کی انجام دہی کے لیے بے شمار فورمز، گروپس اور ویب سائٹس موجود ہیں، جہاں اردو کے ادبا و قلمکار اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کررہے ہیں اور اردو کے شائقین اس زبان کی لطافت وشیرینی سے محظوظ ومستفید ہورہے ہیں۔ مگر پھر بھی الیکٹرانک وسوشل میڈیا کی ترقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ مستقل اس کے کندھے سے کندھا ملاکر چلنے کے لیے نظر کی تیزی، ذہن کی بصیرت، مشاہدہ کی غیر معمولی قوت اور دل ودماغ کی زرخیزی کی ضرورت ہے اور یہ خوبیاں ہمارے ادیبوں، تخلیق کاروں، معاشرے کے فنکاروں میں ہی پائی جاتی ہیں، سوانھیں ہر وقت بیدار وہوشیار رہنا ہوگا اور الیکٹرانک وسوشل میڈیا میں اردو کے استعمال یا وہاں شائع ہونے والی تخلیقات کی صحت واستناد کی تحقیق و تفتیش ہمارے ادیبوں کی ذمے داری ہے۔ اسی ذمے داری اور ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس سال کورونا وائرس جیسی عالمی وبا اور عالمگیر لاک ڈاؤن کے پیش نظر دوروزہ ورچوئل کانفرنس (ویبنار) کے انعقاد کا فیصلہ کیا اور اس ویبنار کا موضوع 'الیکٹرانک وسوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمے داریاں' رکھا گیا۔ یہ ویبنار عصری ٹکنالوجی کے کارگر استعمال کا بہترین نمونہ تھا کہ اس میں انٹرنیٹ کے ذریعے ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے علاوہ جرمنی، کناڈا، بنگلہ دیش، آذربائیجان اور مصر وغیرہ سے بھی شائقین اردو، ادبا و قلمکار شامل رہے، آن لائن مقالات پڑھے گئے اور سامعین نے بخوبی استفادہ کیا۔

اس عالمی ویبنار کے افتتاحی اجلاس کا انعقاد وزارت تعلیم کے کانفرنس ہال میں ہوا، جس کی صدارت وزیر تعلیم ڈاکٹر رمیش پوکھریال نشنک نے کی۔ اپنے پر مغز خصوصی خطاب میں انھوں نے کہا کہ اردو دنیا کی ساتویں سب سے بڑی زبان ہے اور اس کی خوشبو ہندوستان کی جڑوں میں پیوست ہے۔ اس زبان میں انسانیت نوازی، یکجہتی، اتحاد کی دعوت اور انسانی فلاح و بہبود کا پیغام پایا جاتا ہے۔ ان خیالات کا اظہار وزیر تعلیم عالی جناب رمیش پوکھریال نشنک نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام 'الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں اردو مصنفین کی ذمے داریاں' کے موضوع پر منعقدہ دوروزہ عالمی اردو ویبنار کے افتتاحی سیشن میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان میں غیر معمولی خوب صورتی اور دلوں تک پہنچنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اس زبان کی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے کم لفظوں میں وسیع مضامین کو بیان کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے

میں انھوں نے زندگی کے حقائق پر مشتمل مرزا غالب کی شاعری کا خصوصی حوالہ دیا اور اقبال کے ترانۂ ہندی کے مشہور شعر 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا' کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس شعر کو سن کر ہمارے دل میں ایک خوشگوار احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے وطن سے محبت و وابستگی کا جذبہ قوی ہوجاتا ہے۔انھوں نے ہندوستان کی تمام زبانوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ ساری زبانیں ہمارا مشترکہ ورثہ ہیں جن سے ہمارے وطن کی رنگارنگی و خوب صورتی قائم ہے۔ان زبانوں کی صوتیات میں بے پناہ حسن ہے اور ان کے اندر معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ، ان کے لفظوں میں تاثیر اور دل و دماغ میں سماجانے کی قوت پائی جاتی ہے۔ویبینار کے موضوع کو اہم قرار دیتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا آج کے دور کی ایک بڑی طاقت ہے جس کا استعمال کر کے آپ اپنے خیالات وافکار کو منٹوں سیکنڈوں میں پوری دنیا تک پہنچا سکتے ہیں۔ پرانے زمانے میں لوگوں کو یہ عذر ہوتا تھا کہ وہ لکھتے تو ہیں لیکن انھیں پبلشر نہیں ملتے، بہت سے لوگوں کو اپنی کتابیں شائع کروانے کی استطاعت نہیں ہوتی تھی اور رسائل و مجلات میں بھی ان کی تحریریں نہیں شائع کی جاتی تھیں، مگر اب آپ کا یہ عذر کارگر نہیں ہوسکتا ہے،اب اگر آپ کے اندر تخلیقی صلاحیت ہے تو سوشل میڈیا اور دوسرے نئے ذرائع ابلاغ کی شکل میں آپ کے پاس ایک اہم پلیٹ فارم ہے، اسے اپنی صلاحیت کے اظہار کا بہترین وسیلہ بنا سکتے ہیں اور اپنی بات اور تخلیقات پوری دنیا تک پہنچا سکتے ہیں۔انھوں نے مزید کہا کہ سوشل میڈیا ایک ایسا پلیٹ فارم ہے جو دنیا کے ہر شخص اور طبقے کو دستیاب ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس پلیٹ فارم کا استعمال تعمیری افکار کے اظہار، حب الوطنی، قومی ہم آہنگی، بھائی چارے اور سماج میں امن وامان کے قیام کے لیے کریں،اگر ہم اس فریضے کی ادائیگی میں ناکام رہتے ہیں تو بہت سی ایسی طاقتیں ہیں جو اس پلیٹ فارم کا استعمال غلط اور سماج میں انتشار پھیلانے والے افکار کی اشاعت کے لیے کرسکتی ہیں، لہٰذا ہمیں اس سلسلے میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہوئے اس کا صحیح اور مفید استعمال کرنا چاہیے اور دورِ حاضر کی تیز رفتار ترقیات کے ساتھ چل کر سماج کے تئیں اپنی ذمے داری نبھانی چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ ہمارے قلم کاروں کی ذمے داری ہے کہ دورِ حاضر کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتے ہوئے الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے ذریعے ہندوستان کے انسانیت نواز اور عالمی اخوت پر مبنی افکار و خیالات کی اشاعت کریں۔

انھوں نے اس ویبینار کے انعقاد لیے کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر و ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد کو نیک خواہشات پیش کرتے ہوئے اردو زبان میں دنیا کی دوسری زبانوں کی اعلی تخلیقات کے اردو تراجم کی اشاعت پر بھی زور دیا تا کہ اردو کی خوشبو دور تک پہنچ سکے اور اردو والے معاصر عالمی ادبیات سے بھی استفادہ کرسکیں۔اس موقعے پر انھوں نے قومی کونسل کی حصولیابیوں پر قلبی اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کونسل کے وائس چیئرمین اور ڈائرکٹر کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ نریندر مودی جی کے دور حکومت میں جہاں کونسل کا بجٹ پہلے کے مقابلے میں دوگنا سے بھی زیادہ ہوگیا ہے وہیں کونسل کی اسکیموں کا دائرہ بھی وسیع ہوا ہے اور ان سے فائدہ اٹھانے والے طلبہ و طالبات کی تعداد سولہ لاکھ سے بھی متجاوز ہوچکی ہے۔انھوں نے ایک اہم اعلان کرتے ہوئے کہا کہ آئندہ سال سے اردو کونسل کی جانب سے ادبی وتخلیقی خدمات انجام دینے والے اردو قلمکاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں امیر خسرو، مرزا غالب، آغا حشر، رام بابو سکسینہ اور دیا شنکر نسیم جیسی اردو کی اہم شخصیات کے نام پر انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔انھوں نے کہا کہ اس ویبینار میں پڑھے جانے والے مقالات کو بھی کتابی شکل میں شائع کیا جائے اور اسے پوری دنیا میں پہنچایا جائے، دنیا بھر کے لوگوں کو دعوت دی جائے کہ اگر وہ اردو زبان پڑھنا اور سیکھنا چاہتے ہیں تو حکومتِ ہند کی 'اسٹڈی ان انڈیا' مہم کے تحت ہندوستان آسکتے ہیں اور ان کے لیے اردو زبان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔

اس سے قبل وزیر موصوف نے ڈیجیٹل طریقے سے اجلاس کی شروعات کی اور کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر اور ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے گلدستہ پیش کرکے ان کا خیر مقدم کیا۔پروفیسر شاہد اختر نے اپنے خیر مقدمی کلمات میں وزیر تعلیم اور ہندوستان سمیت دیگر ممالک کے شرکا و سامعین کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ وہی قومیں ترقی کرتی ہیں جو اپنے آپ کو وقت کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہوتی ہیں۔آج جب کہ سوشل میڈیا ہماری زندگی کا لازمی حصہ بن گیا ہے ایسے میں ہمارے تخلیق کاروں کی ذمے داری ہے کہ وہ اس کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے سماج کی درست رہنمائی کریں۔

انھوں نے کہا کہ اردو کے ادیب اور تخلیق کار اپنی ذمے داری سمجھ بھی رہے ہیں اور سوشل میڈیا پر کئی ادبی فورمز قائم ہوچکے ہیں جو اردو زبان وادب کو فروغ دے رہے ہیں، ان کے ذریعے نئی نسل اردو سیکھ رہی ہے،مگر اس سلسلے کو مزید مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔انھوں نے زور دیا کہ اردو کے قلمکاروں اور تخلیق کاروں کو چاہیے کہ وہ سوشل اور الیکٹرانک میڈیا پر اردو رسم الخط اور اردو زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کریں تا کہ حقیقی معنوں میں اردو کی ترویج واشاعت ہوسکے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تعارفی کلمات میں ویبینار کے موضوع اور اس کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج ہم کورونا جیسی وبا کی وجہ سے ایک محتاط فاصلہ رکھنے کے لیے مجبور ہیں، مگر ٹیکنالوجی کا کرشمہ دیکھیے کہ اس نے ہمارے فاصلوں کو بھی ایسی قربتوں میں بدل دیا ہے جس کا ہم پہلے تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔ہم الگ الگ ملکوں اور علاقوں میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کے خیالات سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ایک دوسرے کو دیکھ اور سن بھی رہے ہیں۔یہ ٹیکنالوجی نہ ہوتی تو شاید ویبینار کا تصور بھی وجود میں نہیں آتا آج ہمارے عالمی ویبینار کا موضوع بھی ٹیکنالوجی سے ہی جڑا ہوا ہے، ہمارے تمام شرکا الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے عہد میں اہلِ قلم کی ذمے داریوں کے

حوالے سے نئے مباحث اور مسائل پر گفتگو کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ یہ موضوع بہت اہم ہے کیونکہ آج معاشرہ جس زوال و انحطاط کا شکار ہے اور پوری دنیا میں جس طرح کے مسائل ہیں، ایسے میں حساس اور باشعور افراد کی ذمے داریاں بہت بڑھ جاتی ہیں، ادیب یا قلمکار معاشرے کا ایک افادی کردار رہوتا ہے جو معاشرے کے لیے ایک معلم اور استاد کی طرح ہوتا ہے۔ وہی سماج کو ایک نئی منزل دکھاتا ہے، معاشرے کی صحیح سمتوں کا تعین کرتا ہے اور اسے تہذیبی قدروں سے بھی روشناس کراتا ہے۔ قلم کاروں کی یہ ذمے داریاں ماضی میں بھی تھیں اور آج بھی ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارے صاحبانِ علم و دانش اور اربابِ قلم نے اپنی معاشرتی ذمے داریوں کو ہر دور میں بہ خوبی نبھایا بھی ہے۔ انھوں نے ادیبوں کی سماجی ذمے داریوں کے حوالے سے اردو کے معروف فکشن نگار پریم چند کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے ایک بار اشارہ کیا تھا کہ ''ادیب کا مقصد حیات کے مسائل پر غور کرنا محاکمہ کرنا اور انھیں حل کرنا ہے، محض عشق و عاشقی کا راگ الاپنا ادب نہیں ہے۔'' اس سلسلے میں انھوں نے علامہ اقبال کی مشہور نظم 'بچوں کی دعا' کا بھی خصوصی ذکر کیا جس میں شاعر نے بچے کی زبانی علم و حکمت، خیر و فلاح اور سماج کے لیے مفید و کارگر ثابت ہونے کی دعا مانگی ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ بچوں کی یہی دعا ادب کا مدعا اور منشا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ ماضی میں بھی ادیبوں نے اسی منشور کے مطابق ادب تخلیق کیا اور اپنے قلم کی روشنی و روشنائی سے سماج کے اندھیروں کو دور کیا، صحت مند معاشرے کی تشکیل کی، مثبت اخلاق و اقدار کا تحفظ کیا، ظلم و جبر، استیصال و استحصال کے خلاف آواز اٹھائی اور معاشرے میں امن و محبت کا پیغام دیا۔ تاریخ کے صفحات گواہ ہیں کہ بہت سے ملکوں کے انقلابات، سماجی، سیاسی اور ثقافتی تغیرات انھی اربابِ قلم کے رہینِ منت ہیں۔ دورِ حاضر کی ٹیکنکل ترقیات و انقلابات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ آج جدید ترین تکنیکی ذرائع نے ہمیں اتنے متبادل عطا کر دیے ہیں کہ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے، جدید تکنیک نے امکانات کی ایک وسیع تر دنیا تخلیق کی ہے، آج ہمارے پاس وسائل کی فراوانی ہے، مواد کی کثرت ہے، معلومات کی افراط ہے۔ ایک Click میں پوری دنیا کی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔ سوشل میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا نے ہمارے لیے پوری کائنات کو مٹھی میں بند کر دیا ہے۔ اب معلومات، اطلاعات یا خبروں کی رسائی میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں ہوتی۔ ہر طرح کی اطلاعات ہمارے پاس چند ساعتوں میں پہنچ جاتی ہیں۔ اسی لیے پہلے کی طرح عدمِ رسائی یا وسائل کی کمی کا مسئلہ ہمارے ساتھ نہیں رہ گیا ہے۔ بلکہ اب ہم انحصار سے اختیار کی طرف بڑھ رہے ہیں اور خود انحصاری و خودمختاری کی منزل میں ہیں۔ اب ہمارے سامنے کوئی ایسا عذر نہیں رہ گیا ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی معاشرتی ذمے داریوں کی ادائیگی میں کوتاہی برتیں، اس لیے اب ہمیں پہلے سے زیادہ متحرک ہو کر کائناتی مسائل پر غور کرنا ہوگا اور نئے عہد میں مثبت تبدیلیوں سے ہم آہنگ ہو کر عصری مطالبات کے پیشِ نظر اپنی ترجیحات کا تعین بھی کرنا ہوگا۔ نئے افکار و رجحانات سے ادبی معاشرے کا رشتہ جوڑ کر ان مسائل اور موضوعات پر گفتگو کو مرکوز کرنا ہوگا جو معاشرے کی ضرورت ہیں اور معاشرے کے لیے مفید بھی۔ آج ہمارے سامنے بہت سارے ماحولیاتی، سماجی، ثقافتی نوعیت کے مسائل ہیں اور خاص طور پر وہ مسائل بھی ہیں جن سے ہماری تہذیب، زبان اور وجود کو خطرات لاحق ہیں، ان پر بھی ہمیں بات کرنی ہوگی اور بات کے دائرے کو وسیع سے وسیع تر بھی

کرنا ہوگا کیونکہ نئی ٹیکنالوجی نے ہمارے ذہن کے آفاق کو وسعت بخشی ہے، ہمارا مطالعاتی دائرہ وسیع ہوا ہے، علمی ذرائع تک رسائی آسان ہوئی ہے، اب ڈسکورس کی راہ میں رکاوٹیں نہیں ہیں۔ ہمیں نئی ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھا کر تمام عالمی مسائل پر سنجیدگی سے گفتگو کرنی ہوگی۔ اب ہمیں مقامیت میں محصور رہنے کے بجائے آفاقیت کے ساتھ سوچنا ہوگا اور کرۂ ارض کے ایک شہری کی حیثیت سے دنیا کے تمام مسائل پر بات کرنی ہوگی۔ سماج کو بے چہرگی سے بچانا اور انتشار کے عہد میں اتحاد و یگانگت کے جذبے کو فروغ دینا، جمہوری اقدار کا تحفظ اور غلط سماجی رجحانات کا خاتمہ کرنا یہ سب ہمارے منصب میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر عقیل نے اس بات پر زور دیا کہ قلمکاروں کا کام صرف اپنے جذبات و احساسات کی خوبصورت عکاسی نہیں ہے بلکہ ان کا فرض ہے کہ آج کے افراد کو بازاری معیشت اور صارفیت کے شکنجے سے نکال کر انھیں روحانیت سے روشناس کرائیں۔ افسردگی، اضمحلال، شکست خوردگی اور انتشار سے آزاد کرا کر انسانیت کو نئے خواب دینا، شبِ تاریک کو سحر میں تبدیل کرنا اور انسانوں کے اجتماعی مستقبل کا لائحۂ عمل تیار کرنا بھی اربابِ قلم کا فریضہ ہے۔ منفی ذہنیت کی بیخ کنی، نظریاتی آویزش اور تہذیبی ٹکراؤ کو بڑھانے والی ذہنیت کی مزاحمت، اتحاد، اخوت، بھائی چارے، ہم آہنگی کو مضبوط کرنا اور معاشرے کو صحت مند قدروں سے روشناس کرانا ادیبوں کے مقاصد ہیں۔ آج الیکٹرانک اور سوشل میڈیا کے دور میں ضرورت ہے کہ اربابِ قلم اپنی ان ذمے داریوں کو محسوس کریں اور اس میڈیا کے ذریعے اپنے مثبت افکار و پیغام دنیا کے ہر فرد تک پہنچائیں۔ انھوں نے خصوصاً اردو کے ادیبوں اور قلمکاروں کے حوالے سے کہا کہ اردو کے اربابِ قلم ہمیشہ محبت والفت، امن و یکجہتی اور یگانگت کی تبلیغ کرتے رہے ہیں، انھوں نے ملک کی تعمیر و تشکیل میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے، آج بھی سوشل میڈیا کے عہد میں وہ اپنے فرائضِ منصبی کو بہ خوبی ادا کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اسی طرح اپنی سماجی و ادبی ذمے داریوں کی تکمیل کرتے رہیں گے۔

پروفیسر زماں آزردہ نے اپنے کلیدی خطبے میں سماج کے تئیں ادیبوں اور تخلیق کاروں کی ذمے داریوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ شاعر و ادیب سماج کی آنکھ ہی نہیں، بلکہ اس کے دل کی دھڑکن ہوتے ہیں، وہ قوموں کی رہنمائی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، ان کی تعداد گرچہ ہر زمانے میں بہت محدود و مختصر رہی ہے مگر سماج پر ان کے غیر معمولی اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ بقائے انسانی، فکری صحتمندی اور تعمیرِ قوم و ملک کے لیے یہی

تھوڑے لوگ کام کرتے ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کا زمانے کی تمام تر تبدیلیوں سے آگاہ رہنا ضروری ہے تاکہ وہ کما حقہ ان کے تقاضوں کی تکمیل کر سکیں۔ انھوں نے کہا کہ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا بھی دورِ حاضر کی ایک بڑی تبدیلی، بلکہ قدرت کی طرف سے عطا کردہ نعمت ہے، آج کے ادیب کی ذمے داری ہے کہ وہ خود کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرے اور الیکٹرانک و سوشل میڈیا کا استعمال کرتے ہوئے نئی نسل کو گمراہی سے بچانے کے لیے درست اور مستند تخلیقات پیش کرے۔ انھوں نے سوشل میڈیا میں قابلِ اعتماد اور مستند مواد کی اشاعت اور وہاں نشر کی جانے والی چیزوں کی چھان پھٹک پر زور دیتے ہوئے اس سلسلے میں اردو قلم کاروں کو اپنی ذمے داریاں نبھانے کی خاص تاکید کی۔

افتتاحی سیشن کے اختتام پر کونسل کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی نے شکریے کی رسم ادا کی اور نظامت کے فرائض معروف صحافی تحسین منور نے بحسن و خوبی انجام دیے۔

عالمی ویبینار کے افتتاحی سیشن کے اختتام اور وقفے کے بعد تین بجے سے پانچ بجے شام تک پہلا تکنیکی سیشن منعقد ہوا، جس کی صدارت پروفیسر نصیر احمد خاں نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر عبدالحی (سی ایم کالج، دربھنگہ) نے انجام دیے۔ اس سیشن میں ملک و بیرونِ ملک سے نو مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ جن میں پروفیسر این کے درانی، ڈاکٹر سید تقی حسن عابدی (کناڈا)، پروفیسر شہزاد انجم (دہلی)، جناب عارف نقوی (جرمنی)، پروفیسر شاہد رسول (کشمیر)، جناب نصر ملک (ڈنمارک)، جناب سید اقبال حیدر (جرمنی)، پروفیسر مرنال چٹرجی (اوڈیشہ) اور پروفیسر ناصر مرزا (کشمیر) کے نام شامل ہیں۔ صدرِ جلسہ نے سیشن کے آخر میں اپنی صدارتی تقریر کے دوران پیش کردہ مقالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ انٹرنیٹ اور دیگر وسائل کی وجہ سے اردو زبان کی مقبولیت کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے اور اس زبان کے وجود کو کسی قسم کا خطرہ درپیش نہیں ہے، البتہ اردو تلفظ اور رسم الخط کو چیلنجز درپیش ہیں، جنھیں ہم ٹکنالوجی کا بامقصد استعمال کرکے دور کر سکتے ہیں۔

ویبینار کے دوسرے دن، دوسرے تکنیکی سیشن میں افتتاحی خطاب کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ سوشل اور الیکٹرانک میڈیا کی تیز رفتار ترقیات کے دور میں قلمکاروں کے سامنے بے پناہ امکانات ہیں اور اب ہمارے تخلیق کار جدید ٹکنالوجی کا استعمال کرکے زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچ سکتے ہیں اور شہرت و ناموری حاصل کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اب اردو کے فروغ اور خود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے کما حقہ اظہار کے لیے بھی جدید ٹکنالوجی، سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ سے آگاہی ضروری ہے، اس کے بغیر نہ ہم کسی علمی شعبے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، نہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اچھی طرح اظہار کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنی زبان و ادب کے فروغ و ترویج کا کام کر سکتے ہیں۔ دوسرے تکنیکی سیشن کی صدارت ڈاکٹر عبدالحق یونیورسٹی کرنول کے بانی وائس چانسلر پروفیسر مظفر علی شہہ میری نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب (جے این یو) نے انجام دیے۔ اس سیشن میں پانچ مقالات پڑھے گئے، مقالہ نگاروں میں جناب عبدالسمیع بوبیرے (مہاراشٹر)، پروفیسر غلام ربانی (بنگلہ دیش)، پروفیسر غیاث الرحمٰن سید (دہلی)، جناب ایلدوست ابراہیموف (آذربائیجان)، پروفیسر احتشام عالم خان (حیدرآباد) کے نام شامل ہیں۔ صدرِ جلسہ نے اپنی تقریر میں مقالہ نگاروں کے ذریعے اٹھائے گئے نکات کو قابلِ توجہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ سوشل میڈیا اور دیگر جدید ٹکنالوجیکل ذرائع کا مثبت استعمال ضروری ہے۔ اردو کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ سوشل میڈیا پر نشر کیے جانے والے مواد اور تخلیقات کی نگرانی کے لیے ایک مرکزی انجمن تشکیل دی جا سکتی ہے، ساتھ ہی اردو کے لسانی و ادبی ورثے اور اردو تہذیب کے تحفظ کے لیے نئے تخلیق کاروں کی خصوصی تربیت بھی ضروری ہے۔ سوشل اور الیکٹرانک میڈیا کے تیز تر پھیلاؤ کے عہد میں زبان و معلومات کی صحت و استناد پر توجہ دینا ہم سب کی ذمے داری ہے، ورنہ معمولی کوتاہی سے ہماری زبان کو غیر معمولی خساروں سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔

تیسرے تکنیکی سیشن کی صدارت پروفیسر آذرمیدخت صفوی نے کی، جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد کاظم نے انجام دیے۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر عطاء اللہ خان کاک سنجری (کیرالا)، پروفیسر مشتاق احمد، ڈاکٹر سید زین الحق شمسی (بہار)، پروفیسر اقبال احمد (یوپی)، پروفیسر احمد محمد احمد عبدالرحمٰن (مصر) کے نام شامل ہیں۔ پروفیسر آذرمیدخت صفوی نے اپنے صدارتی خطاب میں سوشل و الیکٹرانک میڈیا کے دور میں اردو زبان اور تلفظ کو درپیش چیلنجز کی نشان دہی کرتے ہوئے اس سمت میں خصوصی اقدامات کی ضرورت پر زور دیا۔ چوتھے اور آخری سیشن کی صدارت پروفیسر انور پاشا (جے این یو) نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر امتیاز احمد (دہلی یونیورسٹی) نے انجام دیے۔ مقالہ نگاروں میں پروفیسر ابوذر عثمانی، پروفیسر راشد احمد (بنگلہ دیش)، جناب فہیم اختر (لندن)، پروفیسر حدیث انصاری (راجستھان)، ڈاکٹر ہما پروین (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) شامل تھے۔ پروفیسر انور پاشا نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ سوشل میڈیا کی حیرت ناک ترقی کے دور میں اردو زبان و ادب اور اردو تہذیب کے تحفظ کے لیے ہمیں منظم کوشش کرنی ہوگی۔ ان کا کہنا تھا کہ سوشل میڈیا سے جہاں دور تک رسائی آسان ہوگئی ہے اور اس کے دوسرے بہت سے فائدے ہیں، وہیں اس کی وجہ سے بہت سی منفی چیزیں بھی سامنے آرہی ہیں، ہمیں ان منفی چیزوں سے بچتے ہوئے اپنی تخلیقات لوگوں تک پہنچانے کی تدبیر کرنی ہوگی۔

عالمی ویبینار کے آخر میں کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام شرکا اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس دو روزہ ویبینار میں پڑھے جانے والے تمام قیمتی مقالات کو کونسل کی جانب سے کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا اور انھیں پوری دنیا کے ادیبوں اور اردو سے دلچسپی رکھنے والوں تک پہنچایا جائے گا تاکہ وہ ان مقالات سے کما حقہ استفادہ کر سکیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ سوشل اور الیکٹرانک میڈیا میں اردو کے بہتر استعمال اور اس سلسلے میں درپیش چیلنجز سے نمٹنے کے لیے قومی کونسل اپنا ہر ممکن کردار ادا کرے گی۔ اس سلسلے میں ملک و بیرونِ ملک کے دانشوران و اسکالرز کے مشوروں اور تجاویز کا بھی ہم خیر مقدم کریں گے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس عالمی ویبینار کو کامیابی سے ہم کنار کرنے میں کونسل کی جانب سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، جناب انتخاب احمد (ریسرچ آفیسر)، اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ٹیکنکل معاونین اور دیگر اسٹاف نے اہم کردار ادا کیا۔

”
سوشل اور الیکٹرانک میڈیا میں اردو کے بہتر استعمال اور اس سلسلے میں درپیش چیلنجز سے نمٹنے کے لیے قومی کونسل اپنا ہر ممکن کردار ادا کرے گی اس سلسلے میں ملک و بیرون ملک کے دانشوران و اسکالرز کے مشوروں اور تجاویز کا بھی ہم خیر مقدم کریں گے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔
“

■

Nayab Hasan
A/22, Seema Apts, Batla House
Lane No:7, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025
Email.: nh912823@gmail.com

زبان قوموں کی ترقی کی ضامن ہے

محمد اسد اللہ

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورت حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورت حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

ڈاکٹر محمد اسداللہ (پ: 16 جون 1918، امراوتی، مہاراشٹر) انشائیہ نگار، مراٹھی زبان کے مترجم اور ادیب الاطفال کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ انہوں نے ایم اے، بی ایڈ، پی ایچ ڈی، ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن کی ڈگریاں لی ہیں۔ ان کی تصانیف میں انشائیہ کی روایت: مشرق و مغرب کے تناظر میں، پیکر اور پرچھائیاں، پر پرزے، بوڑھے کے رول میں، خواب نگر وغیرہ مشہور ہیں اور تراجم کے ذیل میں جمال ہم نشیں، دانت ہمارے کا ذکر یوں کیا جاسکتا ہے کہ اس سے مراٹھی مزاحیہ ادب کی ایک تصویر سامنے آتی ہے۔ انہوں نے ماہنامہ 'کھلونا' کا ایک انتخاب بھی شائع کیا ہے۔ ان کی بہت سی تحریریں انتخابات اور درسی کتابوں میں بھی شامل ہیں۔

سوال: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: زبانوں کی موت دو سطحوں پر واقع ہوتی ہے۔ ایک سماج میں بول چال اور تحریر و تدریس میں زبان کا استعمال عملی طور پر ختم ہوجائے اور دوسرے اس زبان میں ادب کی تخلیق کا عمل رک جائے۔ زبانیں ان لوگوں سے اور ان لوگوں میں زندہ رہتی ہیں جو انھیں ایک تہذیبی سرگرمی کے طور پر اپناتے ہیں۔ جب لوگ ان دونوں سطحوں پر اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کریں تو زبان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔

سوال: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟

جواب: متعلقہ معاشرے میں اس زبان سے محبت پیدا کی جائے اور اس شعور کو پروان چڑھایا جائے کہ زبان ہماری تہذیب کا حصہ ہے، معاشرے کی ترقی صرف مادی ترقی کا نام نہیں ہے۔ زبان، ادب اور تہذیب ہر قوم کی شناخت ہے۔ معاشرہ صحیح معنوں میں ترقی کی راہ پر اس وقت گامزن ہوتا ہے جب وہ علم و ثقافت کو اپنے دامن میں جگہ دیتا ہے اور اسے پروان چڑھاتا ہے۔ زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ہم ان تمام اداروں کا تعاون کریں جو زبان کی ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ ان میں فلاحی تنظیمیں، اشاعتی ادارے (اخبارات و رسائل وغیرہ) اور تدریسی ادارے بھی شامل ہیں۔

سوال: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیا رشتہ ہے؟

جواب: زبان تہذیب و تمدن کے اہم ترین مظاہر میں سے ہے۔ زبان ہی عملی زندگی میں کسی شہری کو متمدن اور تہذیب یافتہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ زبان میں تخلیق ادب کا سلسلہ اس قوم کی شعوری، جذباتی اور ذہنی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوتا ہے۔ تعلیم قومی ترقی کا زینہ ہے اور زبان ذریعۂ تعلیم کے طور پر اس میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔

سوال: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا سلسلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

جواب: انسانی تاریخ اور تہذیبی ورثے کو زبان اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔ یہی ورثہ قوموں کی ترقی کا ضامن ہے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جس قوم کی کوئی تاریخ نہیں اس کا کوئی مستقبل بھی نہیں یعنی تاریخی اور تہذیبی پس منظر ایک بہت بڑا محرک اور رہنما ثابت ہوتا ہے۔ یہی تہذیبی ورثہ کسی قوم کو دیگر اقوام میں امتیازی شان عطا کرتا ہے یا ایک مخصوص معیار تک پہنچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ زبان کا ختم ہوجانا گویا ایک ایسے ذریعے کا ناپید ہوجانا ہے جس سے تہذیبی ورثہ باقی تھا۔

سوال: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

جواب: کسی زبان میں مذکورہ مواد کی کمی اس زبان کی بے بضاعتی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا منفی اثر یہ ہوگا کہ اہل زبان اس مواد کی تلاش میں دیگر زبانوں سے رابطہ قائم کریں گے اور اپنی زبان کے متعلق احساسِ کمتری کا شکار ہوں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ہم خود اس قسم کی کتابیں تیار کریں۔ اس سلسلے میں دیگر زبانوں سے استفادہ کر کے اپنی زبان کو اس قابل بنایا جائے تاکہ ہمیں ادھر ادھر نہ دیکھنا پڑے۔ شکر ہے کہ اردو میں اس ضمن میں قابلِ قدر کام ہورہا ہے۔

سوال: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

جواب: سب سے بڑا خطرہ تو وہی ہے جسے کسی شاعر نے اس مصرع میں بیان کیا ہے۔

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اہلِ اردو کی بے اعتنائی اور اردو کے تعلیمی و تدریسی اداروں کی غفلت شعاری موجودہ حالات میں اس زبان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ تعلیم کے نام پر خانہ پری کا ہونا اردو زبان سے طلبا کے رابطے کو کمزور کر رہا ہے اور انھیں اردو کو چھوڑ کر انگریزی اور مقامی زبانوں کی تعلیم گاہوں کی طرف جانے پر مجبور کر رہا ہے۔ والدین اپنے بچوں کو اس امید پر اردو اداروں میں داخل کرواتے ہیں کہ وہ اپنی تہذیب سے جڑے رہیں گے مگر ان کی اس امید پر اکثر پانی پھر جاتا ہے۔ ان اداروں میں ڈونیشن لے کر نا اہل اساتذہ کا تقرر کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہاں تعلیم کی وہ گت بنتی ہے کہ اس اسکول کے اساتذہ خود بھی وہاں اپنے بچوں کو پڑھانا پسند نہیں کرتے۔

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ اردو دنیا میں مشاہیر ادب کے انٹرویو شائع کیے جاتے تھے یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
س: زبان کا تہذیب و ثقافت سے کیا رشتہ ہے؟
س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟
س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟
س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟
س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں؟ اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
س: آپ کے علاقے میں اردو سے وابستہ کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی / قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
س: آپ علاقائی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور منصوبے ہیں؟
س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جا سکتی ہیں؟
س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟
س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
س: آپ کے علاقے میں کتنے کالج یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جا سکتی ہے؟

urduduniyancpul@yahoo.co.in editor@ncpul.in

سوال: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

جواب: وقت کے ساتھ اردو زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال کم ہو رہا ہے۔ اگرچہ تحریری سطح پر یہ خوبی اب بھی زبان میں موجود ہے۔ انگریزی اور ہندی کے علاوہ مقامی الفاظ کا استعمال بڑھ رہا ہے جس کے سبب زبان ایک الگ رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے مگر زبانوں میں اس قسم کی تبدیلیاں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔

سوال: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: اردو زبان کو ملنے والی سرکاری امداد اور اس کی ترقی کے لیے کوشاں افراد اور اداروں کی کثرت کے باوجود عوامی سطح پر اس زبان کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ مختلف ریاستوں میں اردو کی تعلیم گاہوں کا بتدریج ختم ہونا خطرے کی گھنٹی ہے۔ اس کے باوجود اہلِ اردو کی اس زبان سے محبت، عوامی سطح پر اس کا استعمال اور شعر و ادب تخلیق کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہمیں اس کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونے دیتی۔

سوال: زبان کی سطح پر جو بگاڑ ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جا سکتی ہیں؟

جواب: تعلیمی اداروں میں طلبا اور اساتذہ کے لیے تربیتی کارگاہیں (ورکشاپ) اور تعلیم گاہوں سے باہر منعقد ہونے والے ادبی مذاکرے، سمینار جن میں زیادہ سے زیادہ اردو والے شرکت کریں، اس صورت حال کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ یہ مجالس ہاتھی دانت نہ ہوں۔ ان سے لوگ استفادہ بھی کریں۔

سوال: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں؟ اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

جواب: اس سلسلے میں اب پہلے کی طرح کام نہیں ہو رہا ہے۔ زبان سے متعلق کتابیں اور ادبی کتابیں دونوں میں معیار کی کمی اب کھٹکتی ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کاموں کے لائق افراد اٹھتے جا رہے ہیں، سہل پسندی بڑھتی جا رہی ہے۔

سوال: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جواب: یہ گفتگو آگے کا راستہ طے کرنے (یعنی تعین اور سفر دونوں) میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ یوں بھی جہاں کام ہونا چاہیے وہاں بھی گفتگو ہی ہو رہی ہے۔ اب یہ بھی بند ہوجائے گی تو کیا بچے گا۔ لہو گرم رکھنے کا بہانا بھی تو چاہیے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں؟ اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

جواب: ناگپور میں اردو میڈیم کے 13 جونیئر کالج، 29 ہائی اسکول اور 22 پرائمری اسکولس ہیں۔

اس شہر میں سرکاری (کارپوریشن، ناگپور) اور نجی اداروں کی تعلیم گاہیں ہیں جن میں سے بعض اداروں میں پرائمری سے جونیئر کالج تک تعلیم کا انتظام ہے۔ ان میں طلبا اور اساتذہ کی بڑی تعداد موجود ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں۔

جواب: شہر ناگپور میں اردو کی پانچ سات لائبریریاں ہیں جہاں کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ اور اردو اخبارات و رسائل موجود ہیں جو اپنے قارئین کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

جواب: اردو زبان و ادب کے فروغ کی خاطر کئی ادارے ایک مدت سے شہر ناگپور میں اپنی خدمات پیش کر رہے ہیں۔ ان ہی کی بدولت یہاں مشاعرے (طرحی و غیر طرحی)، مذاکرے، سمینار، کتابوں کے جشن اجرا، اہل ادب کا استقبال، طلبا کے تحریری و تقریری مقابلے، مخصوص دنوں پر تقاریب وغیرہ سے متعلق سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ ان میں سے چند قابل ذکر ادارے اور تنظیمیں درج ذیل ہیں۔ صدر مسلم لائبریری، فضل النساء بیگم میموریل ٹرسٹ، یونائیٹیڈ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن، انجمن فلاح المسلمین، احباب کوآپریٹو سوسائٹی، بزم طرفہ قریشی، ادبستان، پاسداران ادب، سر سید ایجوکیشن سوسائٹی، مسلم فرینڈس سوسائٹی، انجمن ترقی اردو شاخ ناگپور اور ادارہ ماہنامہ الفاظ ہند، کامٹی وغیرہ۔ مختلف اسکولوں اور کالجوں کی جانب سے منعقد ہونے والی اردو کی تقریبات اور سیمینار علاحدہ ہیں۔

ناگپور میں غیر مسلموں کے بعض ایسے ادارے بھی ہیں جن کی اردو نوازی کے سبب ان کے کمیونٹی ہال میں اردو کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ کبھی وہ خود اس کا اہتمام کرتے ہیں، کبھی اردو والوں کی مدد کرتے ہیں اور اس سلسلے کی دیگر سہولتیں بھی وہ فراہم کرتے ہیں۔ ان میں یشونت راؤ چوہان پرتشٹھان (صدر ڈاکٹر گریش گاندھی)، وِدربھ ساہتیہ سنگھ، ہندی ساہتیہ سنگھ وغیرہ کی جانب سے اردو اور عربی کی کلاسیس (بلا معاوضہ)، کے علاوہ پروگرام، غزل کے مسافر، اندازِ بیاں اپنا، پرواز، اردو کے ادیبوں اور خاص طور پر اردو اکادمیوں کی جانب سے دیے گئے انعامات پر قلم کاروں کا استقبال اور خاص دنوں پر اردو کی تقاریب کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔

سوال: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

جواب: مقامِ شکر ہے کہ یہاں کے کئی قلم کار گزشتہ برسوں کے دوران ملک کی اہم اکادمیوں سے اپنی کتابوں پر انعامات حاصل کرتے رہے ہیں۔ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے بھی بڑے پیمانے پر ودربھ کے اہلِ قلم کی مجموعی ادبی خدمات کے علاوہ اساتذہ اور اردو کے خدمت گاروں کی کاوشوں کا اعتراف کرکے انھیں انعامات سے نوازا ہے۔ علاوہ ازیں قومی سطح پر ڈاکٹر محبوب راہی (اکولہ) ڈاکٹر بانو سرتاج (چندر پور) اور وکیل نجیب (ناگپور) کو ادبِ اطفال سے متعلق خدمات کے لیے ساہتیہ اکادمی کی جانب سے خصوصی انعام سے نوازا جاچکا ہے تاہم اب بھی کئی ایسی شخصیات ہیں جو ادب کے مختلف شعبوں میں اپنی مجموعی خدمات پر قومی سطح کے انعامات کی مستحق ہیں۔ ان میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر صفدر، ڈاکٹر یحییٰ نشیط، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن، ڈاکٹر مدحت الاختر، ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، حیدر بیابانی، سید غلام علی، متین اچلپوری ڈاکٹر اشفاق احمد وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

سوال: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

جواب: اس سلسلے میں میری کوششیں مختلف ادبی انجمنوں اور ادبی اداروں کے توسط سے ادبی تقریبات کا اہتمام اور اردو قلم کاروں کی تخلیقات اور کتابوں کی اشاعت میں تعاون تک محدود ہیں۔

سوال: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

جواب: فروغ اردو کے لیے تعلیمی اداروں کو میں سب سے مضبوط اور مفید پلیٹ فارم تصور کرتا ہوں جہاں سے آئندہ نسلیں اپنے ساتھ اردو کے لیے ترویج و بقا کا سامان لے کر جائیں گی۔ افسوس کہ ہمارے بیشتر تدریسی ادارے اردو زبان کی تدریس کے تقاضوں اور اس کی مخصوص تہذیب کے تحفظ کی طرف سے مجرمانہ غفلت کا شکار ہیں۔ یہ تعلیم گاہیں اردو کے لیے موت کا پیغام ثابت ہورہی ہیں، اور قدرت کی طرف سے ان کو اس کی معقول سزا بھی مل رہی ہے کہ ایسے اسکول اور کالج جہاں ایڈمیشن حاصل کرنا مشکل سمجھا جاتا تھا اب وہاں کے ٹیچرس طلبا کے داخلوں کے لیے دردر بھٹک رہے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اردو کی تدریس کے نظام کو درست ہونا چاہیے تاکہ اردو والے وہاں سے اپنے بچوں کو نکال کر دیگر اداروں میں نہ ڈالیں۔

سوال: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

جواب: یقیناً کی جاسکتی ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو اردو سکھائیں۔ مدارس کی ہمت افزائی کریں۔ روزمرہ زندگی میں اور سوشل میڈیا پر بھی اردو کے استعمال کو اپنا شعار بنائیں۔ اس سے بہت بڑے فوائد کی توقع نہ کرتے ہوئے اسے اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہوئے انجام دیں تو اس کے بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ زبانیں ایسے ہی پنپتی ہیں۔

سوال: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

جواب: علاقائی زبانوں سے اردو کے رشتے استوار کرنے کی کوششیں خاص طور پر مہاراشٹر میں ہمیشہ بار آور ہوئی ہیں۔ ہمارا مشاہدہ یہی ہے۔ اس سلسلے میں غیر اردو داں طبقے میں اردو سکھانے کی کوششوں کو ہمیشہ زبردست حوصلہ افزائی ملی ہے۔ اردو زبان کی حلاوت اور دلکشی کے سبب اکثر لوگ اسے سیکھنا چاہتے ہیں مگر اردو اکادمیاں اور اس کام کے اہل اردو ادارے ان کے اس جذبے کا خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھا پارہے ہیں۔

سوال: کیا آپ کے اہلِ خانہ اردو زبان لکھنا، پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

جواب: خدا کا شکر ہے کہ اردو زبان میرے گھر میں زندہ ہے اور میں اس کی دھڑکنیں ہر سطح پر سنتا ہوں۔

سوال: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

جواب: ان شاءاللہ۔ اپنے مذہب اور اردو زبان کے بغیر ہم اپنی نسلوں کے بہتر مستقبل کا تصور ہی نہیں کرسکتے ہیں۔

سوال: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونی ورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

فروغِ اردو کے لیے تعلیمی اداروں کو میں سب سے مضبوط اور مفید پلیٹ فارم تصور کرتا ہوں جہاں سے آئندہ نسلیں اپنے ساتھ اردو کے لیے ترویج و بقا کا سامان لے کر جائیں گی۔ افسوس کہ ہمارے بیشتر تدریسی ادارے اردو زبان کی تدریس کے تقاضوں اور اس کی مخصوص تہذیب کے تحفظ کی طرف سے مجرمانہ غفلت کا شکار ہیں۔

جواب: شہر ناگپور میں شعبۂ اردو، ناگپور یونیورسٹی (کیمپس) اور وسنت راؤ نایک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز (اولڈ مارس کالج) میں پوسٹ گریجویشن (ایم اے) کی سطح پر اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔

سوال: شہر کے پانچ ڈگری کالجوں میں اردو میں گریجویشن (بی اے) کی تعلیمی سہولت موجود ہے۔ اولڈ مارس کالج (نیا نام اوپر درج ہے) میں مخلوط تعلیم کا انتظام ہے بقیہ چار خواتین کے لیے مخصوص ہیں جہاں سے وہ اردو میں بی اے کرسکتی ہیں (1. ایل اے ڈی ڈگری کالج، 2. انجمن گرلز ڈگری کالج 3. ام سلمیٰ گرلز ڈگری کالج 4. اور یشودا گرلز آرٹس اینڈ کامرس کالج، ناگپور) ناگپور سے تقریباً دس کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع کامٹی میں پوروال ڈگری کالج سے اردو میں بی اے تک تعلیم حاصل کی جاسکتی ہے۔ طلبہ کی بڑی تعداد اس سے فیضیاب ہورہی ہے۔

سوال: ملکی سطح پر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح مدد لی جاسکتی ہے؟

جواب: اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے مالی تعاون بہرحال ضروری ہے۔ سرکاری اداروں کی مدد سے اردو کو بہت فائدہ ہوا ہے۔

زبان کی ترویج اور ادب کی تخلیق اور کتابوں اور رسائل کی اشاعت میں سرکاری ادارے بہت معاون ثابت ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہے جس کی فیض رسانی اب بھی جاری ہے۔

■

Muhammad Asadullah
30, Gulsitan Colony
Near Pande Amrai Lance
Nagapur - 440013 (MS)

تنقید و نگاہ

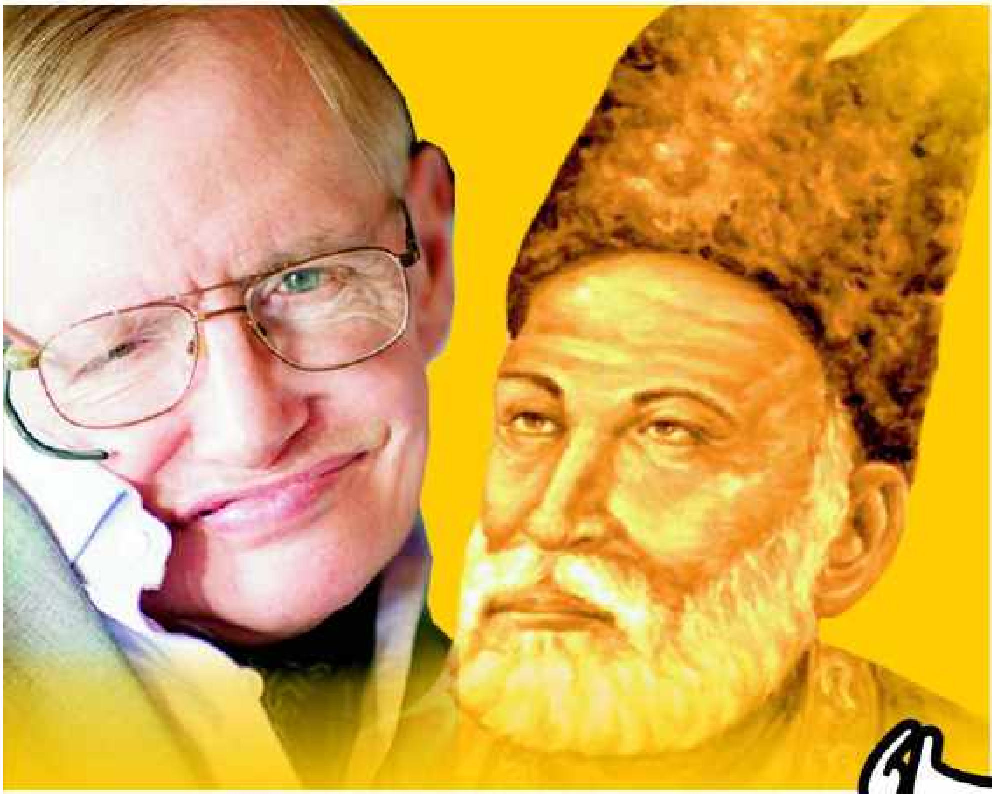

سلیم محی الدین

غالب، ہاکنگ، خدا اور کائنات

غالب ہماری زبان اور شاعری کا تہذیبی محاورہ ہے۔ جو اردو جانتا ہے غالب کو جانتا ہے اور جو اردو نہیں جانتا وہ بھی غالب کو جانتا ہے۔ اردو والے تک غالب زبان کے حوالے سے پہنچتا ہے اور غیر اردو داں تک اپنی فکر کے حوالے سے۔ کالی داس، تلسی داس، خسرو، کبیر، میر اور غالب ہمارے ادبی و تہذیبی شعور کا حصہ ہیں۔ غالب ان سب میں نمایاں اس لیے ہے کہ غالب آخر غالب ہے۔

غالب نے کتابیں کرائے پر حاصل کر کے پڑھیں، روزگار پر وظیفہ خوری کو ترجیح دی، حتیٰ کہ شراب بھی قرض کی پی۔ اس کے باوجود غالب ہمارے اجتماعی حافظے کا حصہ ہے۔ وہ اپنے مضامین روز مرہ کی زندگی سے اٹھاتا ہے اور انھیں کو مکالمے کی صورت ہم تک پہنچاتا ہے۔ ہر چند کہ ان اشعار میں معنی کی کئی پرتیں ہوتی ہیں اور ساتھ ہی ایک گہرا فلسفہ بھی۔ لیکن ان اشعار کی خوبی یہی ہے کہ وہ سامنے کے معنی سے بھی قاری کو اپنی گرفت میں لینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ غالب نرا شاعر نہیں ہے۔ وہ نہ جولانی طبع کے جوش میں شعر کہتا ہے اور نہ ہی بیت برائے بیت کا قائل ہے۔ غالب کی عظمت اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ انسان، خدا، کائنات اور زندگی کے تئیں اپنی فکر اور اپنا فلسفہ رکھتا ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غالب اپنے عہد کا نباض بھی ہے اور اس کی نگاہ اپنے عہد سے آگے بھی دیکھتی ہے۔ وہ پرستار خدا ہے اور گرفتار تصوف بھی، قدامت کا شکار بھی ہے اور نئے موسموں کا واقف کار بھی۔ اسی لیے جب سرسیّد احمد خاں نے اپنی تصنیف 'آئین اکبری' کی تقریظ کے لیے کہا تو وہ اسی تقریظ میں آئین اکبری کی قدامت کی شکایت اور کلکتہ سے طلوع ہوتے صنعتی انقلاب کے سورج کی وکالت کر بیٹھے۔ بقول علی سردار جعفری۔

''غالب کے پاس سماجی ارتقا کا ایک معقول تصور تھا... یہ محض تصور و تخیل کی پرواز نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ وہ اکبری عہد کے آئین کے مقابلے میں نئے صنعتی نظام کو ترجیح دیتا تھا اور سائنس کی ایجادات اور تصورات کو شاعری میں جگہ دینے کے حق میں تھا۔''[1]

ہر بڑے فنکار کی چیخ اپنے عہد کے اس پار اس لیے سنائی دیتی ہے کہ وہ اپنے عہد سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ غالب کے عہد میں تکنالوجی نے ترقی تو نہیں کی تھی لیکن انگلستان میں صنعتی انقلاب برپا ہو چکا تھا اور اس کے اثرات ہندوستان میں بھی دیکھے جانے لگے تھے۔ اپنی پنشن کے مقدمے کے سلسلے میں جوانی کی عمر میں غالب کلکتہ جا کر سائنسی ترقی کے یہ جلوے اپنی نظروں سے دیکھ چکے تھے۔ خطوط رسانی کا نظام قائم ہو چکا تھا اور غالب مکتوب نگاری کے جوہر دکھانے لگے تھے۔ ان کی تصانیف لیتھو پریس پر چھپنے لگی تھیں۔ ان کا مشورہ ''مردہ

غالب اپنے عہد کا نباض بھی ہے اور اس کی نگاہ اپنے عہد سے آگے بھی دیکھتی ہے۔ وہ پرستار خدا ہے اور گرفتار تصوف بھی، قدامت کا شکار بھی ہے اور نئے موسموں کا واقف کار بھی۔ اسی لیے جب سر سیّد احمد خاں نے اپنی تصنیف 'آئین اکبری' کی تقریظ کے لیے کہا تو وہ اسی تقریظ میں آئین اکبری کی قدامت کی شکایت اور کلکتہ سے طلوع ہوتے صنعتی انقلاب کے سورج کی وکالت کر بیٹھے۔

پروردن مبارک کارنیست'' سرسید کوایسا بھایا کہ انھوں نے اسے ہمیشہ کے لیے اپنالیا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غالب نے سرسید کو اک نواہائے راز کا ہمراز بنالیا۔

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

غالب کے لیے تصوف ہی سائنس کا نعم البدل تھا اور تخیل رہنما۔ لیکن غالب سے مکمل ایک صدی بعد ایک ماہر طبیعات اسٹفین ہاکنگ (1942-2018) کائنات کے اسی نواہائے راز کا پردہ ہٹاتے ہوئے عالم انسانیت کی کامیابی کا اعلان کچھ اس انداز میں کرتا ہے۔

''کائنات ایک مشین ہے جو کچھ اصولوں اور قوانین کے تحت کام کرتی ہے۔ ایسے قوانین جن سے انسانی ذہن کو درک حاصل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان قوانین کی دریافت عالم انسانیت کی عظیم ترین کامیابی ہے۔''[2]

بظاہر تصوف اور سائنس میں کوئی علاقہ نظر نہیں آتا۔ تصوف سراسر روحانیت ہے تو سائنس سراسر مادیت۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ اردو معاشرے میں سائنس سے قبل تصوف ہی وسیع النظری اور وسعت قلبی کا مظہر تھا۔ اہل تصوف ہی میں سائنسی مظاہر کو سراہنے اور اپنانے کی طاقت ہوا کرتی تھی۔ ہندوستانی معاشرے میں اس کی عمدہ مثال امیر خسرو ہیں۔ جو بیک وقت ایک صوفی صافی بھی تھے اور جنھیں وزارت اور امارت بھی حاصل تھی۔ معاشرتی دائروں کو توڑنا اپنے آپ میں ایک انقلابی قدم ہوتا ہے۔ ایک صوفی ہوتے ہوئے امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں نہ صرف کئی نئے راگ تشکیل دیے بلکہ موسیقی کے کئی آلات بھی ایجاد کیے۔ ان کا ایجاد کردہ آلۂ موسیقی 'ستار' آج ہندوستانی موسیقی کا جزو لاینفک ہے۔ کسی آلے کی ایجاد سائنسی کارنامہ نہیں تو اور کیا ہے۔ تصوف اور سائنس میں تضاد کے باوجود کہیں نہ کہیں کوئی نقطۂ اتصال ضرور موجود ہے۔ غالب اور ہاکنگ میں بھی یہ تضاد نمایاں نظر آتا ہے۔ غالب کی وحدانیت اور ہاکنگ کی دہریت دونوں ہی مشہور عالم ہیں۔ بلاشبہ غالب کے ہاں تشکیک کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے لیکن اس سے غالب کی فکر پر آنچ نہیں آتی۔

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

غالب کی طرح ہاکنگ بھی سوال کھڑا کرتا ہے لیکن وہ تو سیدھے کائنات کے خالق پر ہی سوال کھڑا کردیتا ہے اس کے مطابق سائنس دنیا کے آغاز اور انجام دونوں سے واقف نہیں لہٰذا اس کے خالق پر سوال اٹھانا لازم ہے۔ بقول اسٹفین ہاکنگ۔

''اگر کائنات اپنا کوئی آغاز رکھتی تو ہم بھی فرض کرسکتے تھے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ لیکن اگر یہ واقعتاً خود کفیل اور لامحدود ہے تو اس کا نہ تو کوئی آغاز ہوگا اور نہ ہی انجام۔ ایسے میں خالق کے لیے کہاں گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔''[3]

ہاکنگ کے نزدیک خدا کے وجود سے انکار کا سبب کائنات کے آغاز وانجام سے عدم واقفیت ہے۔ وہ اپنی اس سوچ میں کس حد تک صحیح ہے؟ یہ تو وہی جان سکتا ہے یا اس جیسا کوئی۔ فکری انتشار کے اس موڑ پر غالب کی فکر نسبتاً مربوط اور منظم لگتی ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ اگر ہم میں راز حقیقت دریافت کرنے کی قوت نہیں تو نہ سہی، اجسام ظاہر کا مطالعہ ہی ہمارے لیے کافی ہے کیونکہ مجاز ہی حقیقت کا زینہ ہے۔

نہیں گر سرو برگ ادراک معنی
تماشائے نیرنگ صورت سلامت

مجاز کو حقیقت کا زینہ سمجھنے والا غالب جنت کی حقیقت سے بھی بخوبی واقف ہے اور یہی واقفیت اس کے مزاج کی شگفتگی کا باعث بھی ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

حیات بعد از وفات بے شک ایک اہم موضوع ہے جس پر غور وفکر ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ جنت کی حقیقت سے واقفیت کے اعلان میں یقیناً ایک گہرا طنز پوشیدہ ہے لیکن اس سے جنت کی حقیقت سے انکار ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ موضوع سائنس کے لیے بھی ایک سنجیدہ موضوع ہے۔ بقول ہاکنگ۔

'' میں دماغ کو ایک کمپیوٹر مانتا ہوں جو کہ اپنے اجزاء کے ناکام ہونے پر کام کرنا چھوڑ دے گا۔ ان ٹوٹی ہوئی مشینوں کے لیے کوئی جنت یا حیات بعد از موت نہیں ہوتی ہے۔ یہ تو اندھیرے سے خوف زدہ لوگوں کے لیے ایک پریوں کی کہانی ہے۔''[4]

ہاکنگ کے مطابق انسان کائنات کے بیشتر اہم راز جان چکا ہے اور بہت کم راز ایسے ہیں جن تک انسان کو رسائی حاصل کرنا باقی ہے اس کا دعویٰ ہے کہ اکیسویں صدی کے اختتام تک کائنات کا کوئی راز راز نہیں رہے گا۔ گویا بہ زبان غالب۔

واکردیے ہیں شوق نے بند نقاب حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

آئنسٹائن اس نظریے کو سختی سے مسترد کرچکا ہے کہ کاروبار دنیا مبنی بر اتفاق ہے وہ کہتا ہے کہ God does not play dice یا خدا بازی نہیں لگاتا۔ لیکن ہاکنگ اس بات کو نہیں مانتا اس کے بقول۔

''سارے ثبوت اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ خدا ایک قمار باز ہے وہ ہر بازی کھلی رکھتا ہے اور پھر چاہے نرد پھینکی جائے یا چاک گھمایا جائے جیت اسی کی ہوتی ہے۔''[5]

اگر کائنات اپنا کوئی آغاز رکھتی تو ہم بھی فرض کرسکتے تھے کہ اس کا کوئی خالق ہے۔ لیکن اگر یہ واقعتاً خود کفیل اور لامحدود ہے تو اس کا نہ تو کوئی آغاز ہوگا اور نہ ہی انجام ایسے میں خالق کے لیے کہاں گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔

آئنسٹائن اور ہاکنگ کے نزدیک دنیا خدا کی بازی ہے لیکن غالب کے نزدیک تو یہ محض بازیچہ بلکہ بازیچہ اطفال ہے۔

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشہ مرے آگے

غالب کے لیے دنیا بازیچہ اطفال کیسے ہوگئی کیا وہ پرواز تخیل میں ہمارے ماہرین طبیعیات سے بھی بازی لے گیا ہے۔ جی ہاں۔ کیونکہ تصوف کے حوالے سے صوفی اپنے آپ کو اس ذات عظیم وپاک میں ضم کردیتا ہے جو ہر شے میں موجود ہے اور ہر شے پر قادر ہے۔

ہر چند کہ ہر ایک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

شعور کی اس منزل تک پہنچنے کے لیے ایک دیدۂ بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسا دیدۂ بینا جسے قطرے میں دریا اور جزو میں کل دکھائی دیتا ہو۔

قطرے میں دریا دکھائی نہ دے اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

واضح رہے کہ غالب کی منطقی فکر کے پیچھے سائنس یا فلسفہ نہیں ہے۔ یہ تصوف کی دین ہے جو بیچ دریا میں ڈبو بھی سکتا ہے اور عرش سے پرے کی سیر بھی کرواسکتا ہے۔ انسانی فکر وشعور کا اپنے زماں ومکاں سے گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفکرین اور سائنسدانوں کے پیش کردہ نظریات تبدیل بھی ہوتے ہیں۔ ارتقا بھی پاتے ہیں۔ خدا کے وجود سے منکر ہاکنگ اپنی آخری تصنیف "Brief Answers to Big Questions" میں پورا ایک باب ''کیا خدا موجود ہے'' کے نام سے شامل کرتا ہے اور خدا کے وجود کو قبول کرنے کی لگار پر نظر آتا ہے۔

''میرا یقین ہے کہ کائنات سائنس کے قوانین کے تحت چلتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ قوانین خدا نے بنائے ہوں۔ لیکن خدا اپنے قوانین کو توڑنے میں مداخلت نہیں کرتا۔''6

یہ تو وہی بات ہوئی کہ ''اک بار جو میں نے کمٹ منٹ کر دی تو پھر میں خود کی بھی نہیں سنتا۔'' بہرحال یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سائنس کے موجودہ قوانین انسانی سوچ اور زندگی سے ہم آہنگ ہیں اور اس کے تسلسل اور ارتقاء کے لیے موزوں اور کارآمد بھی۔ یہ ٹھیک ہی ہے کہ ہاکنگ کا خدا اس میں مداخلت نہیں کرتا ورنہ ان قوانین میں ذرا سی مداخلت کرۂ ارض پر نوع انسانی کا نہ صرف جینا دوبھر کرسکتی ہے بلکہ اس کے وجود کے لیے بھی خطرہ ثابت ہوسکتی ہے۔ موجودہ وبائی صورت حال کیا اس کی ایک ادنیٰ جھلک نہیں ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پچھلی تقریباً ایک چوتھائی صدی سے سائنس کے میدان میں جمود طاری ہے اکیسویں صدی میں کوئی قابل ذکر سائنسی ایجاد اب تک سامنے نہیں آئی ہے۔ اس جمود کو توڑنے کے لیے پھر اک بار ہاکنگ ہی کو آگے آنا پڑا۔ اپنے عظیم منصوبے (The Grand Design) کے ساتھ اور یہ عظیم منصوبہ کچھ اس طرح ہے۔ بقول ہاکنگ۔

''نظام شمسی ہی کی طرح کائناتیں بھی تعداد میں کئی ہیں۔ ہر کائنات کے اپنے اپنے قوانین ہیں۔ کہیں اجسام فلکی کے مابین کشش ثقل موجود ہے تو کہیں ضد ثقل۔ ان متعدد نظام کائنات میں سے ہم اتفاقاً ایسی کائنات میں رہتے بستے ہیں جو انسانوں اور انسانی زندگی کے لیے سازگار ہے۔''7

غالب کی منطقی فکر کے پیچھے سائنس یا فلسفہ نہیں ہے۔ یہ تصوف کی دین ہے جو بیچ دریا میں ڈبو بھی سکتا ہے اور عرش سے پرے کی سیر بھی کرواسکتا ہے۔ انسانی فکر و شعور کا اپنے زماں ومکاں سے گہرا ربط ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مفکرین اور سائنسدانوں کے پیش کردہ نظریات تبدیل بھی ہوتے ہیں۔

خدا کا شکر ادا کیجیے کہ اس نے آپ کو کائناتوں کے اس جال سے محفوظ رکھا اور حضرت آدم کو اس کائنات میں پھینکا جو اس کے لیے سازگار ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ ''شاعری پیغمبری است کہ نیست'' مگر مجھے لگتا ہے کہ اس قطرے (نسل آدم) کے گہر ہونے کی ساری واردات کا عینی شاہد غالب ہے جو عین اس وقت اپنا کیمرہ سنبھالے کھڑا تھا۔ غالب کے کیمرے کا یہ عکس ملاحظہ فرمائیں۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

بے شک سائنس کائنات کے متعلق ٹھوس نظریات وضع کرسکتی ہے لیکن ادب اور فنون لطیفہ بھی اس کے ہیولے یا بہ الفاظ دیگر اس کی تجریدی شکل تک پہنچ سکتے ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب فنکار میں اپنے عہد سے آگے دیکھنے کی صلاحیت موجود ہو۔ غالب میں بھی یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

ہاکنگ کو یقین ہے کہ اگر ذہانت سے کام لے تو نسل انسانی کا مستقبل روشن ہے۔ اس کے نزدیک خلا کی تسخیر کے بغیر نسل انسانی کا کوئی مستقبل نہیں۔ بقول ہاکنگ۔

''نسل آدم نہ صرف دیگر سیاروں کو مسخر کرے گی بلکہ وہاں اپنی نوآبادیاں بھی قائم کرے گی۔ زمین سے پرے ہم خلا میں جینا بھی سیکھ لیں گے۔ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ تو آغاز ہے کائنات کی ہزاروں سالہ پرمسرت زندگی کا... اور ایک آخری بات... ہم درحقیقت یہ نہیں جانتے کہ اگلی سائنسی ایجاد کب اور کس کے ہاتھوں ہوگی۔''8

سائنس کے ٹھوس حقائق کے حوالے سے ہاکنگ کی یہ غیر یقینی یقیناً کھلتی ہے۔ اس کے برخلاف غالب کی یہ فنکارانہ سادگی بھی ملاحظہ فرمائیں جو عین اسی موضوع کو اس کے مکمل سیاق وسباق کے ساتھ احاطہ کرتی ہے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

سائنس اور ہاکنگ کے مطابق تمنا کا دوسرا قدم یہ بھی ہے کہ۔

''اب ہم ارتقا کے ایسے دور میں داخل ہورہے ہیں جہاں ہم ڈی این اے کو تبدیل یا ترقی کرسکیں گے۔ ہم نے ڈی۔ این۔ اے کا نقشہ تیار کرلیا ہے یعنی ہم نے 'کتاب زندگی' کو پڑھ لیا ہے۔''9

کتاب زندگی کو پڑھ لینے کا دعویٰ کرنے والے سارے ماہرین طبیعات اس بات پر متفق ہیں کہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ یعنی یہ کائنات اپنے اسی خالق کے ہمراہ ارتقا کی مزید منازل طے کرے گی۔ بقول اقبال۔

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکوں

لیکن اپنی بات کائنات کی اس حالت پر غالب کے انتہائی مثبت فکر اور منفرد لہجے پر ختم کروں گا کہ۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

References

(1) علی سردار جعفری: پیغمبران سخن، 1970، ص 160
2) Hawking Stephen - Brief Answers to Big Questions - John Murray. 2018- P-27
3) Hawking Stephen - A Brief History of Time - Random House -UK.2015 - P-
4) Hawking Stephen - A Brief History of Time - Random House -UK.
5) Hawking Stephen - Brief Answers to Big Questions - John Murray. P-52
6) Hawking Stephen - Brief Answers to Big Questions - John Murray. P-
7) Hawking Stephen - The Grand Design - Bantom House, USA. 2010- P-
8) Hawking Stephen - Brief Answers to Big Questions - John Murray. P-
9) Hawking Stephen - Brief Answers to Big Questions - John Murray. P-

■

Dr. Saleem Mohiuddin
Professor & Head
Dept. of Urdu
Shri Shivaji College
Parbhani - 431401 (Maharashtra)
Mob.:9923042739

پروفیسر لطف الرحمن کا ادبی سرمایہ

مشتاق احمد وانی

محنت ولگن، ذوق وشوق، مطالعے ومشاہدے اور مشقِ سخن سے انسانی اذہان منوّر ہوتے ہیں۔ علم وادب اور زبان وبیان سے گہری واقفیت انسان سے خونِ جگر مانگتی ہے۔ اک عمر درکار ہوتی ہے زندگی کے کسی میدان میں صحیح مقام ومرتبہ حاصل کرنے کے لیے۔ شعروادب کی دنیا میں کچھ لوگ مشہور ہوجاتے ہیں اور کچھ مقبولیت حاصل کرلیتے ہیں۔ مشہور ہونا کمال نہیں ہے، مقبول ہونا کمال ہے۔ نمود ونمائش اور شہرت کے پیچھے بہت سی مصلحتیں، سود وزیاں اور راز ونیاز کے عوامل کارفرما ہوتے ہیں جب کہ مقبولیت میں شخصی اختصاص وارتکاز اور فطری جوہر کی اثر پذیری شامل ہوتی ہے۔

پروفیسر لطف الرحمن اپنے شعری وادبی اختصاص کی بنیاد پر علمی وادبی حلقوں میں کافی مقبول رہے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جدید اردو شاعری اور تنقید وتحقیق کو جن اہلِ قلم نے معیار ووقار عطا کیا ہے۔ اُن میں پروفیسر لطف الرحمن ایک امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔ موصوف ایک ایسی ہمہ جہت شخصیت تھے کہ جن کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف ان کی طالب علمی کے زمانے میں ہی ہونے لگا تھا۔ پٹنہ یونی ورسٹی سے اُن کا اردو اور فارسی میں ایم اے گولڈ میڈل کا انعام حاصل کرنا اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ وہ نہایت ذہین تھے۔ ذہانت ولیاقت ہی کی بنیاد پر ان کا تقرر پہلے ٹی این بی کالج بھاگلپور اور اس کے بعد بھاگلپور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ہوا اور وہیں سے بحیثیت صدر شعبہ سبکدوش ہوئے۔ اگرچہ اُنھوں نے سیاسی میدان میں بھی قدم رکھا کہ جہاں وہ ممبر قانون ساز اسمبلی اور پھر حکومت بہار کے کابینہ وزیر کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے لیکن گوناگوں مصروفیات کے باوجود اُنھوں نے اپنا ادبی سفر جاری رکھا، جس کے نتیجے میں اُنھوں نے اردو ادب کو پانچ شعری مجموعوں اور سات تحقیقی وتنقیدی کتابوں سے مالا مال کیا۔ اُن کے شعری مجموعوں میں ’تازگی برگ نوا‘، ’بوسۂ نم‘، ’صنم آشنا‘، ’دشت میں خیمۂ گل‘ اور ’راگ بیراگ‘ خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ جہاں تک اُن کی تحقیقی وتنقیدی کتابوں کا تعلق ہے ان میں ’جدیدیت کی جمالیات‘، ’نثر کی شعریات‘، ’نقد نگاہ‘، ’تنقیدی مکالمے‘، ’تعبیر وتقدیر‘ اور ’فنون لطیفہ اور تخلیقی تخیل‘ اپنے عنوانات اور موضوعات کے اعتبار سے علم وعرفان اور ادبی مباحث کے نئے باب کھولتی ہیں۔

ان کی تحقیقی وتنقیدی کتابوں میں بصیرت وبصارت اور متانت وسنجیدگی کے نمونے بدرجہ اتم نظر آتے ہیں۔ انھوں نے متعدد مقامات پر اپنے تنقیدی نظریات کو بھی واضح کیا ہے جن سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ تنقید کے سلسلے میں نہایت سنجیدہ تھے۔ یہاں بطور مثال ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے۔ وہ ایک جگہ رقمطراز ہیں:

”تنقید انسانی جبلت ہے۔ انسان کا کوئی عمل تنقیدی احساس وشعور سے بے نیاز و بے تعلق نہیں ہوتا...... تخلیق ادب انسانی وجود کا سب سے گراں قدر اور اعلیٰ ترین عمل ہے۔ ادب تجربۂ حیات کی آئینہ داری نہیں بلکہ اس کی تخلیق نو ہے۔ ادب روحانی بصیرتوں اور انسانی زندگی کے درمیان ایک رابطے کا نام ہے۔ شاعری ان دیکھی دنیاؤں کا پروہت ہوتا ہے۔ وہ ایک مقدس تخلیق کار ہوتا ہے جو تفنن طبع کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسا حسن کار ہوتا ہے جو اپنے سماج اور معاشرے میں مختلف سطحوں پر انسانی آرزومندیوں کی تشریح وتوضیح کرتا ہے۔ وہ سماجی صحت، تہذیبی نفاست، مساوات واخوت اور آزادیِ ضمیر کا نگہبان ہوتا ہے“

(مشمولہ ’جہان اردو‘ سہ ماہی دربھنگہ بہار، شمارہ نمبر 73، جنوری تا مارچ 2019 مقدمہ ’نقد نگاہ‘ ص 223)

محولہ اقتباس کے ایک ایک جملے سے ادب، ادیب اور تنقید کے بارے میں پروفیسر لطف الرحمن کا موقف ومدعا اور اُن کا نظریاتی ارتکاز واضح ہوجاتا ہے۔ جہاں وہ تنقید کو انسانی جبلت خیال کرتے ہیں تو وہیں وہ تنقیدی شعور وادراک کو انسانی فکر وخیال اور تفاعل کا ایک ناگزیر حصہ قرار دیتے ہیں۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ غیر ادبی کاموں میں بھی انسان تنقیدی شعور سے کام لیتا ہے۔ اسی اقتباس کے حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ انھوں نے تخلیق اور تخلیق کار کی عظمت کو ابھارا ہے اور اسے محقق وناقد پر ترجیح دی ہے۔ مزید برآں وہ ایک ادیب وشاعر کو سماج کا ایک ذمہ دار فرد قرار دیتے ہیں کہ جس کی یہ ذمے داری بنتی ہے کہ وہ اخباری رپورٹنگ سے گریز کرتے ہوئے اپنے فکر وخیال کی مختلف سطحوں سے انسانی حالات وواقعات، جذبات واحساسات اور افکار ونظریات ادبی وفنی جمالیات کے تحت اعلیٰ ادب تخلیق کرے۔ پروفیسر موصوف کی تمام تحقیقی وتنقیدی کتب میں اصول تحقیق وتنقید کی پابندی نظر آتی ہے جو بڑی بات ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ معاصر ناقدین ادب میں زیادہ تر ادب پارے یا فن پارے کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کرنے کی بجائے شخصیت پرستی پر سارا زور صرف کرتے ہیں۔ ادب پارہ یا فن پارہ کوئی صحیفہ نہیں ہوتا ہے بلکہ بشر کے ہاتھوں وہ سامنے آیا ہوتا ہے اس لیے اُس میں کہیں نہ کہیں خامی یا کمی تو ہوگی ہی۔ دراصل انسان میں اپنی تعریف سننے اور پڑھنے کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ اپنے عیوب سننے اور پڑھنے کا روادار نہیں ہوتا۔ پروفیسر لطف الرحمن کسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ انھوں نے چونکہ فارسی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا اس لیے وہ زبان وبیان کے معاملے میں بھی کافی سنجیدہ نظر آتے ہیں۔ اردو کے کلاسیکی اور جدید ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ ان کی تنقیدی نگارشات میں کئی جگہوں پر کلاسیکل شاعری کے اوصاف پر اظہار خیال نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے اُن کے پاس گہرا مطالعہ ومشاہدہ اور منطقی واستدلالی ذہن وفکر موجود تھی، جس کے سبب انھوں نے انتقادی ادب میں بھی اپنی ایک خاص انفرادیت کا نقش قائم کیا ہے۔

پروفیسر لطف الرحمن کی شاعری اور تنقید وتحقیق میں ان کے اختصاص کے سراغ ملتے ہیں۔ بلاشبہ عصری اردو تنقید وتحقیق اور جدید شاعری کے فروغ میں اُن کی حیثیت مسلّمہ ہے۔ یوں تو اُن کے کئی تحقیقی مقالے اردو کے موقر

ومعیاری رسائل وجرائد کی زینت بنے ہیں جن کو یہاں زیر بحث لانا ممکن نہیں ہے مگر پھر بھی نمونے کے طور پر اُن کا ایک طویل مقالہ سہ ماہی 'مژگاں' (کلکتہ) کے 'نئی نسل نیا ادب نمبر' کے خصوصی شمارہ میں صفحہ 688 پر شائع ہوا ہے۔ یہ تحقیقی نوعیت کا مقالہ نہایت معلوماتی اور بصیرت آمیز ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اس مقالے کے ابتدائی صفحات میں جدید نظم کے بنیاد گذاروں میں محمد حسین آزاد اور حالی کا ذکر کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک کے اُن تمام قد آور شعرا کے نام کا اندراج کیا ہے کہ جنھوں نے ہیئت، اسلوب، مزاج، رویے، طریق کار، رجحان ومیلان، فضا اور آہنگ میں اردو شاعری کو بہت عمدہ اور دل کے تاروں میں جھنجھناہٹ پیدا کرنے والی نظمیں دی ہیں۔ ان شعرا میں علامہ اقبال، جوش، چکبست، سیماب، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، جمیل مظہری، حامداللہ افسر اور اختر شیرانی کے نام شامل ہیں۔ پروفیسر موصوف نے زیر نظر مقالے میں اپنی تحقیق کے مطابق دو اہم تاریخی حقائق کا انکشاف کیا ہے۔ ایک یہ کہ اردو میں آزاد نظم نگاری کی ابتدا جس شاعر نے کی وہ تصدق حسین خالد ہیں اور دوسری بات یہ کہ نئی نظم کو جن شعرا نے زیادہ مروج ومقبول بنایا اُن میں اوّلین نام میراجی اور 'حلقۂ ارباب ذوق' سے منسلک شعرا شامل ہیں۔ بقول پروفیسر لطف الرحمٰن:

''اردو میں آزاد نظم نگاری کی طرف باضابطہ توجہ سب سے پہلے تصدق حسین خالد نے دی۔ خالد (پ 1900) نے 1925 سے آزاد نظم نگاری میں اپنے تخلیقی تجربات کا اظہار شروع کیا۔ اُنھوں نے نئی تشبیہات واستعارات کے استعمال سے اپنی نظموں میں اشاریت وایمایت کی پُر اثر کیفیت پیدا کی۔ قدیم موضوعات سخن اور اُسلوب اور اظہار کو نظر انداز کر کے نظم نگاری کی روایت کا باضابطہ سنگ بنیاد رکھا۔ بحور واوزان کے تجربے کیے۔ ایک ہی نظم میں ایک سے زیادہ بحریں استعمال کیں اور اوزان وبحور میں امتزاج کی حسین اور کامیاب کوشش کی''

(مشمولہ 'نئی نسل نیا ادب نمبر' سہ ماہی 'مژگاں' کا خصوصی شمارہ (کلکتہ) 2009-10 ص 688)

''یہ ایک بین حقیقت ہے کہ نئی نظم کو زیادہ مروج ومقبول میراجی اور 'حلقۂ ارباب ذوق' سے وابستہ شعرا نے بنایا۔ ان لوگوں نے آزاد نظم کی ہیئت کو عام کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرا آزاد نظم نگاری کے مخالف تھے۔ فیض نے آزاد نظم کو ذریعۂ اظہار بنایا تو سردار جعفری نے اس کو مطعون کیا۔ دراصل آزاد نظم کو ترقی پسند شعرا عوامی اپیل کے لیے غیر موزوں ذریعۂ اظہار سمجھتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں خود سردار جعفری اور دوسرے ترقی پسند شعرا نے اس ہیئت کو پابند نظم نگاری پر ترجیح دی۔ مخدوم محی الدین نے بھی دلکش نظمیں لکھی ہیں جن میں محبت کے پُر اثر گیت شامل ہیں'' (ایضاً ص 689)

مندرجہ بالا اقتباسات میں پروفیسر لطف الرحمٰن کا تحقیقی شعور معاصر نظمیہ شاعری کے حوالے سے کافی بالیدہ اور سلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے حقائق کی کھوج میں استدلالی انداز اپنایا ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ بغیر حوالے کے تحقیق غیر معتبر اور لفاظی قرار پاتی ہے۔ انھوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں 1960 کے بعد آزاد نظم سے تعلق رکھنے والے ان تمام نمائندہ شعرا کے نام درج کیے ہیں جنھوں نے واقعی آزاد نظم نگاری میں امتیازی حیثیت حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں بطور خاص محترمہ زاہدہ زیدی، فیض احمد فیض، اختر الایمان، خلیل الرحمٰن اعظمی، مظہر امام، شاذ تمکنت، محترمہ شفیق فاطمہ شعریٰ، بلراج کومل، زبیر رضوی، شہریار، مخمور سعیدی، ندا فاضلی اور پروفیسر قمر رئیس کی آزاد نظموں کے نمونے حوالے کے طور پر پیش کیے ہیں۔

لطف الرحمٰن کی ایک خاص ادبی جہت ان کی شاعرانہ حیثیت سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کی غزلوں میں خارجیت یا خارجی معاملات کے بجائے داخلی حالات وکیفیات اور احساسات کا بیان زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ان کی جدیدیت پرستی رہی ہے۔ جدیدیت ہی کے زیر اثر ان کی غزلوں اور نظموں میں بھی باطنی خود کلامی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اُن کی شاعری جہاں اُن کے زمانے اور زیست کا حال سناتی ہے، وہیں انھوں نے دانشورانہ انداز میں زندگی کی المناکیوں کو بھی اپنا شعری جامہ پہنایا ہے۔ شفیع جاوید اُن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اُن کے اشعار داخلی حقیقتوں کے وہ نامے جو خامۂ خونچکاں سے اور فگار اُنگلیوں سے لکھے گئے ہیں۔ اُن کے یہاں حزن آگیں کیفیتیں اور آگہی کی ایسی روشن منزلیں آتی ہیں جو یہ تاثر دیتی ہیں کہ بات اتنی ہی نہیں، اس کے پرے بھی کچھ اور ہے کیونکہ تجربات اور واردات کا بحر بے کنار تو اس طرح ہے کہ اسے طے کر لینا آسان نہیں''

('دشت میں خیمۂ گل' مشمولہ 'جہان اردو' سہ ماہی دربھنگہ بہار، شمارہ نمبر 73، جنوری تا مارچ 2019 ص 222)

پروفیسر لطف الرحمٰن نے آزاد اور معریٰ نظمیں بھی کہی ہیں مگر اُن کا اصلی جوہر غزل میں کھلا ہے۔ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اگر چہ ان کی غزلوں میں تخلیقی وفور بہت قلیل نظر آتا ہے مگر اس کے باوجود ایک خاص قسم کا التزام ہر جگہ ملتا ہے اور کہیں کہیں ایسے اشعار بھی نظر آتے ہیں جن میں درد وکسک کا سوز وساز موجود ہے یا جن میں داخلیت کے بجائے خارجیت کا اختصار واعجاز موجود ہے۔ آیئے اُن کے مختلف شعری مجموعوں سے ماخوذ چند اشعار نمونے کے طور پر ملاحظہ کریں۔

رفتہ رفتہ اُڑ گئے روشن کتابوں کے حروف
میں بھی ہوں لمحہ بہ لمحہ داستاں ہوتا ہوا

اتنا چپ چاپ تعلق پہ زوال آیا تھا
دل ہی رویا تھا، نہ چہرے پہ ملال آیا تھا

بدن میں لو کی لپک آج انتہا پر ہے
وہ کوئی سانپ سہی آج مجھ کو ڈس جائے

صلیبوں کی رفعت مقدر میں تھی
سو ہم ہر جگہ سر اُٹھا کر چلے

عجب ربط ہے تجھ سے مری تمنا کا
میں دشت وقت کا پیکر چمن چمن تیرا

یہی ٹوٹی ہوئی نیندیں، یہی مسمار اُمیدیں
یہی سب کا مقدر ہے صدی ہے یہ عذابوں کی

بھا گئی دل کو مرے مکار لفظوں کی ادا
ذائقہ دل کے لہو کا رُو بہ شرح جاں بھی ہے

فریاد کو بھی ہم نے سلیقہ بنا دیا
آنکھوں کو جھیل جھیل کو دریا بنا دیا

میں تھا نیزے کی بلندی پہ مگر میرا عدو
میرا سر کاٹ کے بھی میرے برابر کب تھا

مندرجہ بالا اشعار کے الفاظ ومعانی پر غور وتدبر کریں تو معلوم ہوگا کہ شاعر نے احساس محرومی اور اپنے عہد کے پُر آشوب حالات وواقعات کو جس شعری پیکر میں ڈھالا ہے اس میں جدید حسیت بھی ہے اور تغزل کا عرفان بھی۔ تشبیہات واستعارات، علامتیں، اشارے اور کنایے دنیائے شعر وادب کا زیور ہوتے ہیں۔ لطف الرحمٰن کی شاعری میں بحور واوزان کا آہنگ تو ہے ہی شعری صنعتوں کے برمحل استعمال سے جذبہ واحساس اور فکر وتخیل میں کافی وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ بہر کیف پروفیسر لطف الرحمٰن کا ادبی سرمایہ اردو شعر وادب میں گراں قدر سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اُن کی نثر ونظم میں جابجا اُن کے تخلیقی جوہر نظر آتے ہیں کہ جن کا اعتراف اُن کے تمام ہم عصروں نے کسی نہ کسی صورت میں کیا ہے۔

■

Dr. Mushtaq Ahmad Wani
Asst. Prof. Dept of Urdu
Baba Ghulam Shah University
Rajori 185234 (J&K)

پروین شجاعت

حقوقِ نسواں کی ایک بلند آواز

پروفیسر شمیم نکہت

ادب کیا ہے؟ ہماری زندگی کا ترجمان ہے۔ انسانی جذبات واحساسات اور بلند خیالات کے فنی اظہار کا نام ہے۔ یہ فنی اظہار کسی ذاتِ واحد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ایک قوم، ایک زبان اور اس کی مکمل تہذیب اور مزاج کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا مقصد زندگی کے مختلف مسائل، مشکلات، دکھ، سکھ غرض ہر پہلو، ہر رنگ کی ترجمانی کرنا اور معاشرے میں تبدیلی لانا ہوتا ہے۔ معاشرے میں تبدیلی لانا اس لیے ضروری ہے کہ ادب اپنے معاشرے کا ہی ترجمان ہوتا ہے۔ سماج ومعاشرے سے ہٹ کر نہ تو ادیب کی کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی اس کی تخلیق کردہ تحریر کی۔

کسی بھی تخلیق کار کے لیے حساس دل ہونا بہت ضروری ہے۔ ایسا دل جو اپنے اطراف میں پھیلی ہوئی ہر چیز سے متاثر ہو۔ ہر غلط بات، ہر ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرے۔ سوسائٹی میں پھیلی ہوئی خودغرضی کے خلاف اپنا قلم اُٹھائے۔ انسانی بے حسی کے خلاف آواز بلند کرے۔ انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو کم کرنے والے ہر عمل کے خلاف احتجاج کرے۔ بقول علامہ اقبال۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں؟
فکرِ فردا نہ کروں محوِ غمِ دوش رہوں؟
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں؟
ہم نوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟

ادب جو زندگی کا پابند ہے، زندگی سے گریز کر ہی نہیں سکتا ہے، احتجاج سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہے۔ ہر ادیب کے اندر احتجاج کی خو موجود ہوتی ہے۔ جب بھی وہ معاشرے کے تضادات اور انسان کی محکومی اور بے توقیری پر نظر ڈالتا ہے تو اس کا ردِ عمل اس کی تحریروں میں کم یا زیادہ ظاہر ضرور ہوتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں جبر، قوت اور دہشت کے ذریعے انسانی آزادی کو دبایا گیا تو اس کے نتیجے میں احتجاجی ادب تخلیق ہوا ہے۔ احتجاجی ادب کا بنیادی مقصد لوگوں کو ان کی ذات کی اہمیت کا احساس دلانا ہے۔ ان کے اندر اتنی ہمت اور جرأت پیدا کرنا ہے کہ وہ اپنے خلاف ہونے والے ہر ظلم وناانصافی کو خاموشی سے برداشت کرنے کے بجائے ان کا نڈر ہو کر مقابلہ کر سکے۔ اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کر سکے۔ یہ جذبہ، یہ ہمت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان لوگوں میں یہ شعور بیدار نہ ہو جائے کہ جو کچھ بھی ان کے ساتھ ہو رہا ہے وہ غلط ہے، ناانصافی ہے۔ لوگوں میں یہ احساس جگانا ایک بالغ نظر اور حساس دل ادیب ہی کر سکتا ہے اور اس کو کرنا بھی چاہیے کیونکہ جب تک لوگوں کو یہ احساس نہیں ہوگا کہ وہ بھی سماج اور معاشرے کا ایک اہم حصہ ہیں۔ معاشرہ ان کے دم سے قائم ہے اور اس کی ترقی میں ان کا بھی ایک اہم کردار ہے تب تک وہ اپنے خلاف ہونے والی ناانصافیوں کا مقابلہ کرنے لائق نہیں ہو پائیں گے۔

سماج کی تشکیل انسانوں کے اجتماعی عمل سے ہوئی ہے اور اس اجتماعی عمل میں عورت اور مرد برابر کے شریک رہے ہیں۔ تمدنی اور تہذیبی ارتقا کے مختلف ادوار میں ان کے باہمی عمل کا تناسب بدلتا رہا ہے لیکن تخلیقی عمل کی اصل حقیقت دونوں کے تعاون ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ تہذیب کے ابتدائی دور سے اس وقت تک کسی نہ کسی انداز میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا رہا ہے کہ عورت اور مرد سماج کی گاڑی کے دو پہیے ہیں اور دونوں کے بغیر ارتقا کا عمل پورا نہیں ہو سکتا۔ لیکن تاریخ وتہذیب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سماج میں اکثر وبیشتر عورت کی حیثیت مظلوم کی رہی جو ہر جگہ اپنے حقوق اور انصاف کا مطالبہ کرتی نظر آتی ہے۔

عورت کی سماجی نابرابری کے خلاف ہمارے ادیبوں نے احتجاج کی صدا بلند کی ہے جن میں مرد وخواتین دونوں ہی شامل ہیں۔ انیسویں صدی کے آخر تک مسلمان عورتیں قومی وتعلیمی میدان میں زوروشور سے داخل ہوئیں۔ تعلیم کے ساتھ سیاسی وقومی سوجھ بوجھ عورتوں میں اس وقت شائع ہونے والے کچھ اہم رسالوں کے مطالعے سے آئی جن میں مضامین لکھنے والی عورتیں مغربی تعلیم اور

سماجی بیداری سے آراستہ تھیں۔ ان لکھنے والی خواتین میں عطیہ فیضی، نذر سجاد، زاہدہ بیگم، زہرہ، نجمتہ بانو، بیگم بھوپال نواب سلطان نے ہر طرح کے مضامین لکھے۔ ان مضامین میں عورتوں کے حقوق اور ان کی تعلیم پر زور دیا جاتا تھا۔ توہم پرستی اور فضول خرچی کے خلاف باقاعدہ تحریک کے طور پر مضامین لکھے گئے۔

اردو میں بہت سی افسانہ نگار اور شاعر خواتین نے اپنی جرأت مندانہ اور روشن خیال تحریروں سے خواتین میں آزادیِ فکر اور آزادیِ نظر پیدا کی ہے۔

ان نڈر اور بے باک خواتین میں سب سے پہلا نام میں لینا چاہوں گی ڈاکٹر رشید جہاں کا جنھوں نے 'انگارے' جیسی تہلکہ خیز کتاب میں شامل ہو کر عورتوں کو ایک نئی راہ اور دعوتِ فکر دی۔ عصمت چغتائی کی تحریروں نے عام رویے میں تبدیلی پیدا کی۔ قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، صالحہ عابد حسین، رضیہ سجاد ظہیر، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، زاہدہ حنا، ممتاز شیریں اور شاعرات میں ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، بانو داراب وفا، زاہدہ زیدی اور زہرہ نگاہ وغیرہ ادیباؤں نے خواتین میں آزادیِ فکر کا جذبہ بیدار کیا۔

انھیں خواتین ادیباؤں میں ایک نام پروفیسر شمیم نکہت کا بھی ہے جنھوں نے اپنے افسانوں، خاکوں اور مضامین کے ذریعے خواتین کو گھر اور سماج میں ان کی اہمیت کا احساس دلایا۔ ان کو اپنے وجود کی پہچان کرائی اور خواتین کے تئیں ہونے والے ہر ظلم و ناانصافی کے خلاف اپنے قلم کے ذریعے احتجاج کیا۔ ان کے بیشتر افسانوں اور مضامین میں ان کا یہ نظریہ نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ انھوں نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے:

''میری کہانیاں میرے اطراف بکھری ہوئی سچائیاں ہیں جو کبھی پسِ دیوار جھانکتی ملیں، کبھی گاؤں کے کھیتوں میں اُگی دکھائی دیں اور کبھی شہروں کی گہما گہمی کے گرد منڈلاتی ہوئی ذہن پر چھا گئیں اور کبھی تو اپنے گھر میں سانس لیتی محسوس ہوئیں اور جی اٹھیں۔ دل کی چوٹ جب جب ٹپک کر آنسو بنی۔ تو کہانی کے روپ میں ٹپک پڑی۔''[1]

پروفیسر شمیم نکہت نے نہ صرف اپنے قلم کے ذریعے بلکہ اپنی عملی زندگی میں بھی عام فرسودہ روایات کے خلاف احتجاج کیا۔ عرشیہ جبیں کو دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے بتایا تھا کہ اپنے خاندان میں پردے کی روایت کو انھوں نے ہی توڑا اور اپنی پانچوں بہنوں کی تعلیم و تربیت بالکل اپنی پسند کے مطابق دلوائی۔ نتیجتاً ان کی سب بہنیں اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال اور لکھنے پڑھنے والی ہیں اور سب ہی کامیاب زندگی گزار رہی ہیں۔ تانیثی نقطۂ نظر ان کی شخصیت کا ایک خاص پہلو ہے۔ خواتین کے حوالے سے ان کے سامنے کوئی کمزور یا ہلکی بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ خصوصاً لڑکیوں کو وہ ہمیشہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے، مردوں کی برابری کرنے اور احساس کمتری کا شکار نہ ہونے کی تلقین کرتی رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں کے زیادہ تر موضوع عورتوں کی تعلیم اور ان کی سماجی بیداری کا احاطہ کرتے ہیں۔ خود ان کا تحقیقی مقالہ 'پریم چند کے ناولوں میں نسوانی کردار' ان کے اس نقطۂ نظر کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ اس مقالے میں وہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''پریم چند کے ناولوں میں عورتوں کے بہت سے کردار ملتے ہیں جو مختلف طبقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ کوئی رانی ہے، کوئی طوائف، کوئی سیدھی سادی گھریلو عورت ہے تو کوئی سیاسی و سماجی شعور رکھنے والی قومی کارکن، کوئی بیدار ذہن رکھنے والی فاقہ کش مقروض دیہاتی عورت تو کوئی کلب کی رونق اور شمعِ محفل۔ ان میں آپس میں طبقاتی اختلاف ہے، حالات کا اختلاف ہے، مسائل، جگہ اور ماحول کا اختلاف ہے لیکن ایک چیز ان سب میں مشترک ہے اور وہ ہے ان کا 'دل' مادرانہ محبت سے لبریز دل۔ ان کے کسی کردار کو لیجیے اس میں وہی ہمدردی اور وہی عفو کی قوت ملتی ہے جو ایک ہندوستانی ماں کی خصوصیت ہے۔''[2]

پروفیسر شمیم نکہت کے فکری نقطۂ نظر کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر شمیم نکہت کی اصل قلم رو گھر آنگن کی مانوس فضا، اس کی خوشیاں، محرومیاں اور مسائل ہیں۔ اس قلم رو میں حیاتِ انسانی کے مطالعے کے لیے کتنی وسعتیں اور جہتیں ہیں؟ انسانی رشتوں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی کیسی

شمیم نکہت نے افسانوں، خاکوں اور دوسری تحریروں کے ذریعے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی اس سماجی حقیقت کی تصویر کشی کی ہے جس میں عورت کسی نہ کسی شکل میں سماج کے اہم رکن کی حیثیت سے سامنے آتی ہے، خود ایک حساس دل خاتون ہونے کی بدولت وہ ایک عورت کی نفسیات، اس کے غم اور خوشی کو بخوبی محسوس کرتی ہیں۔

الم ناک داستانیں چھپی ہیں؟ اس کا اندازہ کرنا ہو تو شمیم نکہت کی کہانیوں کو ذرا غور سے پڑھیے۔ دکھوں اور محرومیوں کی آگ میں جلتے ہوئے انسانوں کے کرب کو انھوں نے اپنی روح میں شدت سے محسوس کیا ہے لیکن اپنے عہد سے ان کا رشتہ دردمندانہ ہی نہیں حریفانہ بھی ہے۔ اپنی ہر کہانی میں وہ سماج کی ناانصافیوں اور ناہمواریوں کے خلاف احتجاج کرتی ہیں۔ اس کے لیے وہ قاری کو شروع سے اعتماد میں لے لیتی ہیں۔ شمیم کی کہانیوں میں نئے احساس و شعور کے ساتھ ساتھ ان انسانی قدروں کا عرفان بھی ہے جو انھیں عزیز ہیں اور جو ان کے تخلیقی ہنر کا ایک متحرک حصہ بن گئی ہیں۔''[3]

پروفیسر شمیم چوں کہ ترقی پسند نظریات کی حامی تھیں اس لیے ان کی کہانیوں اور مضامین میں اس کا اثر واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اپنے افسانوں میں انھوں نے انسانی نفسیات کا نہایت خوبصورت مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں بحث نہیں ہوتی بلکہ زندگی کی حقیقتوں کی تہہ داری ملتی ہے۔ اپنے بیشتر مضامین میں انھوں نے خواتین کے مسائل کی عکاسی کی ہے، وہ سماج و معاشرے میں ان کو برابری کا درجہ دینے کی قائل رہی ہیں۔ اپنے مضمون 'ادب اور خواتین' میں وہ لکھتی ہیں:

''ادب اور خواتین پر جب گفتگو ہوتی ہے تو میرے ذہن میں بار بار یہ بات آتی ہے کہ ادب میں عورتوں کے Contribution کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے۔ حالانکہ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ادب کی تخلیق میں خواہ وہ شاعری ہو یا افسانہ نگاری عورت کو اوّلیت حاصل ہے۔ اور شاید یہ اوّلیت ازل سے اس کے اس کے حصے میں آئی ہے۔ یعنی دنیا کی پہلی شاعرہ لازماً عورت ہوئی ہوگی، اس لیے کہ رات میں بچے کو بے چین دیکھ کر اس کے ہونٹوں سے بے اختیار لوری کے نغمے پھوٹ پڑے ہوں گے۔ اسی طرح ننھے منے بچوں کو سلاتے وقت ماں نے چھوٹی موٹی کہانیاں بھی سنائی ہوں گی، یہ الگ بات ہے کہ یہ لوریاں یا کہانیاں تحریر میں نہ آئی ہوں لیکن ان کی تخلیق میں اوّلیت کا سہرا عورت ہی کے سر ہے۔''[4]

شمیم نکہت نے افسانوں، خاکوں اور دوسری تحریروں کے ذریعے اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی اس سماجی حقیقت کی تصویر کشی کی ہے جس میں عورت کسی نہ کسی شکل میں سماج کے اہم رکن کی حیثیت سے سامنے آتی ہے، خود ایک حساس دل خاتون ہونے کی بدولت وہ ایک عورت کی نفسیات، اس کے غم اور خوشی کو بخوبی محسوس کرتی ہیں۔ خواتین کے مسائل کو شدت سے محسوس کرنے کے بعد وہ

ان پر تبصرہ بغیر کسی ڈر کے کرتی ہیں، عورت کے ساتھ سماجی نابرابری کے سلوک کی بات ہو یا اس کے حقوق کی، تعلیم کی بات ہو یا کسی جائز خواہش کی تکمیل کی جب، جہاں اور جس وقت انھوں نے یہ بات محسوس کی کہ عورتوں کے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے۔ ان کے قلم نے صدائے احتجاج بلند کی۔ اپنے مضمون 'تحریک آزادیِ نسواں' میں لکھتی ہیں:

''آج عورت کی صف سے بڑی دلیرانہ آوازیں آ رہی ہیں، جن میں ان کی انفرادیت بھی ہے اور ان کا جلال بھی ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ آج بھی صورتِ حال میں صرف یہ تبدیلی آئی ہے کہ نام بدل گیا۔ آج بھی عورت اپنی اولاد سے محروم کردی جاتی ہے۔ آج بھی عورت شوہر کی مرضی کے بغیر ماں نہیں بن سکتی، اس کا اپنے ہونے والے بچے پر کوئی قبضہ نہیں ہوتا۔ آج بھی جہیز کی آگ میں کتنی ہی لڑکیاں جل کر مر جاتی ہیں یا اس خوش آئند گھڑی کے انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ قحبہ خانے آج بھی موجود ہیں۔ بلکہ آج تو یہ زہر سوسائٹی میں ایسا پھیلا ہے کہ اُسے کہیں الگ ہی نہیں کر سکتے۔ آج جب کہ عورت کو اقتصادی مجبوری بھی نہیں ہے طلاق کے بعد بچہ باپ کو مل جاتا ہے اور اس کی تمام محنت و ممتا کا خون کیا جاتا ہے۔''[5]

شمیم نکہت کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ہر ظلم و ناانصافی کے خلاف انھوں نے صرف آواز ہی نہیں اُٹھائی بلکہ وہ اُن خواتین پر بے حد ناراض بھی ہوتی تھیں جو مرد کے ہر ظلم و ہر ناانصافی کو خاموشی سے برداشت کرتی ہیں، جنھوں نے اپنے شوہر کو مجازی خدا کا درجہ دے رکھا ہے اور اس مجازی خدا اور اُس کے خاندان کی خدمت کرنے میں ہی ان کی دنیاوی نجات ہے جن کا صلہ انھیں دوسری دنیا میں ملنے والا ہے۔ ان کا خاکہ 'ثروت آپا' ایک مثالی ہندوستانی عورت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ایسی عورت جو شوہر پر اپنا سب کچھ قربان کردینے کو ہی اپنی زندگی کی معراج سمجھتی ہیں۔ مثال کے لیے ایک اقتباس پیش کرتی ہوں:

''یہ باتیں میری سمجھ سے بالکل باہر تھیں۔ کیونکہ میرے خیال میں شوہر دیوتا نہ ہو کر صرف جیون ساتھی تھا اور میں آنکھ بند کر کے شوہر کو سجدہ کرنے والی جنتی عورت کو فرشتہ تو جان سکتی تھی مگر عورت ہرگز نہیں۔ محبت ہو یا خدمت کوئی بھی چیز ہمیں مسلسل یک طرفہ کبھی برداشت نہیں کرسکتی۔''

''میں ثروت آپا سے صرف اس لیے ناراض تھی کہ انھوں نے خود ہی عورت کو ایک لونڈی کا درجہ دے رکھا تھا۔ ان کے لیے عورت صرف ایثار و قربانی کے لیے ہی بنی تھی اور اس کا بدل بھی وہ نہیں چاہتی تھیں، وہ تو سب کچھ دوسری دنیا میں ہی مل جائے گا، ان کے اور میرے خیالات کا تضاد ہم دونوں کو دور کرتا گیا، مگر اس دوری میں بھی دلوں کی محبت کم نہ ہو سکی۔ میں ثروت آپا کو ہمیشہ قابلِ رحم ہستی سمجھتی رہی اور وہ مجھے بے وقوف محبت کرنے والی بہن سمجھتی رہیں۔''[6]

یہی وجہ تھی کہ شمیم نکہت کو پریم چند کے ناول گئودان کی 'دھنیا' کا کردار مثالی اور اہم نظر آتا ہے۔ دھنیا جو غریب کسان ہوری کی بیوی ہے، غریب ہے مگر کسی بے انصافی کے سامنے جھکنا نہیں جانتی، کسی زیادتی کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوتی، کبھی اپنے عورت ہونے کا رونا نہیں روتی ہے۔ اس کو اپنے اوپر پورا اعتماد ہے اور جو بات ٹھیک سمجھتی ہے بول پڑتی ہے، مرد کے عورت پر ہاتھ اُٹھانے کو اس کی ذلیل ترین حرکت سمجھتی ہے، زندگی میں مسلسل جدوجہد کرتی رہتی ہے اور کبھی ہار نہیں مانتی ہے، اس طرح کی عورتیں جو سماج و معاشرے کی ہر بُرائی، ہر غلطی و ناانصافی کے لیے احتجاج کریں وہ پروفیسر شمیم نکہت کی پسندیدہ عورتیں ہیں۔ عورت کو خاموشی سے دُکھ و مصیبتیں برداشت کرتے دیکھ کر ان کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہر عورت کے اندر یہ احساس بیدار ہو جائے کہ وہ بھی سماج کی گاڑی کا ایک پہیہ ہیں۔ سماج و معاشرے کی تکمیل کا ایک اہم ستون ہیں، ان کے بغیر نہ تو سماج قائم رہ سکتا ہے اور نہ ہی ان کا اپنا گھر، بھیڑ بکریوں کی طرح ان کی حیثیت نہیں ہے کہ سر جھکائے جس جانب ہانک دیا جائے اُسی طرف چلنا شروع کردیں، ان کی اپنی ذاتی سوچ، ذاتی فکر اور ذاتی پسند بھی اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی کی مرد کی۔ وہ مرد کی غلام نہیں ہیں، ان کی زندگی، ان کی شخصیت کی تکمیل کا ایک اہم حصّہ ہیں۔ وہ بے جان مشین نہیں ہیں کہ ہر حکم کی تعمیل خاموشی سے کرتی رہیں اور جس دن عورت کو اپنی انفرادیت اور اہمیت کا احساس ہو جائے گا اس دن خود بہ خود وہ ہر ظلم و ناانصافی کے خلاف اُٹھ کھڑی ہوگی۔ ان کی کہانیوں 'رشتے اور فاصلے'، 'ہُما'، 'فیصلہ'، 'وہ لمحہ'، 'اُستانی جی' وغیرہ میں ایسی عورت کی تصویر اُبھر کر سامنے آتی ہے جو آہستہ آہستہ اپنے پیر خود زمین پر ٹکا رہی ہے۔ خواتین کے مسائل سے متعلق انھوں نے کئی مضامین بھی لکھے ہیں جیسے 'ادب اور خواتین'، 'تحریک آزادیِ نسواں'، 'اردو شاعری اور خواتین'، 'پریم چند اور تحریک نسواں'، 'پریم چند کا عورت کا تصور'، 'اردو ناول کا ایک اہم کردار'، 'دھنیا'، 'رانو' بیدی کا ایک اہم کردار' وغیرہ۔

پروفیسر شمیم نکہت کے مضامین ہوں یا افسانے یا خاکے، سب کا موضوع تقریباً ایک ہی ہوتا ہے یعنی سماج و معاشرے کی حقیقتوں کی عکاسی خصوصاً خواتین کے مسائل۔

انھوں نے ہندوستانی سماج کی ہر قسم کی عورتوں مثلاً طوائف، بیوائیں، عام عورتیں، بیوی، بیٹی، بہو اور کام کرنے والی عورتوں کے فرائض اور سماج میں ان کے مقام، مرتبے اور حقوق کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی تحریروں میں بہت زیادہ پیچیدگی اور ذہنی کشمکش کا احساس نہیں ہوتا اور ان کو پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ فن کار کی نظر زندگی کے ہر شعبے پر بہت گہری ہے۔ ان کی کہانیوں کے کرداروں میں زندگی اور حرکت، عمل وجدوجہد اور آزادانہ طور پر زندگی بسر کرنے کی تمنا ہوتی ہے۔ ان کے افسانوں میں بڑا تنوع ہے۔ مشاہدے اور تجربے میں باہمی ربط ہے اور اپنی فنی بصیرت سے وہ انھیں یوں ملا دیتی ہیں کہ سارے رنگ الگ الگ رہتے ہوئے بھی ملے جلے لگتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں ندرت کسی نہ کسی صورت میں موجود رہتی ہے۔ انسانی حقوق خصوصاً خواتین سے متعلق، ان کے استحصال سے متعلق آواز بلند کرنے والوں کی فہرست جب جب تیار کی جائے گی تو اس میں ایک اہم نام پروفیسر شمیم نکہت کا بھی ضرور شامل ہوگا۔

حواشی

(1) افسانوی مجموعہ 'دو آدھے' ص 9، 1989
(2) پریم چند کے ناولوں میں نسوائی کردار، ص 286
(3) تأثر و تنقید، ص 32
(4) تأثرات، ص 103
(5) تأثرات، ص 103
(6) شمیم نکہت کی ادبی خدمات مصنفہ: اصفیہ شمیم ص 151

■

Dr. Parveen Shujaat
Mumtaz P G College
Dolly Ganj
Lucknow - 226001 (UP)

سفرنامے کی تاریخی اور سماجی اہمیت

ارشد جمیل

'سفر'' عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مسافت طے کرنا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا، کوچ کرنا، سیاحت کے لیے نکلنا کے ہیں۔ اردو زبان میں یہ لفظ عربی سے مستعار ہے اور انھیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اردو کی طرح فارسی میں بھی یہ لفظ عربی سے مستعار ہے جس کے معنی مسافرت، سیاحت اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کے ہیں۔ 'نامہ' فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی لکھے ہوئے خط، فرمان یا عمومی طور پر تحریر شدہ عبارت کے ہیں، اس لیے اردو کے علما نے 'سفر' عربی سے اور 'نامہ' فارسی سے لے کر سفرنامہ کی اصطلاح وضع کی۔ اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سفرنامے کے معنی ومفہوم پر بھی اظہار خیال کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلے اردو، عربی اور انگریزی زبانوں کی مستند لغات کے ذریعہ سفرنامہ کے معنی ومفہوم جاننے کی کوشش کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ادبا اور ناقدین کی آرا کا ذکر کرتے ہوئے 'سفرنامہ' کی ایک جامع اور موزوں تعریف پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔

سفرنامہ کو ہندی میں 'یاترا ویرتانت' اور انگریزی میں "Travelogue" کہا جاتا ہے جب کہ عربی میں "Travelogue" کو 'محاضرہ مصورۃ عن الرحلۃ' کہا جاتا ہے جس کا مطلب مصور سفرنامہ ہے یعنی ایسے سفرنامے پر مشتمل ڈائری جس میں حالات وواقعات کے ساتھ تصویریں بھی ہوں۔

نوراللغات میں مولوی نورالحسن نیر نے لفظ 'سفرنامہ' کے معنی 'سفر کے حالات اور سرگزشت' لکھے ہیں۔

(مولوی نورالحسن نیر: نوراللغات لکھنؤ نیر پریس، 1347ھ، ص 123)

فرہنگ آصفیہ میں سفرنامہ کے متعلق لکھا ہے:

''سفرنامہ (ع+ف) اسم مذکر، سیاحت نامہ، سفر کی کیفیت، روزنامچہ سفر، حالات وسرگزشت سفر''۔

مولوی سید احمد دہلوی: فرہنگ آصفیہ لاہور، اردو سائنس بورڈ، 1987، ج 2، ص 431)

فیروزاللغات میں سفرنامہ کے سلسلے میں تحریر ہے:

''سفرنامہ (مذکر) سفر کے حالات پر کتاب، 'سیاحت نامہ' درج ہے۔''

(مولوی فیروزالدین: فیروزاللغات جدید ایڈیشن، اسلامک پبلشر، ص 426)

عربی کی مشہور لغت 'المنجد' میں 'الرحلۃ' کے جو معنی ملتے ہیں وہ یہ ہیں:

"قصة المسافر عما جرى له فى سفره" (مسافر کو دوران سفر پیش آنے والے واقعات وحوادث کا بیان)۔

(لوئیس معلوف: المنجد بیروت، المطبعۃ الکاثولیکیۃ، ت۔ن۔ مادہ رحل)

انگریزی لغات میں سفرنامہ کے لیے 'Travel' اور 'Travelogue' کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے اپنی تدوین کردہ انگریزی اردو لغت The Standard English Urdu Dictionary میں سفر کے جو معنی تحریر کیے ہیں وہ ہیں:

''باتصویر لکچر، سیاحت کی مہم وغیرہ پر تقریر سے متعلق سیاحت، داستان سفر''۔

(ڈاکٹر عبدالحق: The Standord English Urdu Dictionary نئی دہلی، انجمن ترقی اردو، 2001، ص 201)

سفرنامہ کے معنی ومفہوم کے سلسلے میں مذکورہ لغات کے مطالعہ سے اس کی جو لغوی تعریف سامنے آتی ہے اسے مختصر طور پر کچھ اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے کہ سفرنامہ کسی مسافر یا سیاح کے سفر کے مشاہدات وواقعات اور تجربات کے اس بیان کو کہتے ہیں جو بالخصوص کتابی شکل میں ہو، اردو میں سفرنامہ روداد سفر یا سفری تجربات، مشاہدات کو رقم کرنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ سفرنامہ کے لغوی معنی ومفہوم پر بحث کرنے کے بعد یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس بات پر بھی غور کیا جائے کہ ادبی اصطلاح میں 'سفرنامے' سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے اردو ادب کے حوالے سے جن محققوں نے سفرنامے پر تحقیقی کام کیا ہے اور انھوں نے سفرنامے کی جو تعریف متعین کی ہے اس کو پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قدسیہ قریشی نے اپنی کتاب 'اردو سفرنامے انیسویں صدی میں' میں سفرنامہ کی تعریف یوں بیان کی ہے:

''سفرنامہ وہ طرز تحریر اور اسلوب بیان ہے جس میں انسان یا سیاح اپنے داخلی احساسات، خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر اپنی ذہنی، دلی اور طبعی کیفیت ظاہر کرتا ہے''۔

(ڈاکٹر قدسیہ قریشی: اردو سفرنامے انیسویں صدی میں، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 1987، ص 52)

ڈاکٹر انور سدید نے سفرنامے سے متعلق اپنی کتاب 'اردو ادب میں سفرنامہ' میں سفرنامہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''فنی طور پر سفرنامہ وہ بیانیہ ہے جو سفرنامہ نگار سفر کے دوران یا اختتام سفر پر اپنے مشاہدات، کیفیات اور اکثر قلبی واردات سے مرتب کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر انور سدید: اردو ادب میں سفرنامہ، لاہور، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، ص 52)

انسانی زندگی میں سفر کی اہمیت ہر زمانے میں رہی ہے۔ سفر متعدد مقاصد کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی تجارتی اور معاشی ضرورت کے لیے سفر اختیار کیا جاتا ہے تو کبھی اسے حصول علم اور ترویج علم کے لیے وسیلہ بنایا جاتا ہے۔ یہ نئے علاقوں اور خطوں کی دریافت کا بھی ذریعہ ہے۔

سفر انسان کو مذہبی عبادات اور عقیدت کے اظہار کا موقع فراہم کرتا ہے اور اس کی روحانیت کو جلا بخشتا ہے۔ یہ دعوت دین اور تبلیغ مذہب کا وسیلہ بھی ہے اس سے انسان دوستی اور اخوت کے پیغام کو مستحکم کرنے میں مدد ملتی ہے۔ آج کے دور میں ذرائع ابلاغ کے ذریعہ مقامی، ملکی اور عالمی صورت حال سے آگاہ کرنے اور باہمی روابط قائم کرنے کے لیے سفر کو بھی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ سفر کی اس اہمیت کے پیش نظر بہت سے لوگوں نے اپنے سفر کی روداد کو محفوظ کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے چنانچہ جب انسان سفر کرتا ہے تو اسے دوسرے ملکوں کے رسم ورواج، طرز معاشرت، تعلیم وتربیت، تہذیب وتمدن، سیاسی اور انتظامی امور سے واقفیت ہوتی ہے۔ سفر کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ نامور ادیب اور سیاسی رہنما امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

''میں نے آدھا علم سفر سے حاصل کیا ہے۔ مطالعہ

کی تنہائیوں نے مجھے ذہنی بالیدگی بخشی لیکن سفر کے مشاہدوں نے میری نگاہ کو وسعت دی۔ جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ بسم اللہ کے گنبد میں رہتے ہیں۔ سفر انسان کو قوموں کی سرگزشت اور ملکوں کی تاریخ کا بالواسطہ علم بخشتا ہے جس طرح سائنس کے معملوں میں حقائق اشیا کا ادراک ہوتا ہے اسی طرح سفر سے صفات انسانی کی حقیقتوں کا علم ہوتا ہے اور مختلف اقوام کے مزاج وطبائع کا پتہ چلتا ہے۔''

(آجکل: اردو سفرنامہ، مرتبہ محبوب الرحمان، ابرار رحمانی، پیش لفظ، ص 2)

سفر نامہ ایک بیانیہ صنف ہے، سفر نامہ نگار دوران سفر جن چیزوں کو دیکھتا ہے اور مشاہدات کے زیر اثر اس کے اندر جو احساسات وتاثرات پیدا ہوتے ہیں، انھیں وہ صفحۂ قرطاس پر پیش کرتا ہے۔ اسی سے سفر نامہ وجود میں آتا ہے۔ اگر سفر نامہ کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ سفر نامہ وہ بیانیہ صنف ادب ہے جس میں سفر نامہ نگار دوران سفر یا سفر سے واپسی پر اپنے مشاہدات، واقعات، تجربات اور قلبی تاثرات کو احاطہ تحریر میں لاتا ہے۔ ادبی سفر نامہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے علم نہیں فن ہے اور فن کا مقصد حصول مسرت ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تحریر ادب نہیں ہو سکتی۔ ادب وہی ہوگا جس میں زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی سچی ترجمانی حسین انداز میں کی گئی ہو، سفر نامے کو اس پس منظر میں اگر دیکھا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ سفر نامہ نگار اپنی تحریر کے ذریعہ نہ صرف معلومات بہم پہونچاتا ہے بلکہ وہ اپنے تخلیقی تجربہ میں اپنے احساسات اور جذبات کے ذریعہ دوسروں کو بھی شریک کر لیتا ہے، یوں سفر نامہ معلوماتی تحریر سے ادبی صنف کے دائرے میں آجاتا ہے گویا سفر نامہ کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے کہ سفر نامہ نثری ادب کی صنف ہے جس میں سفر کے متعلق کسی ادیب یا فنکار کے تجربات اور مشاہدات کا تفصیلی ذکر ہوتا ہے جس کی نوعیت عام بیان کے بجائے ادبی ہوتی ہے۔

سفرناموں کی تاریخی وسماجی اہمیت سے انکار ممکن نہیں کیونکہ سفرناموں سے ایسے بہت سے واقعات اور حادثات کا پتہ چلتا ہے جو ہمیں عام تاریخی کتابوں میں نہیں ملتے۔ تاریخ نہ ہوتے ہوئے بھی سفرنامے ہمارے لیے تاریخ کا ایسا مواد فراہم کرتے ہیں جو بذات خود ایک تاریخ بن جاتے ہیں۔ کسی خاص زمانے میں لوگوں کا سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کیا تھا، یہ ساری باتیں تاریخ میں نہیں ملتیں۔ ان میں تو صرف بادشاہوں کی تبدیلی اور بڑے بڑے واقعات کا حال ملتا ہے۔ تاریخ اگر بے جان واقعات کو بیان کرتی ہے تو سفرنامے زندہ واقعات کی تاریخ ہیں بلکہ سفرنامے کو اپنے عہد کی تاریخ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔

سفرناموں میں حقیقت کا تصور تاریخی حقیقتوں سے مختلف ہوتا ہے، ایک مورخ صرف سنہ واقعہ اور کسی سلطنت یا عہد کے عروج وزوال پر زور دیتا ہے جبکہ سیاح ایک چیز کو اپنے پورے سیاق وسباق کے ساتھ پیش کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ تاریخی اعتبار سے اس میں بعض چیزیں غلط ہوں وہ اس کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ سیاح تاریخی حقیقتوں کے پیش نظر کسی ملک کا سفر نہیں کرتا بلکہ اس کے سفر کے مقاصد مختلف ہوتے ہیں اس لیے وہ جن چیزوں کو دیکھتا، سنتا اور محسوس کرتا ہے ان کے بارے میں ایک رائے قائم کرنے کے بعد حالات اور واقعات کو قلم بند کر دیتا ہے وہ ان کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کے بارے میں سطحی طور پر تو ضرور نگاہ ڈالتا ہے لیکن ان کی چھان بین نہیں کرتا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بنیاد حقیقت اور تاریخ پر ہی ہوتی ہے جس میں سیاح کے اپنے تاثرات اور احساسات بھی شامل ہوتے ہیں۔ دراصل انھیں احساسات اور تاثرات سے سیاح حالات وواقعات کی دلکش وخوبصورت تصویر بنا کر پیش کرتا ہے، یہ تصویریں ہی سفرنامے میں کسی جگہ یا ملک کی تاریخ ہیں، سفرناموں کی تاریخی اہمیت یہی ہے کہ وہ ان حالات اور واقعات کا ایسا بیان کرتے ہیں جو عام طور پر تاریخی کتابوں میں کم ملتے ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ تاریخیں تو مصلحت وقت کا شکار بھی ہو سکتی ہیں اور حاکم وقت کے عتاب اور ظلم کے خوف سے بہت سی باتیں چھپائی یا نظر انداز کی جاسکتی ہیں، لیکن سفرنامے میں اس بات کا اندیشہ نہیں ہے اس لیے کہ سفرنامہ چاہے دوسرے ملک کے بارے میں ہو یا اندرون ملک کے متعلق، عموماً کسی بات کے چھپائے جانے کا امکان کم ہی رہتا ہے۔

اس طرح تاریخی حقائق اور سفرناموں کے حقائق میں فرق ہونے کے باوجود سفرنامے کسی جگہ یا ملک کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں جو تاریخی کتابوں میں بھی نہیں ملتی، اس لیے اس طرح کے سفرناموں کو دیکھنے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سفرناموں سے کسی بھی ملک کے تاریخی، سماجی، تجارتی اور معاشرتی حالات کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے کیونکہ سیاح جس ملک کا سفر کرتا ہے وہاں کے مذہبی، ادبی، معاشی، تعلیمی، صنعتی اور تجارتی حالات کے ساتھ ساتھ تاریخی اور سماجی حالات کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر کرتا ہے۔ چونکہ سفرنامہ ایک مسافر کا مخصوص روزنامچہ ہوتا ہے جس میں وہ اپنے سفر کے حالات درج کرتا ہے۔

سفرنامہ نگار سیاحت کے حالات وواقعات، مشاہدات اور تجربات کو پیش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ سفرناموں میں لوگوں کے اقتصادی حالات کو بھی بیان کرتا ہے اور وہاں کے لوگوں کا پیشہ کیا ہے، وہاں کیا کیا چیزیں تیار کی جاتی ہیں یعنی صنعتی لحاظ سے اس ملک یا شہر کی کیا حیثیت ہے اس پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

تاریخ اور سفرنامہ میں یہ فرق ہے کہ تاریخ مختلف ذرائع سے حاصل کردہ مواد سے ترتیب دی جاتی ہے جبکہ سفر نامہ سیاحت کے حالات و واقعات، مشاہدات اور تجربات کو پیش کرتا ہے۔ سفرنامے کی تاریخی اور سماجی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ غالباً کسی ملک کے جملہ حالات جاننے کے لیے تاریخ سے زیادہ سفرنامے مفید ثابت ہوتے ہیں کیوں کہ تاریخ سے تو واقعات اور طرز حکومت کا اندازہ ہوتا ہے لیکن سفرنامے تاریخ کے ساتھ ساتھ سماجی حالات پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔ سفرنامہ میں سیاح تاریخ کے ساتھ ساتھ تاریخی واقعات کے پس منظر کو بھی سامنے لاتا ہے اور جغرافیائی حالات کو بھی بیان کرتا ہے مثلاً وہاں کی آب وہوا، پیداوار، قدرتی مناظر، دریا، پہاڑ اور جنگل وغیرہ کا بھی تذکرہ کرتا ہے، اس لیے سفرناموں کو علم جغرافیہ کی بنیادی اینٹ کہا جا سکتا ہے۔

سفرناموں کی تاریخی اور سماجی اہمیت پر غور کرتے وقت جو باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ سفرناموں نے ہی تاریخ کو جنم دیا ہوگا، غرض یہ کہ سفرنامے اپنے عہد کی تاریخ کا آئینہ دار ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ یہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں جس سے تاریخ کی کھوئی ہوئی کڑیاں مل جاتی ہیں، اس لیے یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ انسانی تہذیب وتمدن کی تاریخ سفرناموں کے ذریعہ ہی ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچی ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سفرنامے ہماری قدیم یا وسطی تاریخ وتہذیب کی آگہی کا بہت اہم سرچشمہ ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ سفرناموں میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے وہ من وعن تسلیم کرلیا جائے اور ہر بات کو صحیح تاریخ کا ایک جز مان لیا جائے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ سفرنامے میں ہمیں ایسا تاریخی اور سماجی مواد ملتا ہے جو عام تاریخی کتابوں میں بھی نہیں ملتا۔ یہ مواد کسی ملک کی تاریخ اور وہاں کی سماجی اور تہذیبی قدروں کو سمجھنے میں ایک خالص تاریخی کتاب سے زیادہ کارآمد ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ سفرنامے تاریخی اور سماجی اعتبار سے ہمیشہ اہم رہے ہیں بلکہ تاریخ کی تمام تر ترقی کے باوجود سفرنامے کی تاریخی اور سماجی اہمیت سدا مسلم رہے گی۔

■

Dr. Arshad Jameel
DIET Lecturer(District Institute of Education & Training)
Village Dhanewa Dhanei, Near police Line
District Maharajganj273303 (UP)
Pin code 273303
Mob no 7985449717

مکتوبات سرسید

باتیں دل کی

سلطانہ واحدی

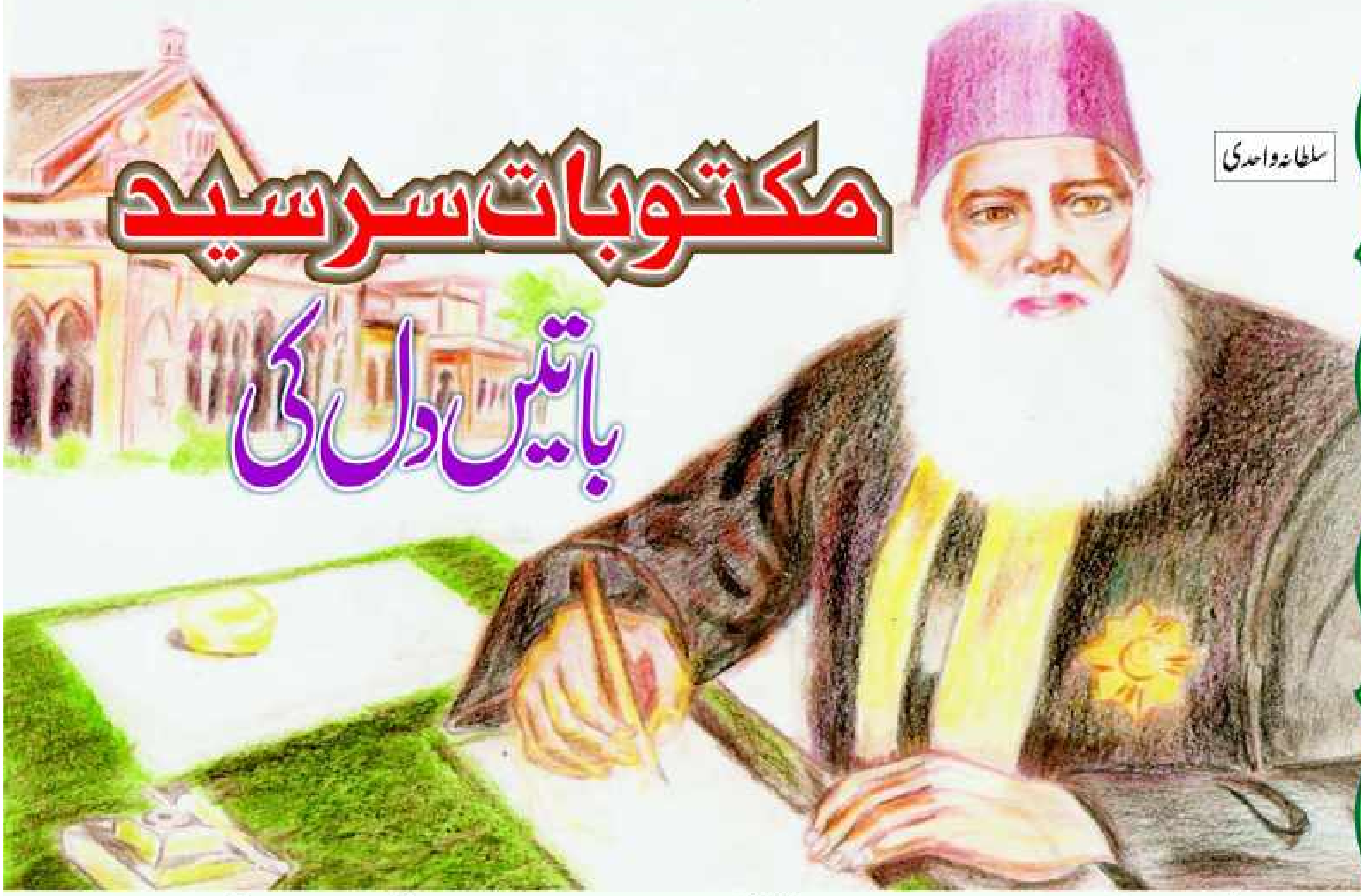

اردو میں مکتوبات نگاری کی روایت قدیم ہے۔ مکاتیب کے اولین مجموعے، انشائے خرد افروز، مکتوبات احمدی وجمہ اور رقعات عنایت علی ہیں۔

(سرسید اوران کا عہد، ثریا حسین، ص 256)

ابتدائی دور کے خطوط میں طویل القاب وآداب، فارسی کے پُرشکوہ الفاظ وتراکیب کا استعمال علمی لیاقت تصور کیا جاتا تھا یعنی مقصدیت کم اور تکلفات زیادہ ہوتے۔ اس طرز نگارش کو ارادی طور پر ترک کرنے والوں میں سرفہرست اسداللہ خاں غالب ہیں۔ انھوں نے خطوط میں پرتکلف القاب وآداب کی رسم ترک کرکے انتہائی سادہ طرز تخاطب اختیار کیا اور مراسلے کو مکالمہ بنایا۔ ان کی یہ روش مقبول عام ہوئی۔ بعد میں آنے والے ادیبوں نے ان کی تقلید کرکے اس سلیس روش کو عروج کمال تک پہنچایا۔

علی گڑھ تحریک سے اردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔ تحریک کے ذریعے نظم ونثر میں مقصدیت اور مدعا نگاری پر زور دیا گیا۔ مسجع عبارت آرائی، فارسی الفاظ وتراکیب سے معمور عبارت کو رد کرکے سادہ اور سلیس انداز تحریر کو رائج کیا گیا۔

نثر میں سادہ وسلیس طرز تحریر کی جو روایت میر امن وغالب نے قائم کی تھی، سرسید اوران کے رفقاء اس روش پر چل کر کاروان سالار بنے۔

سرسید نثر نگار تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات جیسے تعلیم، مذہب واخلاق، سیاست ومعاشرت پر قلم اٹھایا اور آسان روزمرہ کی گفتگو کو اپنے اظہارِ مدعا کا ذریعہ بنایا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں ایسی نثر لکھنا چاہتا ہوں کہ جس کو گھر کی ماما اور سائیں بھی پڑھ کر سمجھ لے۔

سرسید نے اردو ادب میں نثر ونظم دونوں کا جائزہ لیا اور یہ نتیجہ اخذ کیا کہ نثر میں مقفع ومسجع عبارت سے معمور ہے تو نظم مدحیہ قصائد سے لبریز۔ اسی طرح غزل عشق وعاشقی کے مضامین اور روئے یار کے گیسو وخدوخال میں قید ہے۔

وہ ادب کے ذریعے سماج ومعاشرے میں پھیلی ابتری وخرابیوں کی اصلاح کرنے کے خواہاں تھے۔ محمد حسین آزاد نے کرنل ہالرائیڈ کی مدد سے لاہور میں جدید نظم کے فروغ کے لیے انجمن پنجاب کی بنیاد رکھی۔ اس میں ہونے والے مشاعروں میں مصرعۂ طرح کے بجائے ایک موضوع دیا جاتا تھا۔ اس مشاعرے میں مولانا حالی نے اپنی مشہور مسدس مدوجزر اسلام لکھ کر سنائی تھی۔ اس نظم کو سرسید اپنا توشۂ آخرت کہتے تھے۔ مسدس کو پڑھ کر ایک خط حالی کو لکھا جس سے ان کی دلی کیفیت وجذبات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی، جب تک ختم نہ ہوئی، ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ اور جب ختم ہوئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہوگئی۔ اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جاوے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی، خوبی اور روانی سے نظم تحریر ہوئی ہے، بیان سے باہر ہے۔ متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم پڑھے نہیں جاسکتے۔ حق

ہے جو دل سے نکلتی ہے، دل میں بیٹھ جاتی ہے۔''

اس خط کے آخر میں لکھتے ہیں کہ ''بے شک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے اعمالِ حسنہ میں سمجھتا ہوں کہ خدا پوچھے گا تو کیا لایا تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوالایا ہوں اور کچھ نہیں۔''

(خطوط سرسید، مرتبہ راس مسعود، ص 125)

انجمن پنجاب کے مشاعروں سے اردو شاعری ایک نئے رنگ وآہنگ سے ہمکنار ہوئی۔ فرسودہ روایتی مضامین کے بجائے نئے مضامین اور روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے واقعات نے شاعری میں جگہ پائی۔ نیچرل شاعری کا رواج ہوا جس سے دامن اردو نے وسعت پائی۔

سرسید کی بھی یہی خواہش تھی کہ اردو شاعری گل وبلبل، محبوب کے گیسو ورخسار کے خواب وخیال کی دنیا سے نکل کر حقیقت کی پتھریلی زمین پر آجائے اور ہندوستانی ادیب وشاعر حقیقت کی دنیا میں رونما ہونے والے سرد وگرم واقعات کو ادب کا موضوع بنائیں۔ وہ ادب کو مسلم عوام میں بسی اخلاقی پستی وجہالت دور کرنے کا آلہ کار بنانا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں محمد حسین آزاد کو ایک خط لکھ کر اپنی خوشی کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:

''میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرہ سے برآئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں۔ درحقیقت شاعری اور سخن وری کی داد دی ہے۔ اب بھی اس میں خیالی باتیں

بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو۔ جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا، اتنا ہی مزہ دے گا۔ لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو۔ ضروری ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جائیں۔'' (ایضاً ص 125)

سرسید مسلم قوم میں تعلیم کو عام کرنا چاہتے تھے جس کے لیے ان کی بہت سی تحریریں پیش کی جاسکتی ہیں۔ وہ تعلیم کو مسلم قوم کی ترقی کا لازمی جز تصور کرتے تھے۔ قیام لندن کے دوران انھوں نے جانا کہ جب انگلستان کی حالت ہندوستان کی طرح خستہ اور خراب تھی تو وہاں کے سماج کے دو فلاح کاروں (سوشل رفارمرز) نے اپنی قوم کو سدھارنے اور بیدار کرنے کے لیے ٹیٹلر اور اسپیکٹیٹر رسالے جاری کیے جس سے وہاں کی قوم میں سدھار ہوا۔ بس سرسید نے بھی ہندوستان واپس آکر 'تہذیب الاخلاق' رسالہ جاری کیا جس کا اصل مقصد عوام کو بیدار کر کے سماجی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا تھا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہماری سماجی برائی اور خصوصاً مسلم طبقے کی پسماندگی کی وجہ صرف فرسودہ خیالات، ناخواندگی اور جہالت ہے۔ خود سرسید ایک جگہ 'تہذیب الاخلاق' کے اغراض و مقاصد تحریر کرتے ہیں:

''مقصود اس پرچے کے اجرا سے یہ ہے کہ مسلمانوں کی حسن معاشرت اور تہذیب کی ترقی ہو اور جو غلط اوہام مذہبی اس ترقی کے مانع ہیں اور درحقیقت وہ مذہب اسلام کے برخلاف ہیں۔ وہ بھی مٹائے جاویں۔''

اس ضمن میں آگے تحریر فرماتے ہیں 'تہذیب الاخلاق' کے جاری کرنے سے ہماری قوم کی حالت و معاشرت کی اصلاح مقصود و مطلوب ہے اور اسی واسطے سوشل رفارمر یعنی تہذیب الاخلاق اس کا نام رکھا۔''

(سرسید اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص 245)

محسن الملک کو خط لکھ کر اس رسالے کو جاری کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ لکھا تھا: ''ہم بیس دوست پانچ پانچ روپے مہینہ جمع کریں گے اور اخبار مفت بانٹیں گے اور قیمت سے بھی بیچیں گے۔ اس میں مسلمانوں کی دین و دنیاوی بھلائی کے مضامین ہوں گے۔ اس میں، میں اور آپ مضامین لکھیں گے اور صلاح ہوگی تو منشی ذکاء اللہ اور منشی نجم الدین صاحب کو بھی مضامین لکھنے میں شریک کریں گے۔'' (ایضاً ص 244)

سرسید نے ایک خط میں سائنٹفک سوسائٹی کے سکریٹری راجہ جے کشن داس کی فرمائش پر لکھا تھا جس میں جے کشن داس نے سرسید سے قیام لندن کے حالات لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ سرسید نے ایک مفصل خط لکھا تھا۔ اس خط میں اس گھر کی لینڈ لیڈی کی تعلیم و تہذیب و اخلاق کی تعریف لکھی ہے کہ اس کی دو بہنیں جو وہاں اکثر آتی تھیں۔ پڑھی لکھی تھیں۔ ان میں سے ایک بیمار ہو جاتی ہے اور دل بہلانے کے لیے سرسید سے کتاب کی فرمائش کرتی ہے۔ سرسید کہتے ہیں کہ میرے پاس مذہبی کتابیں ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی کتاب لے کر پڑھتی ہے۔ صحت مند ہونے پر وہ سرسید کو اس کتاب کی چند عمدہ باتیں بتاتی ہے جس سے سرسید بہت متاثر ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''متوسط درجے سے کسی قدر کم درجہ عورتوں کی کیسی عمدہ تعلیم ہے! کیا یہ تعجب خیز بات نہیں ہے کہ ایک عورت حالتِ بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلاوے۔ آپ نے ہندوستان میں کسی امیر، کسی نواب، کسی راجہ یا کسی مرد اشراف کو ایسی خصلت کا دیکھا ہے؟''

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں: ''میں نہایت خوش ہوں کہ ہمارے بھائی بنگالیوں اور پارسیوں نے کسی قدر شائستگی میں ترقی کرنی شروع کی ہے۔ مگر ہمارے ہم وطن ہندو اور کمبخت مسلمان کوئے جہالت میں پڑے ہیں اور آئندہ مدت تک پڑے رہیں گے۔ اور شاید مسلمان تو اتنے دنوں تک پڑے رہیں کہ پھر وقت اور زمانہ ان کی ترقی اور شائستگی کا باقی نہ رہے۔ اور جواب مرض ہے وہ علاج پذیر نہ رہے۔ کیونکہ ان کو یعنی مسلمانوں کو جہل مرکب نے گھیرا ہے۔ اپنے باپ دادا کے قصے یاد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم سے بہتر کون ہے؟ لیکن مجھے خوشی ہے کہ مصر اور ترکی کے مسلمان روز بروز شائستگی میں ترقی کرتے جارہے ہیں۔''

اسی خط میں لندن کی نوکرانیوں اور کیپ مین کی بھی تعریف لکھی ہے کہ باوجود معمولی تنخواہ پانے کے، وہ لوگ اخبار اور کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''بس جب تک کہ اس قدر ترقی عام تعلیم کی نہ ہو، شائستگی اور تربیت کسی قوم میں آنی، اس قوم کی عزت ہونی ناممکن ہے۔ (مکاتیب سرسید، مشتاق حسین ص 22,23,33,34)

سرسید کو مولوی سید مہدی علی نواب محسن الملک سے بہت ذہنی وابستگی تھی۔ ذیل میں دو خطوط دیے جارہے ہیں جس سے ان کے محسن الملک سے تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے:

''واہ حضرت واہ! بہرحال آپ کا عنایت نامہ آیا۔ خدا کا شکر کیا۔ آپ خوش ہیں اور اچھی طرح ہیں۔ یہی ہم چاہتے ہیں۔ خوش رہو، زندہ رہو۔ مگر میرے آخر عریضہ کا جواب ضرور دو حرفی بھیج دو کہ چھ ہزار روپے کا مدرسے کے لیے وعدہ کیا ہے۔ وہ میری زندگی میں عنایت ہوں گے کہ نہیں؟'' (ایضاً ص 312)

اسی طرح ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''جس قدر خوشی مجھ کو آپ کے عنایت نامہ بھیجنے سے ہوئی، بیان نہیں کرسکتا۔ یہ مقولہ کہ ''الخط نصف الملاقات غلط'' پوری ملاقات کا لطف ہوتا ہے۔ مفارقت میں اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔'' (خطوط سرسید، مرتبہ سرراس مسعود، ص 30)

1868 میں جب اردو کو دفاتر سے بے دخل کر کے ہندی کو عدالتی زبان قرار دینے کی تحریک اٹھی تو اس ضمن میں سرسید نے سر اُدے پرساد سنڈل کو اردو کی حمایت میں ایک خط لکھا:

''میرے نزدیک اضلاع شمال و مغرب و صوبہ بہار کی عدالتوں میں وہی زبان شائع ہونی چاہیے جس کو آپ ہندی یعنی موجودہ مخلوط زبان کہتے ہیں۔ لیکن میں اس کو اردو کہنا پسند کرتا ہوں۔'' (مکاتیب سرسید، مشتاق حسین، ص 260)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں'' اور آپ کا یہ فرمانا کہ اردو زبان میں فارسی کے بہت لفظ مخلوط ہیں، بجا نہیں ہے۔ اس واسطے کہ فارسی کے لفظ اردو میں وہی لوگ زیادہ ملادیتے ہیں جو فارسی جانتے ہیں۔'' (ایضاً ص 270)

اسی خط میں آگے لکھتے ہیں ''ہمیں قانونی وثائق پڑھنے کے لیے زبان کی نہیں قانون داں کی ضرورت ہے۔'' اور اس کے لیے یورپ کی مثال پیش کی کہ'' باوجود زبان جاننے کے وہ لوگ قانونی وثائق کے لیے قانون داں کے پاس جاتے ہیں۔'' آخر میں لکھتے ہیں ''کوئی شخص فارسی حروف ترک کرکے اس کی جگہ اور حروف قائم کرنے کی ٹھوس وجوہات پیش کرے اور بغیر کسی دقت کے ہندی حرفوں سے ہمارے کاربر آئی ہو سکے تو پھر میں حروفِ مجوزہ جاری ہونے کی نسبت کچھ اعتراض نہ کروں گا۔'' (مکاتیب سرسید، مشتاق حسین، ص 268)

سرسید کی منشی نول کشور سے بھی اچھی رسم و راہ تھی۔ دونوں میں خط و کتابت بھی رہتی تھی۔ ایک بار اودھ اخبار

میں عبدالحلیم شرر کا ایک مضمون 'روح' شائع ہوا تو سرسید نے نولکشور سے خط لکھ کر تہذیب الاخلاق میں اس مضمون کو شائع کرنے کی اجازت چاہی تھی اور نولکشور سے اجازت ملنے پر شرر کا مضمون تہذیب الاخلاق میں شائع کیا تھا۔

1872 میں جب غلام محمد تپش اودھ اخبار کے اڈیٹر تھے، انھوں نے سرسید کو خط لکھ کر معلوم کیا تھا کہ "آیا نکتہ کی بات" محاورہ درست ہے یا غلط؟" جس کا جواب سرسید نے لکھا تھا:

"جبکہ آپ خود اہلِ زبان ہیں۔ جو آپ کے قلم و زبان سے نکلے وہی سند و محاورہ ہے۔ بہار عجم کی سند کی نہ احتیاج اور نہ کسی قاعدے کی دلیل ضروری ہے۔ صرف اتنا کافی ہے کہ اہلِ زبان بولتے ہیں یا نہیں۔ اور جب خود آپ اہلِ زبان ہیں تو آپ ہی اپنی سند ہیں۔ نکتہ و بات کو ہر جگہ ملا دینا البتہ صحیح نہ ہوگا۔ الا بعض موقعوں پر جو بے ساختہ اہلِ زبان سے نکلا کرتے ہیں صحیح ہے۔ پس جس عبارت میں آداب نے ان کو ملایا ہے، میری دانست میں صحیح و بامحاورہ ہے۔ کچھ غلط ان میں نہیں۔ باقی اس کی وجوہات اس کا لکھنا بے فائدہ ہے۔ خاکسار سید احمد، بنارس، مورخہ 31 رجنوری 1872"

(نول کشور اور ان کا عہد، مرتبین پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، ص 86)

سرسید نے بے شمار خطوط لکھے۔ ضرورت کے تحت، لوگوں کے ارسال کردہ مکتوبات کے جوابات، لوگوں کے مذہبی شک و شبہات دور کرنے کے لیے مختلف کمیٹیوں، انجمنوں، کالجوں کو خطوط ارسال کیے۔ ان کے مکتوبات ان کی سادگی اور دلی جذبات کا آئینہ ہیں۔ وہ اپنے خط میں محسن الملک کو اس طرح مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قبلہ میرے، مخدوم میرے، محبوب میرے، محبِ میرے اب تو صاف لکھ دوں جو ہو سو ہو۔ سلامت آپ کا عنایت نامہ پایا اور عجیب کیفیت میں مبتلا کیا۔ کبھی اپنے آپ کو دیوانہ سمجھتا ہوں، کبھی تم کو دیوانہ جانتا ہوں۔"

(خطوط سرسید، سر راس مسعود، ص 38)

ان کے یہ خلوص، ان کی طبیعت کی سادگی کا مرقع ہیں۔ بقول ثریا حسین کہ:

"ان کے خطوط میں سادگی، سلاست، جامعیت اور اختصار ہے۔ القاب و آداب کا کوئی خاص اہتمام نہیں بلکہ وہ سادہ اور برمحل القاب کی وجہ سے ان کے یہاں یگانگت اور گرم جوشی کا احساس ہوتا ہے اور مخاطب سے ان کی وابستگی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔"

(سرسید اور ان کا عہد، ثریا حسین، ص 259)

وہ اپنے مکتوبات میں مکتوب الیہ کو اس طرح مخاطب کرتے ہوئے ملتے ہیں: "جناب من، صاحب من، محبی و

سرسید نے بے شمار خطوط لکھے۔ ضرورت کے تحت، لوگوں کے ارسال کردہ مکتوبات کے جوابات، لوگوں کے مذہبی شک و شبہات دور کرنے کے لیے مختلف کمیٹیوں، انجمنوں، کالجوں کو خطوط ارسال کیے۔ ان کے مکتوبات ان کی سادگی اور دلی جذبات کا آئینہ ہیں۔

مشفقی، محبِ دلنوازِ من واہ واہ جناب محسن الملک واہ واہ۔

لیکن سرسید نے کہیں کہیں لوگوں کے مقام و مرتبے کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ مثلاً خانصاحب، مخدوم و مکرم من، جناب مولوی صاحب، مخدوم و مکرم، معظم و محتشم، پرائیویٹ سکریٹری، ہزایکسی لینسی وائے سرائے و گورنر جنرل ہند، بخدمت جناب سکریٹری صاحب، ایم اے او کالج اسٹوڈنٹس برادر ہذ وغیرہ۔

ان کے مکاتیب سنجیدگی، سلاست و سادگی کا مرقع ہیں۔ ان کا مقصد فقط ترسیلِ مدعا ہے۔ وہ خطوط کو صرف پیغام رسانی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ پرشکوہ عبارت لکھ کر سامعین کو مرعوب کرنا یا عبارت میں مہارت دکھانا مقصد نہیں ہوتا۔ ان کے زیادہ تر خطوط قلم برداشتہ ہیں۔ اس لیے کہیں کہیں جملوں کی ترتیب و قواعد میں معمولی لغزشوں کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ صرف ان کی عدیم الفرصتی ہو سکتی ہے۔ یعنی مکتوب الیہ کو اپنی بات ذہن نشین کرانے کے لیے جو الفاظ بروقت ذہن میں آئے، لکھ دیے۔ انگریزی الفاظ کا کثرت سے استعمال ہے جیسے ریمارک، ڈیر، ٹرسٹیز، سبجیکٹ، میجارٹی، مائنارٹی، ریزیڈینٹ وغیرہ۔ اسی طرح انگریزی لفظوں کی جمع اردو قاعدے کے تحت بنائی گئی ہے جیسے اسپیچوں، رپورٹوں، کالونیوں، سوسائٹیوں وغیرہ۔ اسی طرح فارسی کے خط میں اردو الفاظ کا استعمال ہے جیسے گھنٹہ، پھانسی، رجسٹری لکھا ہوا ملتا ہے۔ ان کی اس روایت کے مطابق آج بیشتر الفاظ رائج اور چلن میں ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کا قیام ان کی محنت و کاوشوں کا ثمرہ ہے جس سے ہندوستانی قوم ہمیشہ فیض یاب ہوتی رہے گی۔ ان کے خطوط کے کئی مجموعے خطوط سرسید مرتبہ سر راس مسعود، انتخاب مکاتیب سرسید مرتبہ شیخ عطاء اللہ، مکتوبات سرسید شیخ اسماعیل پانی، مکاتیب سرسید مرتبہ مشتاق حسین وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے اور مکاتیب کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ لیکن وہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے شائع ہونے سے رہ گئے ہیں۔

اسماعیل پانی پتی کی مرتب کردہ کتاب خطوط بنام سرسید میں وہ خطوط جمع کیے گئے ہیں جو خطوط سرسید کو لکھے گئے ہیں۔ فرانس کے مشہور اردو کے مستشرق پروفیسر گارساں دتاسی نے ایک خط سرسید کو اردو میں لکھا تھا جب سرسید لندن گئے تھے۔ انھوں نے سرسید کو یہ لکھا تھا کہ انھیں صرف اردو پڑھنا اور ترجمہ کرنا آتا ہے۔ لیکن لکھنا نہیں آتا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ وہ کبھی ہندوستان نہیں آئے۔

گارساں دتاسی نے سرسید کو لکھا تھا:

"کتاب توریت مقدس کی تفسیر جو آپ نے میرے پاس بھیجی ہے، اس کا میں بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں نے اس کتاب کی نسبت اپنے ایڈریس میں بہت کچھ ذکر کیا تھا۔ جو کتاب آپ نے دہلی کی عمارتوں کی نسبت تالیف کی تھی میں نے اس کا ترجمہ زبان فرانس میں کرلیا ہے۔"

دتاسی نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ سرسید کے لندن آنے کی خبر اخبار میں بھیجی تھی لیکن اس میں اعلے کی کچھ غلطیاں ہوگئی تھیں۔ اس کی معذرت سرسید سے کی تھی کہ میں آپ کی ملاقات سے خوش ہوں گا اور جو کچھ لکھتا ہوں اس کو زبانی بیان کروں گا۔ خط کی تاریخ 17 رجولائی 1869 ہے۔ (خط بنام سرسید، مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی، ص 19)

ایک اور اہم خط امام بخش صہبائی کے نواسے محمد حمید الدین تھانیسری کا ہے جس میں انھوں نے سرسید کے اپنے خاندان پر کیے ہوئے احسانات کا شکریہ ادا کیا تھا اور لکھا تھا کہ امام بخش صہبائی کے جب ایام غدر میں مارے جانے کے بعد پسماندگان کی خصوصی مدد کی تھی اور بڑی کوشش کرکے مولانا مرحوم کی بیوہ اور ان کے دوسرے رشتے داروں کے گزارے کے لیے وظیفے مقرر کرائے تھے، اس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اسماعیل پانی پتی نے امام بخش صہبائی کے نواسے کا یہ خط حالی کی کتاب 'حیات جاوید' سے لے کر اپنی کتاب میں شامل کیا تھا۔ (ایضاً ص 94)

ان کے مکاتیب ان کی شخصیت کے غماز ہیں۔ ان کے خطوط انفرادی نہ ہو کر اجتماعی ہو گئے ہیں جن میں جگہ جگہ قوم کا درد، خلوص، انسانی ہمدردی، حب الوطنی کا احساس ہوتا ہے۔ خطوط پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک سے نہیں بلکہ ہم سب سے بات کر رہے ہیں۔ ان کے تمام مکتوبات کا ایک مقالے میں احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے ع

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

■

Sultana Wahidi
D-15, Abul Fazal Enclave
Thokar No 3, Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

عادل حیات

اختر انصاری کا افادی ادب

اختر انصاری ترقی پسند تحریک سے مستقل طور پر وابستہ تو نہیں تھے، لیکن انھوں نے جس تسلسل و تواتر کے ساتھ اس تحریک کے نظریات کو عام کرنے اور اسے ایک تنقیدی، فکری اور سائنسی بنیاد فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا، ان کی شاعری، افسانوی ادب اور تنقید اسی جہدِ مسلسل کا عملی ثبوت ہیں۔ انھوں نے ترقی پسند تحریک کے نظری اور فکری ڈسکورس پر ایک کتاب 'افادی ادب' کے نام سے لکھی، جو کہ خود ان کے مطابق ترقی پسند تنقید کی بنیاد میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتی ہے، یہ بھی حقیقت ہے کہ اختر حسین رائے پوری کو اردو کا پہلا ترقی پسند نقاد کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے میں نے پروفیسر قمر رئیس سے گفتگو کی تو انھوں نے کہا کہ اگر ثبوت مہیا کرا دیں تو ہمیں اختر انصاری کو ترقی پسند تحریک کا پہلا باضابطہ نقاد ماننے میں کوئی قباحت نہیں۔ میرے پاس 'افادی ادب' کا جو نسخہ ہے، اس پر طبع چہارم اور سنہ اشاعت 1959 درج ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مذکورہ اشاعت سے پہلے بھی یہ کتاب متعدد دفعہ چھپ چکی تھی۔ اسی نسخے کے صفحہ 58 پر لکھا ہے کہ ''یہ سطور 1941 میں لکھی گئی تھیں''، لیکن دن اور مہینے کے متعلق کچھ بھی واضح نہیں کیا گیا۔ بہت چھان بین کے بعد پتہ چلا کہ 'افادی ادب' کی پہلی اشاعت 1941 میں ہوئی تھی، یعنی ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس 1936 میں ہوئی تھی، اس کے ٹھیک چار سال بعد 'افادی ادب' کا پہلا نسخہ لوگوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اس سے پہلے ایسی کسی کتاب کا سراغ نہیں ملتا، جس میں ترقی پسند تحریک کے فکری و نظری ڈسکورس کو لفظوں کا جامہ پہنانے کی باضابطہ کوشش کی گئی ہے، البتہ کانفرنسوں کی رپورٹیں اور کچھ مضامین رسائل و جرائد میں ضرور نظر آتے ہیں۔ ان حقائق کو تسلیم کرنے کے باوجود میں اصرار تو نہیں کرتا کہ اختر انصاری ترقی پسند تحریک کے باقاعدہ پہلے نقاد اور 'افادی ادب' ان کی پہلی تنقیدی کتاب ہے، لیکن اہل ادب کو اس جانب اپنی توجہ ضرور مبذول کرنی چاہیے۔ اس کتاب کی ابتدا ''ادب حیاتِ انسانی کی تفسیر ہے۔'' جیسے جملے سے ہوتی ہے۔ اس میں کوئی نیا پن نہیں کہ اس جملے کو ترقی پسند ناقدین ہمیشہ دہراتے رہتے ہیں، لیکن اختر انصاری جب یہ کہتے ہیں کہ ''ادب حیات انسانی کی تفسیر ہی نہیں بلکہ تنقید بھی ہے'' تو اس میں معنی کی ایسی پرتیں نمودار ہو جاتی ہیں، جن میں زندگی کا عکس ہی نہیں ابھرتا بلکہ اس کے رستے زخم بھی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ ادب کا کام صرف ان زخموں کی نوعیت کا پتہ لگانا ہی نہیں بلکہ ان کی جراحی بھی کرنا ہے۔ اختر انصاری ادب کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی صرف عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی۔'' (ص 4-5)

ادب زندگی کی تفسیر بھی ہے اور تنقید بھی۔ وہ زندگی کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ زندگی کی تخلیق بھی کرتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور معاشی ماحول کی صرف عکاسی ہی نہیں کرتا بلکہ اس میں رنگ بھی بھرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ زندگی سے اثر پذیر بھی ہوتا ہے اور زندگی پر اثر انداز بھی۔

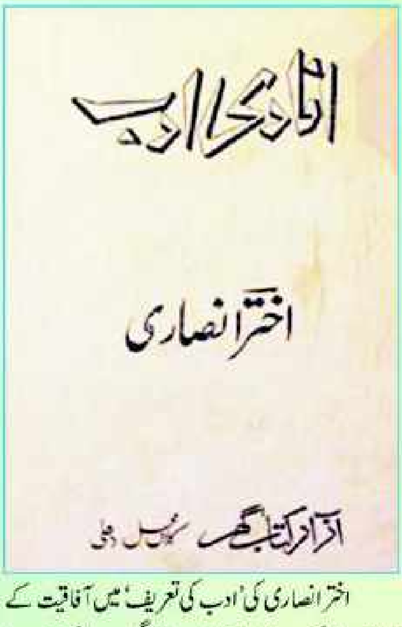

اختر انصاری کی 'ادب کی تعریف' میں آفاقیت کے عناصر ہیں کہ ہر زمانے کا ادب زندگی سے اثر پذیر ہوتا ہے اور زندگی پر اس کے اثرات بھی ثبت ہوتے ہیں۔ اس پس منظر میں ادب اپنے تخلیقی عہد کی سماجی و سیاسی، طبقاتی و اقتصادی اور معاشی و معاشرتی زندگی کی منہ بولتی تصویر ہی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اثرات بھی مذکورہ عہد پر مرتب ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر دکنی ادب کو لیجیے یا میر و مرزا کے زمانے کو، اور آگے بڑھیں تو دبستان لکھنؤ یا اجڑتی ہوئی دلی کے ادب کو سامنے رکھیے یا اس کے بعد کے زمانے میں لکھے گئے ادب پر نظر کیجیے تو ہر دور اور اس کے ادب میں مذکورہ خیالات کی عکاسی ملے گی۔ اس مفروضے کی روشنی میں ہر ملک اور ہر زمانے کے ادیب اور شاعر ادب تصنیف کرتے رہے ہیں، لیکن بعض اہل قلم ایسے بھی ہیں، جنھوں نے کبھی اس نظریے کو ایک واضح، متعین اصول کی حیثیت سے اپنے سامنے نہیں رکھا، لیکن ان کی ادبی تخلیقات اس نظریے کی عملی تفسیر معلوم ہوتی ہیں۔ اختر انصاری کا اصرار ہے کہ جو اہمیت اور مقبولیت اس نظریے کو آج دنیائے ادب میں حاصل ہے وہ پہلے کبھی نہ تھی اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ موجودہ دور عوامی بیداری، سیاسی و سماجی شعور، اور اجتماعی انقلابات کا دور ہے۔ ایسے دور میں ادب کے ایک صحیح تصور کا پیدا ہوجانا اور مذکورہ بالا نظریے کا غیر معمولی اہمیت اختیار کرلینا ایک لازمی اور فطری امر ہے۔

اختر انصاری زور دے کر کہتے ہیں کہ گزشتہ زمانے میں چونکہ ہر چیز پر حکمراں طبقہ قابض تھا، وہ قدرت کی نعمتوں اور صنعت کی برکتوں کے اجارہ دار تھے سیاسی اور مدنی تنظیم کے سارے فوائد ان کی ذاتی ملکیت تھی، ان

حالات میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان زمانوں کے بہت سے ادیب و شاعر ادب اور فن کے صحیح تصور سے بھی بیگانہ رہے اور بسا اوقات اس بے بنیاد نظریے کے حامی بن بیٹھے، جس کو عام طور پر 'فن برائے فن' یا 'ادب برائے ادب' کہا جاتا ہے۔ ادب کے متعلق اس قسم کے خیالات و عقائد اس وقت زور پکڑتے ہیں جب ادب دولت کا محکوم اور سرمائے کا غلام ہوتا ہے اور فن عوامی زندگی کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ سیاسی ابتری جماعتی انتشار اور تمدنی انحطاط سے بھی اس نظریے کو بہت مدد ملتی ہے۔ ان کے مطابق اردو ادب کے صد سالہ دور میں ملک انحطاط و انتشار کا شکار تھا، اسی ماحول میں اردو ادب نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی پھر چونکہ اس وقت کے ادبا اور شعرا کے پیش نظر کوئی اجتماعی مقصد نہیں تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کا ادب سوسائٹی کے سقیم اور مذموم رجحانات کا شکار ہوگیا۔ اختر انصاری مغلیہ دور کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں اور اس کے بعد انگریزوں کی بالادستی کا ذکر کرتے ہوئے زندگی کو نئی روشنیوں کی آماجگاہ تصور کرتے ہیں جس میں ہونا یہ چاہیے تھا کہ اس دور کے ادبا، شعرا، اہل فکر اور اہل قلم بیدار مغز انسانوں کی طرح اپنے زمانے کی سیاسی، معاشی اور تمدنی حالات کا بغور مطالعہ کرتے، ان غارت گرانہ اور استحصالی قوتوں کا جائزہ لیتے جو آہستہ آہستہ مگر نہایت کامیابی کے ساتھ ملک و قوم پر مسلط ہورہی تھیں اور پھر رومانی قلعوں اور خیالی جنتوں میں پناہ گزیں ہونے کے بجائے مردانہ وار ان حالات اور ان قوتوں کا مقابلہ کرتے۔ وہ ایک مخصوص نقطۂ نظر کے مالک ہوتے اور ایک واضح منزل ان کے پیش نظر ہوتی۔ ان کا ادب زندگی کی حقیقتوں اور تلخیوں کا ترجمان ہوتا۔ اس میں ایک جوش، ایک پیغام، ایک احتجاج، ایک طرح کی رجائیت پائی جاتی، یعنی وہ ایک ایسا ادب ہوتا جو زندگی کا ترجمان بھی ہوتا اور زندگی کا خلاق بھی۔ اختر انصاری کے مطابق ایسا نہیں ہوا، نہ ہوسکتا تھا کہ اس زمانے کے ادیب 'ادب برائے زندگی' کے قائل

نہ تھے۔ وہ خالص جمالیاتی، رومانی اور غیر مقصدی ادب کے علم بردار تھے اور شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر 'ادب برائے ادب' کے نظریے کو صحیح تسلیم کرتے تھے۔

اختر انصاری ادب کی تعریف اور اس کی روشنی میں اردو ادب کے مختلف ادوار کا جائزہ لینے کے بعد کہتے ہیں کہ ادب میں دو خصوصیتیں لازمی طور پر پائی جاتی ہیں:

(1) ادب اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہ راست تعلق رکھتا ہے۔

(2) ادب کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت ہوتی ہے۔

ادب کی ان دونوں خصوصیات کو زیر بحث لانے سے پہلے اختر انصاری نے وضاحت کر دی ہے کہ پہلی خصوصیت میں دوسری خصوصیت شامل نہیں، کیونکہ ایسا ادب تصور میں آسکتا ہے جو اجتماعی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتے ہوئے بھی کوئی مخصوص سماجی مقصد حاصل نہ کرے۔ ادب کی تعریف اور اس کا اتباع اردو ادب کے مختلف ادوار پر کرتے ہوئے اختر انصاری اس کی پہلی خصوصیت پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں، اجتماعی زندگی سے ادب کے گہرے اور براہِ راست رشتے کو مثالوں کے ساتھ سمجھاتے ہیں اور آخرکار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

''ادب اپنے عہد کی اجتماعی زندگی سے بے نیاز نہیں ہوتا، نہ ہوسکتا ہے۔ اگر ادیب اپنے ماحول کی طرف سے آنکھیں بند کرلے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ گرد و پیش کے حالات کو نظر انداز کرے تب بھی اجتماعی زندگی کسی نہ کسی طرح ادب میں جھلک ہی جاتی ہے۔ پھر جب اجتماعی زندگی سے گریز ناممکن ہے اور اس کے اثرات سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تو ہمارا کہنا یہ ہے کہ کیوں نہ ادب اس کے ساتھ ایک گہرا اور براہ راست تعلق قائم کرے تاکہ وہ پورے طور پر اور صحیح معنوں میں زندگی کا ترجمان اور خارجی حالات کا مرقع ہو۔'' (ص: 42)

ادب اور اجتماعی زندگی دونوں کے حوالے سے

ادب اپنے عہد کی اجتماعی زندگی سے بے نیاز نہیں ہوتا، نہ ہوسکتا ہے۔ اگر ادیب اپنے ماحول کی طرف سے آنکھیں بند کرلے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ گردوپیش کے حالات کو نظر انداز کرے تب بھی اجتماعی زندگی کسی نہ کسی طرح ادب میں جھلک ہی جاتی ہے۔ پھر جب اجتماعی زندگی سے گریز ناممکن ہے اور اس کے اثرات سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تو ہمارا کہنا یہ ہے کہ کیوں نہ ادب اس کے ساتھ ایک گہرا اور براہ راست تعلق قائم کرے تاکہ وہ پورے طور پر اور صحیح معنوں میں زندگی کا ترجمان اور خارجی حالات کا مرقع ہو۔

مذکورہ باتیں کی جاسکتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب، تاریخ کے ہر دور میں اجتماعی زندگی سے خوراک حاصل کرتا رہا ہے، اور اجتماعی زندگی ادب سے متاثر ہوتی رہی ہے۔ چنانچہ ادب کو اپنے تخلیقی زمانے کی سچی تصویر کہا گیا ہے، جس میں اجتماعی زندگی کی سچائیاں پورے خط وخال کے ساتھ نمایاں ہوتی ہیں۔ اختر انصاری کا یہ اصرار کہ ادب اس (اجتماعی زندگی) کے ساتھ ایک گہرا اور براہ راست تعلق قائم کرے تاکہ وہ پورے طور پر اور صحیح معنوں میں زندگی کا ترجمان اور خارجی حالات کا مرقع ہو، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک خطرناک عمل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ادب کسی بھی طور ادیب کی شعوری کوشش سے وجود میں نہیں آسکتا بلکہ اس کی ایسی کوئی بھی کوشش کسی بھی واقعے کی رپورٹنگ تو کرسکتی ہے، لیکن ادب کی تخلیق نہیں کرتی۔ ادب کی تخلیق کے لیے ضروری ہے کہ ان واقعات کے اثرات کو داخلی طور پر تخیل کے سہارے پیش کیا جائے۔ اختر انصاری چونکہ ترقی پسندی کے قائل ہیں، اس لیے وہ ادب کے تخلیقی تقاضوں کا خیال رکھے بغیر انھیں باتوں کا اعادہ کرتے ہیں، جن کا ترقی پسند نظریہ وعمل سے براہ راست تعلق ہے۔ دوسری خصوصیت جو ان کے نزدیک لازمی ہے، وہ یہ کہ ادب کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئے۔ اختر انصاری کے اس خیال سے لفظ 'مقصد' کو خارج کردینے کے بعد مان لینے میں کوئی قباحت نہیں کہ بہرحال ادب کا تعلق سماج سے ہوتا ہی ہے۔ انھوں نے مثالوں کے ذریعے اپنے خیال کی وضاحت کرتے ہوئے سماج کے دو بڑے اقتصادی طبقے کی نشاندہی کی ہے۔ ایک وہ طبقہ جو دولت آفرینی کے کل ذرائع پر قابض اور سوسائٹی کے تمام نفع بخش اداروں پر متصرف ہوتا ہے، دوسرا طبقہ وہ جس کے افراد سرمایے کے غلام اور روحانی و مادی ترقی کے مواقع سے یکسر محروم ہوتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں میں مسلسل نزاع جاری رہتی ہے، کیوں کہ ان کے مفاد بنیادی طور پر مختلف ہوتے ہیں اور لازماً ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ جب یہ نزاع شدید اور بحرانی صورت اختیار کرتا ہے تو پہلا طبقہ اپنے ناجائز نفعوں کو بچانے اور اپنے تاریخی زوال کو روکنے کی ناکام کوشش میں رجعت پسندی کا مرکز بن جاتا ہے اور تمام ترقی پسند اور انقلابی رجحانات سمٹ کر دوسرے طبقے کی زندگی میں جمع ہوجاتے ہیں۔ اختر انصاری کے مطابق زندگی کے دو فلسفے، فلسفۂ رجعت اور فلسفۂ انقلاب وجود میں آتے ہیں۔ وہ فلسفۂ رجعت کے ذیل میں کہتے ہیں کہ یہ فلسفہ ہر نوع کی تبدیلی کا مخالف، سماج کے ڈھانچے کو جوں کا توں قائم رکھنے کا حامی، زندگی کے پرانے معیاروں اور قدروں کا قائل، ماضی و باقیاتِ ماضی کا دلدادہ اور فرسودہ تمدنی روایات کا پرستار ہوتا ہے۔ اس کے برعکس فلسفۂ انقلاب تاریخی ارتقا کے اصول کو ملحوظ رکھتے ہوئے سماج کی بنیادی ساخت کو منقلب کردینے کی تلقین کرتا اور حیات انسانی کے حرکی تصور کو مقبول بنانے کا

اردو کی ادبی تاریخ میں شاید ہی کوئی دور ایسا ہو، جس میں ادبا نے اپنے خیالات کی ترسیل ادب و شعر کے سانچے میں نہیں کی ہو اور پھر اس کے مثبت و منفی اثرت سماجی زندگی پر نہیں پڑے ہوں۔ اس کی مثال اردو ہی نہیں بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے دی جاسکتی ہے کہ ان کے ادب کے دامن میں کیسی کیسی فتوحات ہیں۔ اخترانصاری کا مقصد ان مباحث کے ذریعے ادب کو جانچنے پرکھنے کا ایک معیار کشید کرنا تھا۔

کام اپنے ذمے لیتا ہے۔ اس دوسرے فلسفے کو مفکروں، شاعروں اور ادیبوں کی جماعت وقت کا صحیح فلسفہ سمجھ کر قبول کرلیتی ہے، لیکن اسی گروہ کے بعض دوسرے افراد اپنی قدامت پرستی، تنگ نظری اور محدود خیالی کے باعث یا اس سبب سے کہ ان کا مفاد کسی نہ کسی طور پر رائج الوقت نظام سے وابستہ ہے، اس کو تسلیم نہیں کرتے اور اپنے غیر جانب دار ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ ہر دور میں سماج کچھ ترقی پسندانہ رجحان سے گزرا ہے، چنانچہ ادب میں موضوعات کی رنگارنگی کے ساتھ طبقاتی کشمکش کی عکاسی انھی کی بدولت ہوئی ہے، البتہ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں ترقی پسندوں نے جس بلند بانگ انداز میں ادب کے مقصد کے تحت انقلاب کا راگ الاپا، وہ کیفیت ادب کے دوسرے ادوار میں نہیں تھی۔ ادب کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے اختر انصاری لکھتے ہیں:

"ادب کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ادیب اس کے ذریعے اپنے خیالات دوسرے تک پہنچائے اور دوسروں کو متاثر کرے۔ یہ پہلے ہی واضح کیا جاچکا ہے کہ ادیب کے خیالات سماجی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے نہ ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ ادب کا مقصد سماجی زندگی کو متاثر کرنا ہوا۔" (ص:47)

اردو کی ادبی تاریخ میں شاید ہی کوئی دور ایسا ہو، جس میں ادبا نے اپنے خیالات کی ترسیل ادب وشعر کے سانچے میں نہیں کی ہو اور پھر اس کے مثبت ومنفی اثرت سماجی زندگی پر نہیں پڑے ہوں۔ اس کی مثال اردو ہی نہیں بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب سے دی جاسکتی ہے کہ ان کے ادب کے دامن میں کیسی کیسی فتوحات ہیں۔ اختر انصاری کا مقصد ان مباحث کے ذریعے ادب کو جانچنے پرکھنے کا ایک معیار کشید کرنا تھا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"کسی ادبی کارنامے کی قدر وقیمت کا اندازہ لگانے کے لیے ہم یہ دیکھیں گے کہ وہ ادبی کارنامہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہے یا نہیں، اور یہ کہ اس کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آئی ہے یا نہیں۔ اگر اس میں یہ دونوں خصوصیتیں پائی جاتی ہیں تو وہ صحیح وصالح اور زندہ و پائندہ ادب کا ایک نمونہ ہے۔" (ص:57)

صاف ہے کہ اختر انصاری "اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق" اور "ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد" والی بات ترقی پسند نظریۂ تنقید کے حوالے سے کرتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ کوئی بھی ادبی کارنامہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی کا عکاس ہوتا ہے۔ اس میں مخصوص سماج کے تمام رجحانوں کا بیان تخلیق کار کے مشاہدے کے طور پر ہوتا ہے، لیکن انہیں ایک مقصد بناکر ادب کی تخلیق کی جائے تو اس کے فطری پن کے مجروح ہونے کا خدشہ بڑھ جاتا ہے۔ جیسا کہ ترقی پسند ادب کے ساتھ ہوا۔ اس مفروضے کو مان لینے کے بعد کہ ادب کی تخلیق ایک مخصوص اور واضح سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آنی چاہیے اختر انصاری سوال اٹھاتے ہیں کہ وہ کون سا سماجی مقصد ہے جو آج کل کے ادیبوں کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ اس سوال کا جواب دینے کے لیے وہ اپنے گردوپیش کے سیاسی، اقتصادی اور سماجی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے دو سماجی گروہ رجعت پسندی اور ترقی پسندی یا انقلاب کا ذکر کرتے ہیں۔ جن میں سے ایک ماضی اور ماضی کی تاریک بھول بھلیوں کی طرف لے جاتا ہے تو دوسرا مستقبل کی روشن شاہراہوں کی جانب رہنمائی کرتا ہے۔ یہی دو راستے ہیں، ادیبوں کو ان دو راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ہوگا کہ تیسرا کوئی راستہ ان کے سامنے موجود نہیں۔ وہ ادیبوں کو ترقی پسندی یا انقلاب کا راستہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"یہی وہ مخصوص اور واضح سماجی مقصد ہے (سماج اور اس کے مختلف پہلوؤں پر انقلابی عوام کے نقطۂ نظر سے تنقید کرنا) جو موجودہ زمانے کے ادیب کو ہر وقت پیش نظر رکھنا ہے۔ اس مقصد کو سامنے رکھ کر جس ادب کی تخلیق کی

جائے گی وہ ایک جان دار منظم اور عظیم الشان ادب ہوگا، جو انقلابی ادب کہلائے گا اور اپنے زمانے کی سچی ترجمانی اور بے لاگ تنقید کا حق ادا کرے گا۔" (ص 64-63)

اختر انصاری انقلابی ادب کو موجودہ زمانے کا حقیقی ادب تصور کرتے اور اسے اصولوں، معیاروں اور قدروں کی اس تبدیلی کا نام دیتے ہیں جو ایک تاریخی ضرورت اور جدلیاتی مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے اور جس میں پرولتاری اور عوامی نقطۂ نظر سے زندگی کی تفسیر و تنقید کی قوت بھی موجود ہوتی ہے۔ 'انقلابی ادب' کی طرح 'اصلاحی ادب' کی اصطلاح بھی ہے، ان دونوں اصطلاحوں کو عموماً ایک ہی سکے کا دو پہلو سمجھا جاتا ہے۔ اختر انصاری کی نظر میں دونوں میں واضح فرق ہے کہ اصلاحی ادب متوسط طبقے کی مخصوص اصلاح پسند، انقلاب دشمن اور مفاہمتی ذہنیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ایک مریض کے جسم پر نکلنے والے پھوڑے پھنسیوں کا علاج مرہم کے ذریعے تو کیا جائے، مگر مریض کے خون میں جو فساد پیدا ہو گیا ہے، اس کی طرف سے بے پروائی برتی جائے۔ اس کے برعکس انقلابی ادب سماجی امراض کے سطحی اور محض اوپری علاج کو بیکار خیال کرتا ہے، اس کی نظر سماجی نظام کے بنیادی نقص پر ہوتی ہے۔ جس کو دور کیے بغیر سطح پر ظاہر ہونے والے لاتعداد نقائص کا ازالہ ممکن نہیں۔ وہ اصلاحی اور انقلابی ادب میں "ترقی پسند" کی صفت کا استعمال جائز قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انقلابی ادب ترقی پسند ہوتا ہے، مگر ترقی پسند ادب ہمیشہ انقلابی نہیں ہو سکتا۔ ان کی نظر میں ہندوستان (ہند و پاک) میں ترقی پسند ادب کی دھوم ہے، لیکن:

"ترقی پسند ادیب محض اصلاحی ادب پیش کر رہے ہیں، اس میں شک نہیں کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کے متعدد اور متنوع پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن اگر ان کی تحریروں کو غور کے ساتھ پڑھا جائے تو یہ بات نہایت آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے کہ وہ اجتماعی زندگی کے مسائل کو عوام کی انقلابی نظر سے نہیں بلکہ متوسط طبقے کی اصلاحی، مفاہمتی، اور جذباتی زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور یوں وہ موجودہ نظام کی برائیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے بھی گویا ان ارتجاعی قوتوں کا ساتھ دیتے ہیں جو اس نظام کی بنیادوں کو جوں کا توں قائم رکھنے کی حامی ہیں۔" (ص 69-68)

یہ ایسی باتیں ہیں، جن کو بیشتر ناقدین نے چند مخصوص ادیبوں کو چھوڑ کر پورے ترقی پسند ادب کے متعلق کہی ہیں، اختر انصاری اس معنی میں سر فہرست ہیں کہ انہیں ادب میں آئی ان خرابیوں کا احساس اس وقت ہو گیا تھا، جب ترقی پسند تنقید شگم زار تھی۔ وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ادیب ترقی پسند تحریک کی روح کو سمجھے بغیر ایسا ادب پیش نہیں کر سکتا، جسے انقلابی یا ترقی پسند ادب کہا جا سکے۔ موجودہ منظر نامے پر جو ادب لکھا جا رہا ہے، اس میں زخموں کی مرہم پٹی کا عمل تو ہوتا ہے، لیکن ان کی جراحی کی کوشش دکھائی نہیں دیتی۔ چنانچہ ایسا ادب اصلاحی، مفاہمتی اور جذباتی تو ہو سکتا ہے، لیکن اسے انقلابی یا ترقی پسند ادب نہیں کہہ سکتے۔ ان کا مطالبہ ہے کہ انقلابی ادیب سماجی زندگی اور اس کے مسائل کو اپنے نقطۂ نظر سے ادب کا موضوع بنائیں اور ہر طبقے کی زندگی، اس کے ہر پہلو کا مطالعہ عوامی اور پرولتاری نقطۂ نظر سے کریں۔

مقصدی یا ترقی پسند ادب کے متعلق یہ خیال بھی عام ہو گیا تھا کہ یہ ادب چونکہ پروپگینڈا ہوتا ہے، اس لیے خشک اور غیر دلچسپ ہوتا ہے، اس میں فنی لطافت، صناعانہ حسن کاری اور جمالیاتی پاکیزگی نہیں پائی جاتی ہے۔ جس کا جواب دیتے ہوئے اختر انصاری کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی ادب 'رجحان' سے خالی نہیں۔ ہر ادب کسی نہ کسی مقصد کی تکمیل اور کسی نہ کسی دبستانِ خیال کا پرچار کرتا ہے، گویا ہر ادب ایک طور پر پروپگینڈا ہی ہوتا ہے، لیکن ہر پروپگینڈا ادب نہیں ہوتا کہ ادیب اپنے تخیل کا تصرف بدرجۂ اتم فکر و فن میں کرتا ہے، جو ادب میں خیالات کی بلندی و ندرت، زبان کی دلکشی و رنگینی، اندازِ بیان کی طرفگی و دلآویزی اور مجموعی اثر انگیزی نیز وجد آفرینی کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں اور یہی خصوصیات ادب کو اصل معنی میں ادب بناتی ہیں۔ وہ ترقی پسند ادب کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"بعض ترقی پسند مصنفین کی تحریریں اعلیٰ فن کارانہ محاسن سے محروم ہیں، ان میں واعظانہ، خطیبانہ اور ناصحانہ انداز غالب ہے، چیخ پکار اور نعرہ زنی کی زیادتی ہے، تبلیغ

اور تلقین کا پہلو نمایاں ہے، جذبات کو متاثر کرنے والی خصوصیات کا فقدان ہے تو قصور مقصدی ادب کا نہیں، بلکہ ان ادیبوں کا ہے، جنھوں نے صناعی محاسن کی اہمیت کو نظر انداز کیا اور اپنے فن کے تمام نازک اور پیچیدہ راستوں سے آگاہی حاصل نہیں کی۔" (ص 71)

چنانچہ اختر انصاری کے نزدیک کامیاب مقصدی ادب ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس میں فن اور مقصد کا بہترین امتزاج پایا جائے، یعنی مقصدی ہونے کے باوجود اصولِ جمالیات کی پیروی کرتے ہوئے فن کے اعلیٰ معیار پر پورا اترے۔

اختر انصاری نے 'افادی ادب' میں شرح و بسط کے ساتھ 'ادب' کو نہ صرف یہ کہ سمجھایا ہے بلکہ اسے گہرے سماجی شعور اور اجتماعی زندگی کا عکاس مانا ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی صعوبتوں کو نہیں بلکہ اس کے اسباب کو موضوع بنا کر اس کی جراحی کی جاتی ہے۔ جو ادیب ایسا نہیں کرتے ہیں، وہ رجعت پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہیں اور کسی نہ کسی سطح پر مادہ پرست طبقوں کو طاقت فراہم کرتے ہیں، جو اس سے محروم طبقے کے استحصال پر مامور ہیں۔ انھوں نے اصلاحی اور انقلابی ادب کے فرق کو سمجھاتے ہوئے ایسے ادیبوں کی سرزنش کی ہے، جو ترقی پسندی کی روح کو سمجھے بغیر ادب کی تخلیق میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کے مطابق اپنے اصل مقاصد سے دور ایسی تحریریں پروپگینڈا تو کہی جا سکتی ہیں، لیکن انھیں ادب نہیں کہا جا سکتا کہ ادب بننے کے لیے فن اور مقصد کے درمیان امتزاج کا ہونا ضروری ہے۔ دراصل 'افادی ادب' کا مقصد و منبع ان خرابیوں پر استوار ہے، جو ترقی پسند تحریک کے ابتدائی زمانے میں ہی در آئی تھی۔ شعرا و ادبا نے ترقی پسندی کی روح کو سمجھے بغیر ادب لکھا اور اس کے فکری و فنی تقاضوں کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ 'افادی ادب' نہ صرف یہ کہ ان پر ضرب لگاتا ہے بلکہ سچے اور کھرے ادب کی خصوصیات کو بھی ذہن نشین کرتا ہے۔ اختر انصاری چونکہ باضابطہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں تھے بلکہ الگ تھلگ بیٹھے اس کے اصول و نظریات کی تشہیر اپنے گراں مایہ تخلیقی و تنقیدی ادب کے ذریعے کر رہے تھے، اس لیے شاید ان کو اور ان کے ادبی قد کو وہ قدر و منزلت نہیں ملی، جس کے وہ مستحق تھے۔

■

Adil Hayat(S. M. Abu Baker)
Department of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:9313055400
Email: adilhayat@gmail.com

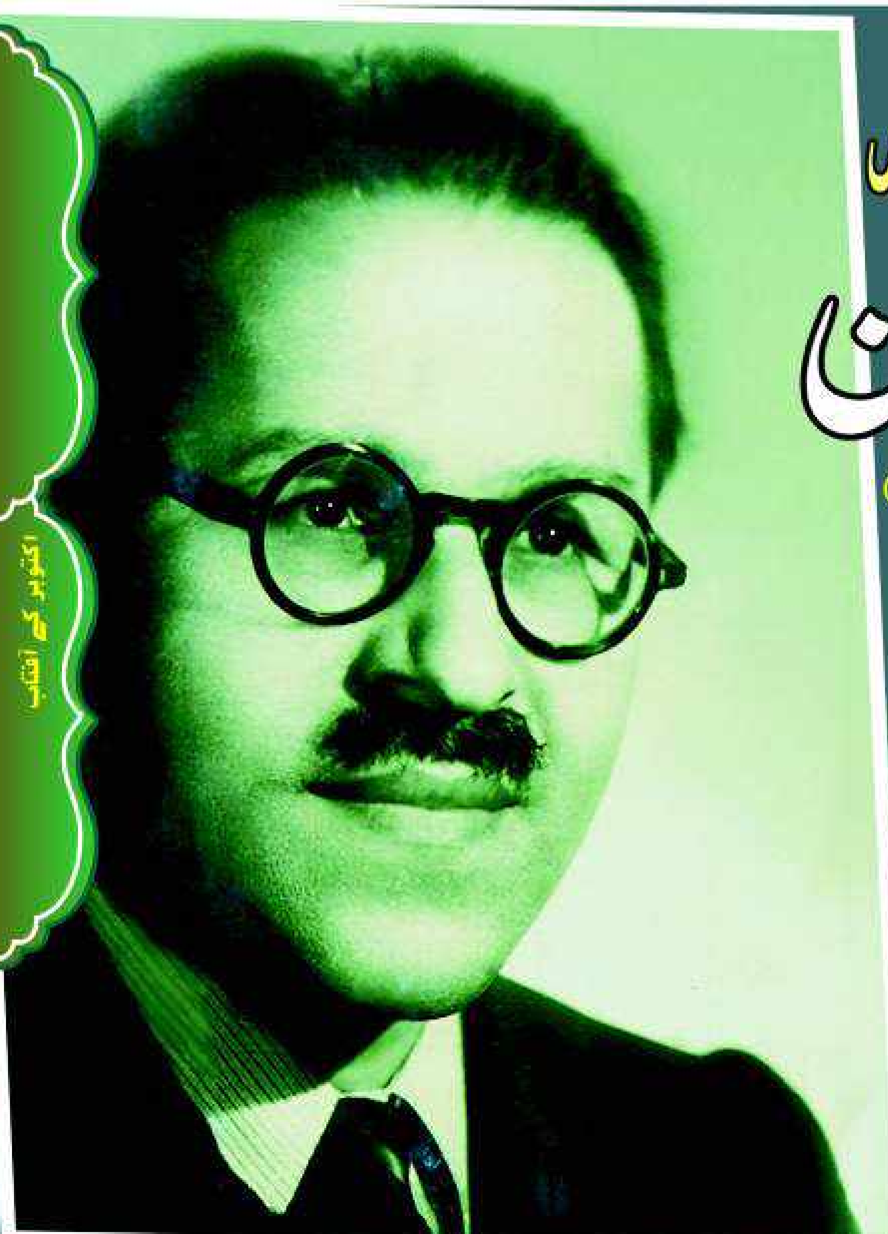

محمد احمد دانش رودانوی

خواجہ غلام السیدین

(14/ اکتوبر 1904 - 19 دسمبر 1971)

خانوادۂ حالی کو بہت امتیاز حاصل ہے۔ اس میں خواجہ الطاف حسین حالی علوم وفنون وادب کے سورج تھے اور دیگر افراد خانہ جن میں خواجہ غلام الحسنین، خواجہ غلام السطین، خواجہ احمد عباس، خواجہ غلام الثقلین، مشتاق فاطمہ، اخلاق حسین، صالحہ عابد حسین، خواجہ غلام السیدین، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی ایسے تابندہ ستارے، جنھوں نے فن شاعری، صحافت، فلم نویسی، تنقید نگاری، سوانح نگاری، خاکہ نگاری وغیرہ علوم وفنون اور ادب کو وہ روشنی دی جس کی کرنوں سے فنون وادب آج بھی جگمگا رہے ہیں۔

خواجہ غلام السیدین بھی انھیں تابندہ ستاروں، نابغۂ عصر اور عبقری شخصیات میں سے ایک ایسا نام ہے جس نے علم وادب، خطابت، سوانح نگاری، خاکہ نگاری، تنقید نگاری، لسانیات اور تعلیم کے میدانوں میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں جس سے وہ نہ صرف خاندان حالی کی علمی وجاہت اور تعلیمی اقدار کے مبلغ کے طور پر جانے گئے بلکہ ملک وقوم کا بھی نام روشن کیا اور چار دانگ عالم میں ان کے زریں کارناموں کے سبب شہرت کا ڈنکا بج رہا ہے۔

خواجہ غلام السیدین کی ولادت 14/ اکتوبر 1904 کو ہریانہ کے معروف علمی و ادبی شہر پانی پت کے محلہ سادات میں خواجہ غلام الثقلین کے یہاں ہوئی جو مولانا حالی کی ہمشیرہ وجیہ النساء کے نواسے تھے اور خواجہ غلام السطین کے بھائی تھے۔ مولانا حالی سے ان کا ایک اور رشتہ بھی تھا کہ ان کی والدہ بیگم مشتاق فاطمہ خواجہ اخلاق حسین کی بیٹی یعنی مولانا حالی کی پوتی تھیں۔

جہاں تک خواجہ غلام السیدین کی تعلیم کا تعلق ہے ان کی ابتدائی تعلیم پانی پت میں ہوئی۔ پانی پت کے ہی مسلم ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کرکے علی گڑھ چلے گئے جہاں موصوف نے گریجویشن کی تعلیم مکمل کی اور اپنی ذہانت اور علمی قابلیت کی بنا پر وظیفہ پاکر انگلینڈ چلے گئے جہاں کی لیڈز یونیورسٹی سے موصوف نے ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔

جہاں تک خواجہ غلام السیدین کی علمی وادبی فتوحات کا تعلق ہے وہ بیک وقت شعلہ نوا خطیب، ماہر تعلیم اور ادیب بے مثل تھے۔

دوران طالب علمی ہی ٹینس کھیلنے سے لے کر تقریری مقابلوں میں حصہ لینے علمی تقاریب میں زور خطابت دکھانے جیسی صلاحیتوں کا اکثر وبیشتر مظاہرہ کیا۔ اپنی علمی و ادبی زندگی میں اپنی لاتعداد کتابوں اور مضامین کی اشاعت کے ذریعے ادب وفلسفہ، سماجیات، مذہب واخلاق، تعلیم و نفسیات اور شخصیات جیسے اہم اور مختلف النوع موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی علمی وادبی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ ان کے تحریر کردہ افسانوں، انشائیوں، سوانحی خاکوں، ریڈیائی تقریروں، کتابوں پر تبصروں، مقدموں اور تنقیدی مضامین میں سادہ، سلیس، شگفتہ اور دلنشیں نثر کا اسلوب ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں تنقید جیسے موضوعات میں بھی روکھے اور سپاٹ پن کا احساس نہیں ہوتا جو ان کے اظہار وبیان پر کامل دسترس رکھنے کا پتہ دیتا ہے۔ ان کے چند افسانوں میں پریم چند رنگ بھی نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کی خودنوشت سوانح جسے بعد میں ان کی بہن صالحہ عابد حسین نے ترتیب دے کر بعنوان 'مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زباں' شائع کروایا تھا کے علاوہ متعدد سیاسی اور علمی شخصیات پر مضامین کا مجموعہ 'آندھی میں چراغ' کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ تفویض ہوچکا ہے۔ اس سے قبل 'روح تہذیب' کے نام سے بھی ان کی ایک اور کتاب شائع ہوچکی تھی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ موصوف کو مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کی صحبتوں اور قرب کا بھی شرف حاصل رہا جس سے ان کے فکر وعمل کو جلا ملی۔ وہ پنڈت جواہر لعل نہرو اور گاندھی جی کے تعلیمی افکار ونظریات سے بہت متاثر تھے۔ اپنی مادر درس گاہ علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بے حد ذہنی وابستگی وقلبی لگاؤ کے سبب ان کی خواہش

تھی کہ وہ علی گڑھ لوٹ آئیں جس کی تکمیل یوں ہوئی کہ آپ کو علی گڑھ ٹریننگ کالج کی زبوں حالی وابتری کے دور میں وائس چانسلر آفتاب احمد خاں کی نگاہ انتخاب آپ پر پڑی اور وائس چانسلر نے ٹریننگ کالج کے آشوب زدہ حالات کے مداوا کے لیے آپ کو ٹریننگ کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ آپ نے اپنے فکر وتدبر اور انتظامی صلاحیتوں سے ٹریننگ کالج کے مخدوش حالات کو بہتر بنایا۔ آپ کی ملازمت کا بیشتر حصہ ڈاکٹر ضیاء الدین وائس چانسلر کے دور میں گزرا لیکن جب سر راس مسعود صاحب نے یونیورسٹی میں وائس چانسلر کا عہدہ سنبھالا تو انھوں نے لیڈز یونیورسٹی یا لندن سے کسی ماہر تعلیم کو بلانے کی خواہش ظاہر کی جس پر جواب ملا کہ آپ خواجہ غلام السیدین جیسی ذی علم اور باصلاحیت شخصیت کے موجود ہوتے ہوئے باہر نظر دوڑا رہے ہیں۔ آپ ان کا انتخاب کیوں نہیں کر لیتے اس طرح لیڈز یونیورسٹی کے ماہرین کے ایما پر 1931 میں بحیثیت پروفیسر آپ کا تقرر عمل میں آیا جہاں وہ اپنی مدت کار علی گڑھ کی تعلیمی تحریک میں سرگرم عمل رہے۔

خواجہ غلام السیدین اپنے خاندان کے علمی وقار اور وجاہت پر فخر کرتے ہوئے اپنی خودنوشت میں رقم طراز ہیں:

''سب سے اہم چیز جس کے لیے میں اپنے خاندان کا شکرگزار ہوں وہ یہ کہ اس نے مجھے ایسے خاندان میں پیدا کیا جس سے بہتر میں خود انتخاب نہیں کرسکتا۔ یہ بات فخر کے ساتھ نہیں بلکہ انکسار کے ساتھ کہنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ نعمت مجھے بغیر کسی استحقاق کے ملی۔''

خواجہ غلام السیدین نے اپنی علمی قابلیت، انتظامی صلاحیت و ذہانت کے سبب ٹریننگ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پرنسپل کے عہدے پر مامور رہنے سے لے کر بحیثیت پروفیسر اپنی خدمات انجام دیتے ہوئے ڈائرکٹر تعلیمات ریاست جموں وکشمیر اور ممبئی میں وزیر اعلیٰ کے تعلیمی مشیر ومرکزی حکومت کے محکمۂ تعلیم میں ایڈوائزر کے عہدوں جیسے اہم مناصب پر تعلیمی خدمات انجام دیں اور اپنی نمایاں خدمات کے سبب پدم بھوشن جیسے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ 1945 میں نواب رامپور کی خواہش پر ریاست رامپور میں مشیر تعلیم کے عہدے پر فائز رہتے ہوئے صرف دو سال کے قلیل عرصے میں موصوف نے ریاست رامپور کے تعلیمی معیار کو بلند کیا اور بعض اہم اور نئی تعلیمی پالیسیاں وضع کیں۔

1947 میں بمبئی کے وزیر اعلیٰ کی جانب سے مقرر ممبئی گورنمنٹ میں تعلیمی مشیر کی حیثیت سے تین سال تک تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد مولانا آزاد کے ایما پر محکمۂ تعلیمات میں جوائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے۔ بعدہٗ محکمۂ تعلیم میں ہی ایڈوائزر کے عہدے پر مامور ہوئے۔ خواجہ غلام السیدین نے مولانا آزاد کے ساتھ محکمۂ تعلیم میں کام کیا۔ بعد ازاں مولانا آزاد نے سیدین صاحب کے ساتھ مل کر ایک نیا تعلیمی نظام قائم کیا۔ اپنے انتظامی مدت کار میں نئے کالجوں اور یونیورسٹی کے قیام، کالج اور یونیورسٹی کی مالی اعانت نئی تعلیمی پالیسیوں کے فروغ میں موصوف کی سعی وکاوش کو ہر جگہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

''انھوں نے اپنے دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور ہندوستان کے دیگر تعلیمی اداروں کی خوب مدد کی۔ نئے کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام اور نئی تعلیمی پالیسیوں کے فروغ اور نفاذ میں کوشاں رہتے تھے اور ہمیشہ نئے منصوبے تیار کرتے رہتے تھے۔

(خواجہ غلام السیدین: سرزمین ہریانہ کا ایک بے مثال ماہر تعلیم از پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی، مطبوعہ سہ ماہی جمنا تٹ ص 8، جنوری تا مارچ 2019)

سیدین صاحب کو تعلیمی اداروں سے بے پناہ انسیت تھی۔ بحیثیت تعلیمی مفکر اور تعلیمی منتظم ان کی خدمات کو ہرگز بھلایا نہیں جاسکے گا۔

1961 میں جب سیدین صاحب وزارت تعلیم سے سبکدوش ہوئے تو گورنمنٹ نے انھیں کشمیر میں ایجوکیشن ایڈوائزر مقرر کیا۔ غلام السیدین صاحب تعلیم کے میدان میں بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ بیرون ممالک کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی انھیں مقبولیت حاصل ہوئی۔ انھوں نے سارک فیلوفاؤنڈیشن کی دعوت پر امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں توسیعی لکچر دیے۔ عالمی مشن برائے عراق ایجوکیشن ایڈوائزر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ آسٹریلیا کے لیے نیو ایجوکیشن فیلوشپ کے بین الاقوامی وفد کے ممبر رہے۔ لندن یونیورسٹی کے علاوہ انھوں نے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور دیگر تعلیمی اداروں میں توسیعی لکچر دیے۔ (ایضاً)

خواجہ غلام السیدین کو ان کی تعلیمی خدمات کے اعتراف میں وطن عزیز ہندوستان میں پدم بھوشن جیسے اہم اعزاز اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دیے جانے کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر ممتاز اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔

''سیدین صاحب کی تعلیمی خدمات کے اعتراف میں حکومت ہند نے انھیں پدم بھوشن کے خطاب سے نوازا۔ 1962 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی۔ سیدین صاحب ایک تعلیمی نظریہ ساز یعنی ایجوکیشن تھیورسٹ کے طور پر تسلیم کیے جانے لگے۔ کولمبیا یونیورسٹی نے اپنی سلور جبلی کے موقعے پر دنیا کے سات ممتاز ماہرین تعلیم کو تمغۂ امتیاز اور سند پیش کی۔ ان ماہرین میں غلام السیدین کا نام بھی شامل تھا۔'' (ایضاً)

ان کی تحریروں میں تدبر وتفکر اور ادبی محاسن کو ادب سے متعلق ان کی ذیل کی ریڈیائی تقریر کے اقتباسات میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے:

''ادب کو محض تفریح اور چاشنی کی غرض سے پڑھنا ایک قسم کی ذہنی عیاشی ہے۔ اکثر لوگ ادب کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں گویا ان کو سماجی زندگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ گویا وہ محض الفاظ اور محاوروں کی خوبی یا تشبیہ واستعارہ کی چاشنی کا نام ہے۔ یہ نقطۂ نظر ادب کی توہین ہے۔ وہ دراصل نہ صرف مصنف کی ذہنی اور جذباتی کیفیتوں کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ ارادی یا غیر ارادی طور پر سماجی زندگی اور اس کے اغراض ومقاصد اور جدوجہد پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ ادب کے مطالعہ کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ طالب علم اس کی مختلف اصناف میں سوسائٹی کے دھڑکتے ہوئے دل کی آواز سنے۔ اس کے عروج وزوال اس کی کامرانی اور ناکامی اور اس کے عیوب اور محاسن کی تصویریں دیکھے۔

ادب ایک فن لطیف ہے اور فن کی ایک سحر حسن کاری ہے۔ دوسرے لوگوں کی طرح ادیب کے دل و دماغ پر بھی اس کے ماحول کے واقعات اور حالات زندگی کے بڑے میں اور ایسے اثر ڈالتے ہیں اور چونکہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ حساس ہوتا ہے، اس کا مشاہدہ زیادہ گہرا اور نظر تیز ہوتی ہے، اس لیے وہ اس اثر کو زیادہ آمادگی کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ اس کے تخیل کی بھٹی میں سے گزر کر وہ ایک ایسی شکل اختیار کرلیتا ہے جس میں وحدت اور یکجہتی ہوتی ہے، حسن اور اثر آفرینی ہوتی ہے۔ جس میں زندگی کا خون جھلکتا اور زندگی کی نبض دھڑکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس وقت آرٹ اور زندگی کی مصنوعی حدیں اٹھ جاتی ہیں اور حسن آئینۂ حق اور دل آئینۂ حسن بن جاتا ہے، اور ادیب کا حسن کلام انسان کے دل اور اس کی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ میں اسی کو اصل ادب کہتا ہوں...''

(تاب زریں اردو ادب اور ہریانہ، سنہ اشاعت: 2017، باہتمام محمد جنسل ڈائرکٹر ہریانہ اردو اکادمی، اکادمی بھون آئی پی 16، سیکٹر 14، پنچکولہ، ہریانہ، ص 150)

■

Mohd Ahmad Danish Ravanvi
Kashany-e-Gulzar
Near Taj Palace, Taj Colony
Raja ka Tajpur
Distt.: Bijnor - 246735 (UP)
Mob.:9759418047

رباعیات اور کلیم عاجز

یاسمین خاتون

کلیم عاجز اردو شعر و ادب کی دنیا کا ایک مایہ ناز نام ہے۔ کلاسیکیت پسندی اور شعری روایات کی پاسداری نے انھیں مروّج اصنافِ ادب میں غزل کے علاوہ جس طرز کی طرف زیادہ مائل کیا وہ رُباعی گوئی ہے۔ عاجز کے شعری مجموعوں کی کل تعداد پانچ ہے جو ایک کلیات کی شکل میں بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ چوتھے مجموعۂ غزلیات 'پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا' میں انھوں نے رُباعی کے عنوان سے ایک دیباچہ سپردِ قلم کیا ہے جس میں 1950 سے 1955 تک کی دستیاب 38 رباعیاں شامل کی گئی ہیں۔ یہ محض چھ برسوں کے درمیان کی رُباعیاں ہیں جب کہ ان کی شاعری اس کے بعد بھی تقریباً ساٹھ برسوں تک اپنی آن بان دکھاتی رہی ہے۔

اردو داں طبقے میں آغاز سے ہی فارسی دانی شعرا کی عزت و تکریم کا سبب رہی جس کے لازمی نتیجے میں فارسی زبان کی تقریباً تمام اصنافِ سخن اردو میں بھی جاری اور مقبول ہوئیں۔ اوّل اوّل رُباعی فارسی میں ہی کہی جاتی رہی لیکن غزلوں کی زبردست مقبولیت کے بعد اردو میں بھی شعرا رباعی پر طبع آزمائی کرنے لگے اور اُردو رباعیوں کا ایک خزانہ جمع ہو گیا۔

روایتی اور کلاسیکی عہد سے ہی شعرا کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ غزلیں سنانے سے پہلے چند رباعیاں شعری محفلوں اور مشاعرہ گاہوں میں ضرور پڑھا کرتے تھے۔ اس کے دو فائدے تھے۔ اوّل یہ کہ غزل کی سماعت سے پہلے شاعر کے لیے ایک مناسب فضا تیار ہو جاتی تھی۔ دوئم یہ کہ اہلِ محفل کو بھی شاعر کے معیار اور قادرالکلامی کا کافی حد تک اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ رُباعی گوئی اکثر شعرا کی پسندیدہ صنف بن گئی۔ میر و غالب، حالی و اکبر، انیس و دبیر اور جوش و فراق سے لے کر امجد و ناوک تک شعرا کی ایک بڑی تعداد رباعی کی زلفیں سنوارتی چلی آئی۔

'ربع' عربی زبان کا لفظ ہے جو 'رباع' سے مشتق ہے۔ اس کے معنی چار کے ہوتے ہیں۔ شاعری کی اصطلاح میں رباعی اس صنفِ شعر کو کہتے ہیں جس میں چار مصرعے یا دو ابیات ہوں اور ان تمام مصرعوں میں فکر و خیال کے لحاظ سے ایک مکمل مضمون ادا کیا گیا ہو۔

رباعی کے آغاز سے متعلق مختلف روایتیں پائی جاتی ہیں لیکن اس بات پر بھی تذکرہ نگار متفق ہیں کہ اس صنف کا موجد غزنہ شہر کا ابوالحسن رودکی ہے۔ تیسری صدی عیسوی میں عربی اور ایرانی شعرا نے عربی کو کافی رواج دیا اور مقبولِ خواص و عوام بنا دیا۔ پہلے پہل یہ چار بیتوں میں لکھی جاتی تھی۔ بعد میں اسے صرف دو بیتوں میں محصور کر دیا گیا۔ منظوم کلام کی یہ ہیئت ایران میں پہلے رباعی پھر دو بیتی اور اس کے بعد ترانہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ آغاز میں رُباعیاں دورِ حاضر کی مانند موجودہ اور طے شدہ اوزان میں نہیں لکھی جاتی تھیں۔

اردو ادب میں رباعی کا آغاز دکن سے ہوا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر کی تصنیف کے مطابق اردو کے پہلے رباعی گو حضرت خواجہ بندہ نواز (1321/1421) گزرے ہیں۔ دکن کے بعد اس صنف کو شمالی ہند میں برتا گیا۔

نظم نگاری کی دوسری ہیئتوں سے موازنہ کریں تو رباعی ہی ایک ایسی ہیئت ہے جو صرف ایک ہی بحر یعنی بحر ہزج اور اس کے بھی مجملہ چوبیس اوزان میں بندھی ہوئی ہے۔ رباعی کے چار مصرعوں میں پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتا ہے۔ اسے خصّی رباعی بھی کہتے ہیں اور یہی رباعی کی اصل شکل ہے۔ اگر اس کا تیسرا مصرعہ بھی ہم قافیہ ہو تو اسے غیر خصّی رباعی کا نام دیا جاتا ہے۔ رباعی کے ہر مصرعے میں چار چار رُکن ہوتے ہیں جو بیس ماتراؤں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان ارکین کو عروضی اصطلاح میں افاعیل کہا جاتا ہے۔ ان کی یہ مقرر تعداد کبھی گھٹتی یا بڑھتی نہیں۔ رباعی کی صنفی شناخت بھی بنیادی طور پر اس کے مخصوص اوزان میں چھپی ہوتی ہے۔ اس کا مقبولِ عام اور سب سے زیادہ استعمال کیا جانے والا وزن 'لاحول ولاقوۃ الا باللہ' ہے۔

کلیم عاجز اپنی تمہید میں رباعی کے اوزان پر اپنی مہارت سے انکار کرتے ہیں اور اس کی نازک ڈگر پر پھسلنے کا خدشہ بھی ظاہر کرتے ہیں۔ وہ مصرعوں میں پنہاں موسیقیت پر بھی اپنی طرف سے کوئی دعویٰ نہیں کرتے بلکہ عجز اور انکسار کا انداز اپناتے ہیں۔

کلیم عاجز نے رباعی کی طرف مائل ہونے کے متعلق تحریر کیا ہے کہ پہلے پہل انھیں امجد حیدرآبادی کی چار رباعیاں رسالے میں پڑھنے کا اتفاق ہوا، تو ان کی ساخت اور کاٹ جیسے ان کے دل میں اُتر گئی۔ اس کے بعد ایک مشاعرے میں نوح ناروی کی رباعیاں سنیں تو ان کا نقش بھی ان کے دل و دماغ پر ثبت ہو گیا۔ اس کے بعد کلیم عاجز نے خود رباعیاں کہنی شروع کیں اور یہ طریقہ اختیار کیا کہ محفلوں یا مشاعروں میں غزل سرائی سے پہلے وہ اپنی چند رباعیاں پڑھتے۔ اس طرح جو فضا سازی ہوتی وہ ان کی غزل کی طرف سامعین کو ہمہ تن متوجہ کر دیتی تھی۔ ان کی ایک رباعی دیکھیں ؎

امید کے ماتھے سے چمک چھوٹ چکی
غفلت کے ستاروں کی لڑی ٹوٹ چکی
انگڑائیاں لے کر اٹھو سونے والو
اب رات کہاں رہی، کرن پھوٹ چکی

عاجز مزید لکھتے ہیں کہ وہ غزل گوئی کی دھن میں اپنی رباعیوں کو تقریباً فراموش کر چکے تھے لیکن اپنی غزلوں کا

چوتھا مجموعہ ترتیب دیتے وقت اچانک انھیں اپنے پسر ڈاکٹر وسیم احمد کے ذریعے بہت سی رباعیاں دستیاب ہوئیں۔ انھوں نے خوش ہوکر انھیں بھی دیباچے کے ساتھ مجموعے میں شریکِ اشاعت کرلیا۔ فرماتے ہیں۔

جو دل پہ گذرتی ہے سنا دیتا ہوں
جو بات بھی کہتا ہوں لٹا دیتا ہوں
اشکوں میں لہو جب سے لگا ہے آنے
ہر شعر کا میں رنگ جما دیتا ہوں

یوں زلف پہ تدبیر بناتے جاؤ
ہر حلقۂ گرہ گیر بناتے جاؤ
جاتے ہو جو دیوانہ بناکر ہم کو
پہنانے کو زنجیر بناتے جاؤ

ان کی رباعیوں کی تعداد اگرچہ 38 ہے مگر آخری کلام رباعی کے وزن میں نہیں ہے۔ بہتر ہوتا کہ قطعہ کے زمرے میں رکھا جاتا۔ پھر اگلے صفحات پر جو متفرق اشعار دیے گئے ہیں، ان میں ایک عدد رباعی بھی شامل ہوگئی ہے۔ اس طرح تعداد 38 برقرار رہتی ہے۔ یہ تمام رباعیاں تحریر کے مطابق 1950 سے 1955 کے دوران کہی گئی تھیں جو محض اوّلین نصف عشرے کی یادگار کہی جاسکتی ہیں جب کہ اگلے چھ عشروں میں کہی گئی کسی رباعی کا ذکر ان کے آخری مجموعے میں بھی نہیں ملتا۔ عین ممکن ہے کہ وہ ان کی بے توجہی کا شکار ہوکر کہیں گم ہوگئی ہوں۔

جہاں تک رباعی کی صنفی ہیئت کا تعلق ہے تو مختصر ہونے کی وجہ سے اس صنف میں جو لفظ بھی استعمال ہوتا ہے وہ علامتی رنگ اختیار کرلیتا ہے۔ رباعی کا آخری مصرعہ ہی اصل کمال کی چیز ہے جو 'لوہار کی ایک' کے

محاورے کی مانند پوری رباعی کو دھماکے دار اور قابلِ توجہ بنا دیتا ہے۔ یہ بات دیگر شعری اصناف میں خال خال ہوتی ہے جب کہ غزل میں اکثر دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رباعی کا کینوس مضمون و معنی کے ساتھ کافی وسیع ہوجاتا ہے۔ یہاں چونکہ وحدتِ فکر، تسلسلِ خیال اور برجستگی مدِ نظر رہتی ہے، اسی لیے شاعر کی فنی صلاحیت کا امتحان بھی ہوجاتا ہے۔

رُباعی میں پہلا مصرعہ اگر کسی خیال کی تمہید ہوتا ہے تو دوسرے اور تیسرے مصرعے سے اس میں توسیع ہونے لگتی ہے اور کچھ اور پہلو جڑنے لگتے ہیں۔ پھر چوتھا مصرعہ خیال کو انتہا تک پہنچاکر قولِ فیصل کا کردار ادا کرتا ہے۔ کلیم عاجز کی یہ رباعی دیکھیں۔

مے پینے سے دل قوی ہو جاتا ہے
ڈھل ڈھل کے یہ آئینہ جلی ہو جاتا ہے
آ جاتی ہے کچھ ایسی زباں میں طاقت
جو منھ سے نکلتا ہے وہی ہو جاتا ہے

رباعی میں موضوعات کی تلاش کا معاملہ غزلوں کے اشعار کی طرح انفرادی ہوتا ہے۔ دیگر نظموں کی ہیئتوں مثلاً مرثیہ، سہرا، شہرآشوب وغیرہ کی مانند یہاں موضوع مقرر یا طے شدہ نہیں ہوتے۔ کوئی بھی خیال، جذبہ، احساس، مشاہدہ، تفکر یا تخیل کو بطور موضوع برتا جاسکتا ہے۔ رباعی فلسفیانہ، حکیمانہ، صوفیانہ، اخلاقی، عشقیہ یا مزاحیہ بھی ہوسکتی ہے اور سماجی، سیاسی، تہذیبی یا اقداری پہلو سے مملو بھی ہوسکتی ہے۔ جدید موضوعات مثلاً تانیثیت، صارفیت، عالمیت وغیرہ بھی کچھ اس کے موضوعات بن سکتے ہیں۔ اس میں دکنی یا شمالی کی بھی تخصیص نہیں ہوتی۔

کلیم عاجز کی رباعیات کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کا زیادہ تنوع نہیں پایا جاتا۔ روایتی موضوعات سے کسبِ فیض کرتے ہوئے انھوں نے زیادہ تر رندی، مے خواری اور ساقی وغیرہ کے علامتی پیرائے میں اپنی رباعیاں کہی ہیں۔ چند دیگر موضوعات میں جوانی کے ضائع ہونے کا افسوس، کشمکشِ غمِ حیات کا افسانہ، زمانے کے ستم، دل شکنی اور خود پر بیتے ہوئے ظلم وجبر کی داستان اور قلبِ حزیں کے ساتھ اپنی انفرادیت کا احساس وغیرہ خاص ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے عاجز کی کچھ منتخب رباعیاں ذیل میں پیش ہیں۔

خمریات

مے آج وہ بے مثال دینا ساقی
رندوں کی ہوس نکال دینا ساقی
سب پوچھتے ہیں عروجِ مستی کیا ہے
ساغر تو ذرا اچھال دینا ساقی

دن رات ہے توبہ یہ تباہی توبہ
شب بادہ کشی و صبح گاہی توبہ
گھبرا کے میر جرأتِ رندانہ سے
توبہ بھی پکار اٹھی الٰہی توبہ

عمرِ گذشتہ

وہ جوش نہ وہ گرم زبانی دل کی
بلبل میں کہاں شعلہ بیانی دل کی
چھاتی نہیں آنکھوں میں پھولوں کا شباب
پھرتی ہے نگاہوں میں جوانی دل کی

کیا بندگی کیا بندہ نوازی اے دوست
محمودی ہے باقی نہ ایازی اے دوست
رخصت ہوئی دنیائے حقیقت کی بہار
اب رہ گئی افسانہ طرازی اے دوست

بیدادِ زمانہ

گلشن کی ہوا زار ہوئی جاتی ہے
پھولوں کی نظر خار ہوئی جاتی ہے
جو شاخ کبھی جھک کے گلے ملتی تھی
کھنچ کر وہی تلوار ہوئی جاتی ہے

عاجز ہر اک افتاد سناتے جاؤ
حالِ دلِ ناشاد سناتے جاؤ
پرواہ نہیں داد ملے یا نہ ملے
تم شکوۂ بیداد سناتے جاؤ

عاجز کی رباعیوں کا موضوعاتی دائرہ اگرچہ زیادہ وسیع نہیں لیکن ان کے اسلوب، انتخابِ الفاظ اور روانی سے بھرے ہوئے انداز نے فکروفن کی کسوٹی پر انھیں کھرا اُتار دیا ہے۔ ان کی تخلیقی جہت میں ان کی شخصیت کا پرتو ضرور جھلکتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر آسان لفظوں اور روزمرہ سے قریب کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ فارسی گوئی کے باوجود اردو میں وہ اپنی فارسی دانی کا مظاہرہ کرنے سے اجتناب برتتے ہیں۔ ادائے مطلب کے لیے سادگی و پرکاری اور ترسیل کی کامیابی ان کی نظر میں اصل اہمیت رکھتی ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ کلیم عاجز کا شمار گذشتہ صدی کے اچھے رباعی گویوں میں کیا جانا چاہیے۔

■

Dr. Yasmin Khatoon
Guest Faculty, Deptt. of Urdu
Maulana Mazharul Haque Arabic & Persian University, Patna-1
E-mail : - dryasminkhatoon@gmail.com

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد
شخصیت و شاعری

سفیان احمد انصاری

اردو مشاعروں کی دنیا میں منفرد لب و لہجے کی نظامت کے لیے مشہور نثر نگار، قلم کار اور مصنف، بے باک مقرر اور صحافی، ایک کامیاب اور بلند پایہ شاعر، عظیم نقاد، ادبی رسالہ ''امکان'' کے مدیر، تحریک اردو رابطہ کمیٹی کے قائد اور ایک کامیاب معلم واستاد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد، ماضی کے فیض آباد اور حال کے امبیڈکر نگر کے ایک معروف قصبہ کچھوچھہ سے متصل ایک چھوٹے سے گاؤں میں ملک عبداللہ کے چھوٹے فرزند ملک محمود احمد کے گھر 17 اکتوبر 1929 کو متولد ہونے والے چار اولاد میں سب سے بڑے تھے، چونکہ ان کے والد گورکھپور میں ملازم تھے، اس لیے ملک زادہ منظور احمد نے ابتدائی تعلیم سے لے کر پوسٹ گریجویشن تک گورکھپور ہی میں حاصل کی، 1941 میں مڈل، 1951 میں تاریخ میں ایم، اے کیا، ہسٹری کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی پوسٹ گریجویشن کیا، پھر پہلے گنیش شنکر ودیارتھی اسمارک انٹر کالج میں ٹیچر، پھر شبلی کالج اعظم گڑھ میں لیکچرار رہے، 1964 میں گورکھپور یونیورسٹی میں اردو کے لیکچرر، پھر 1968 میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لیکچرر، لیکچرر سے ریڈر اور ریڈر سے پروفیسر ہوکر 1990 میں ضابطے کے مطابق ساٹھ سال کی عمر میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔[1]

ملک زادہ منظور احمد کے قلمی سفر کا آغاز ماہنامہ 'نکہت' میں مزاحیہ مضمون 'کھٹمل' سے ہوا، ماہنامہ 'نکہت' کا پہلا شمارہ جولائی 1948 میں منظر عام پر آیا تھا اور کم وبیش دس سالوں تک نکلتا رہا، جس میں 1954 تک پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کے تقریباً دو درجن افسانے شائع ہوئے۔[2]

اسی طرح 'کالج گرل' نامی افسانہ 'باغی کی ڈائری' اور 'باغی کے خطوط' ہر اردو کے 26 ادبا وشعرا کے حیات و کارناموں پر مشتمل 'شہر سخن' نامی تصنیف 'مولانا ابوالکلام آزاد فکر و فن' پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ کے علاوہ 'غبار خاطر کا تنقیدی جائزہ'، 'مولانا آزاد: الہلال کے آئینے میں'، 'انتخاب غزلیات نظیر' غزلوں اور نظموں پر مشتمل اکلوتا شعری مجموعہ 'شہر ستم'، 'رقص شرر' جیسی علمی اور ادبی خودنوشت، اور دو سو سے زائد کتابوں پر پیش لفظ تحریر فرما کر آسمان قرطاس وقلم پر اپنا نام درج کروایا، اپنی انھیں تخلیقات وتصنیفات کے ذریعے پروفیسر ملک زادہ منظور احمد آج بھی دنیائے علم وادب میں زندہ وتابندہ ہیں۔

پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی علمی وادبی خدمات اور کارناموں کے ساتھ ساتھ زبان وادب کی بقا کے لیے جد وجہد اور سعی وکوشش کو زمانہ کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ اردو زبان وادب کی خدمت ملک زادہ کے خمیر میں رچی بسی تھی تو غلط نہ ہوگا۔ تحفظ اردو اور بقاء اردو کے سپہ سالار تھے، حتی کہ لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے بحیثیت پروفیسر ریٹائر ہونے کے بعد اردو کے گم شدہ حقوق کی بازیافت کے لیے آل انڈیا اردو رابطہ کمیٹی تشکیل دیا جس کے پلیٹ فارم سے اردو کے فروغ، تحریک، ترویج اور اس کا جائز وآئینی حق دلانے کے لیے ہمیشہ ایک مجاہد کی طرح ڈٹے رہے اور اردو کی لڑائی لڑتے رہے، گویا انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو کے تحفظ وبقا کے لیے وقف کردیا تھا، اس طرح گویا ملک زادہ صاحب کی ذات گرامی فنافی الاردو تھی۔

پروفیسر ملک زادہ صاحب جہاں ایک اچھے نثر نگار تھے وہیں ایک عظیم اور بلند پایہ شاعر بھی تھے، موصوف کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کم سخنی، زود گوئی پر حاوی تھی، اگرچہ چھیالیس تخلیقات پر مشتمل ایک ہی شعری مجموعہ 'شہر ستم' کے نام سے 1991 میں شائع ہوا، جس میں پینتیس غزلیں اور گیارہ نظمیں ہیں۔[3] لیکن تنہا یہی مجموعہ ملک زادہ کو ایک کامیاب اور عظیم ترین شاعر تسلیم کرانے کے لیے کافی ہے جیسا کہ خود انھیں کے دانشورانہ اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ:

''کسی شاعر کو زندہ رکھنے کے لیے اس کا ایک ہی شعر کافی ہوسکتا ہے۔''

علی سردار جعفری ملک زادہ کے شعری مجموعے 'شہر ستم' کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

''ان کے سارے الفاظ اور استعارے جانے پہچانے ہیں لیکن ان کے استعمال میں ایک ندرت اور تازگی ہے، خوف جو آج کی شاعری کا اہم موضوع بن گیا ہے ملک زادہ کے اشعار میں بھی جھلکتا ہے لیکن ان کو پڑھ کر دل پر خوف طاری نہیں ہوتا بلکہ ایک لطیف احساس بن جاتا ہے، یہ ان کے کلاسیکی ریاض کا اثر ہے اور غالب کی عطا کی ہوئی میراث ہے۔''[4]

آگے لکھتے ہیں:

''ملک زادہ منظور احمد کی شعری تربیت کلاسیکی ہے اور ان کا ذوق آج کے عہد کی رومانیت سے بھی آشنا ہے، ان دونوں کیفیات کا امتزاج چھوٹی چھوٹی خوبصورت غزلوں کی شکل میں نمایاں ہوا ہے۔''[5]

'شہر ستم' میں پہلی نظم کے طور پر یہ اشعار دیکھیے۔

ہمارے شعروں میں مقتل کے استعارے ہیں
ہماری غزلوں نے دیکھا ہے کوچۂ قاتل
صلیب و دار پہ غزلیں ہماری لٹکی ہیں
ہماری فکر ہے زخمی، لہولہان ہے دل
ہر ایک لفظ پریشاں، ہر ایک مصرع اُداس
ہم اپنے شعروں کے مفہوم پر پریشاں ہیں[6]

ان اشعار کے متعلق پروفیسر شارب ردولوی فرماتے ہیں:

''یہ اشعار اس نظم کا حصہ ہیں جسے انھوں نے ابتدائیہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہ پوری نظم ان کے فکری زاویوں کی علامت ہے، اس نظم کا ایک ایک مصرع اپنے زمانے کے سیاسی ومعاشرتی حالات کی تصویر ہے۔ یہ نظم اردو میں علامتی اظہار کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ یہ کسی ایک عہد یا زمانۂ شاعر تک محدود نہیں ہے۔ یہ نظم ہر اس عہد کی تصویر پیش کرتی ہے جہاں ظلم ہے، زیادتی ہے، ناانصافی ہے۔ اگر پچھلے ساٹھ ستر سال کی تاریخ کو سامنے رکھیں یا اور پیچھے پہلی جنگ آزادی تک چلے جائیں تو نظم کا ہر لفظ، ہر استعارہ اور ہر علامت آپ کو ظلم وستم کی ایک نئی کہانی سناتی نظر آئے گی، اور فکر کب اور کس طرح 'لہولہان' ہوتی ہے اس کا مفہوم واضح ہوجائے گا۔ آج بھی حالات وہی ہیں۔ آج کے شاعر کی فکر بھی 'لہولہان' ہوتی ہوگی لیکن

اس کا لہجہ بدل چکا ہے، ملک زادہ کا عہد اور تھا۔

ملک زادہ منظور احمد نے اس نظم کو جس طرح ختم کیا ہے، وہ ان کی امن پسندی، مذہبی و قومی یکجہتی اور ان کے محبت دوستی کے جذبے کی ترجمان ہے۔ ایک طرف یہ نظم ملک کے بدترین فسادات کا اشاریہ ہے، اس کی علامتیں، اس کی تراکیب اور الفاظ پر اگر توجہ دیں تو محسوس ہوتا ہے کہ فصیل دار، سروں کے چراغ، رقص جنوں، دریدہ پیرہنی، چاک دامنی، وحشت برق، آشیاں، صیاد ایک ایسے شدید ہیجانی دور کی تصاویر پیش کرتے ہیں جس پر تاریخ بھی شرمندہ ہوگی لیکن نظم یہاں ختم نہیں ہوتی۔ یہی اس کی خوبی ہے کہ وہ محبت کی کاشت کرتی ہے اور ایک بہت خوبصورت دعا پر ختم ہوتی ہے۔

خدا کرے کہ جو آئیں ہمارے بعد کے لوگ
ہمارے فن کی علامت کو وہ سمجھ نہ سکیں
چراغ دیر و حرم سے کسی کا گھر نہ جلے
نہ کوئی پھر سے علامات خوں چکاں لکھے

یہاں پر نظم کا یہ رخ توجہ طلب ہے انھوں نے صرف دعا نہیں کی کہ آنے والا زمانہ محبت و دوستی اور صلح و آشتی کا زمانہ ہو بلکہ ایسی یگانگت، رواداری، اور محبت کا زمانہ ہو کہ وہ ہماری ان ملاقات اور اشعار کو سمجھ بھی نہ سکیں کہ جو ایک ایسے موسم کی یاد دلاتے ہیں جو نفاق اور تعصب یا دشمنی کا زمانہ تھا اور نہ پھر کسی کا گھر جلے، اور نہ کوئی اور روایات رفتگاں اور علامات خوں چکاں لکھے۔ یہ نظم منظور احمد کے جذبے اور نظریے دونوں کی ترجمان ہے۔'' 7

'شہر ستم' کی ہر غزل روانی و سلاست، حسن زبان و بیان کے اعتبار سے کلاسیکی شاعری کا درجہ رکھتی ہے، تمام تر اصطلاحات، ترکیبات ولفظیات ان کی غزلوں میں جلوہ گر ہیں، اسی طرح ترقی پسند افکار، اعلیٰ نظریات اور توانا احساسات وجذبات ان کے اشعار کی خاص پہچان ہے، تلخیٔ زمانہ کا ذکر ان کی غزلوں میں جا بجا نظر آتا ہے، جیسا کہ درج ذیل اشعار میں ملاحظہ فرمائیے۔

گرتے خیمے، جلتی طنابیں، آگ کا دریا، خوں کی نہر
ایسے منظم منصوبوں کو دوں کیسے آفات کے نام

پروفیسر ملک زادہ صاحب کے اشعار میں مفاہیم کی جدّت، خیالات کی ندرت اور افکار کی وسعت کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں اور نظموں میں آفاقیت اور ہمہ گیریت بدرجۂ اتم موجود ہے، جیسا کہ درج ذیل شعر دیکھیے۔

وہی قاتل، وہی منصف، عدالت اس کی، وہی شاہد
بہت سے فیصلوں میں اب طرفداری بھی ہوتی ہے

حالات زمانہ کی صحیح اور سچی ترجمانی کرتے ہوئے عدل وانصاف کا بھرم رکھنے والوں کو آئینہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دیکھوگے تو ہر موڑ پہ مل جائیں گی لاشیں
ڈھونڈوگے تو اس شہر میں قاتل نہ ملے گا
دریا میں تلاطم ہو تو بچ سکتی ہے کشتی
کشتی میں تلاطم ہو تو ساحل نہ ملے گا
اس شہر ستم میں پہلے تو منظور بہت سے قاتل تھے
اب قاتل خود ہی مسیحا ہے یہ ذکر برابر ہوتا ہے

ملک زادہ صاحب کی شاعری میں بنیادی احساس، انسان دوستی، محبت، تعلق، اپنائیت اور مساوات بکثرت موجود ہے، ساری دنیا ان کے نزدیک ایک خاندان کی حیثیت رکھتی ہے، ان کا یہ تصور ان کی غزلوں میں صاف جھلکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

عجیب درد کا رشتہ ہے ساری دنیا میں
کہیں ہو جلتا مکاں اپنا گھر لگے ہے مجھے
الجھن، گھٹن، ہراس، تپش، کرب، انتشار
وہ بھیڑ ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے
محفل محفل دار کا چرچا، مجلس مجلس ذکرِ رسن
مقتل مقتل خونِ شہیداں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
دشنۂ ابرو، خنجرِ مژگاں، کل بھی تھا اور آج بھی ہے
خون سے رنگیں دامنِ جاناں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
بستی بستی ظلمِ فراواں کل بھی تھا اور آج بھی ہے
امن وسکوں اک خوابِ پریشاں کل بھی تھا اور آج بھی ہے

ملک زادہ صاحب کے یہ اشعار اپنے زمانے کا شکوہ بھی کر رہے ہیں اور کرب واذیت کے اس درد کا اظہار بھی، جسے دوسرے لفظوں میں شاید ظاہر کرنا مشکل ہو۔

ملک زادہ صاحب نے اپنی زندگی میں مختلف اتار، چڑھاؤ، نشیب وفراز دیکھے ہیں جن کا ذکر انھوں نے اپنے اشعار میں بھی جا بجا کیا ہے، بلکہ حالات اور ستم رانیوں کا ذکر ان کی غزلوں میں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ عشق کے ذکر پر بھی حالاتِ زمانہ کا پرتو سایہ فگن ہے۔

کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں، دونوں میری ذات کے نام
ایک غزل منسوب ہے اس سے، ایک غزل حالات کے نام
موجِ بلا دیوارِ شہر پہ اب تک جو کچھ لکھتی رہی
میری کتابِ زیست کو پڑھیے درج ہیں سب صدمات کے نام

اس طرح ملک زادہ منظور احمد کی شاعری تعداد اور کمیت کے اعتبار سے اگرچہ کم ہے لیکن کیفیت اور معنویت کے اعتبار سے کسی دیوان سے کم نہیں ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار دیکھیے۔

سُرخیِ لب کے رنگِ قبا کے نقشِ حنا کے خواب نہ پوچھ
وقتِ سحر تعبیر میں ہم نے خونِ رگِ دل دیکھا ہے
زنداں زنداں شورِ سلاسل، گلشن گلشن شورشِ گل
اب کے برس منظور نے طوفاں ساحل ساحل دیکھا ہے
علاجِ زخمِ دل ہوتا ہے، غم خواری بھی ہوتی ہے
مگر مقتل سے میرے خوں سے گل کاری بھی ہوتی ہے

اب خون کو مَے، قلب کو پیانہ کہا جائے
اس دور میں مقتل کو بھی مَے خانہ کہا جائے
ہر ہونٹ کو مرجھایا ہوا پھول سمجھیے
ہر آنکھ کو چھلکا ہوا پیانہ کہا جائے
گلشن میں تار تار ہے کیوں گُل کا پیرہن
کب تک چلے گی بادِ خزاں کچھ جواب دو

شاعر جب قوم و وطن کو قابلِ اطمینان حالت میں نہیں پاتا تو اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور ہر تڑپ، درد، خلوص اور جذبۂ حب الوطنی میں ڈوبی ہوئی ایک نظم بن جاتی ہے، آپ ملک زادہ کی نظموں کو پڑھیے تو ضرور میری ہم نوائی کریں گے، ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

جیون کی اندھیری راہوں پر، ہم دیپ جلایا کرتے ہیں
آکاش کے جھلمل تاروں پر، نظریں بھی اٹھایا کرتے ہیں
آدرش کے پھولوں کی خاطر، کانٹوں میں گذارا کرتے ہیں
دنیا کو سُکھی رکھنے کے لیے، دکھ، درد، گوارا کرتے ہیں
جب آنچ وطن پر آتی ہے، تلوار اُٹھایا کرتے ہیں
گیتا سے سبق بھی لیتے ہیں، قرآں کی زباں بھی رکھتے ہیں
گوتم کی صدا، نانک کی کتھا، چشتی کی اذاں بھی رکھتے ہیں
ٹیپو کا علم بھی ہاتھ میں ہے، ارجن کی کماں بھی رکھتے ہیں
منظور بتادو دنیا کو، ہم عزمِ جواں بھی رکھتے ہیں
جب آنچ وطن پر آتی ہے، تلوار اُٹھایا کرتے ہیں[8]

ان اشعار کا ایک ایک لفظ امن، شانتی، قومی ایکتا، آپسی میل جول، اتحاد واتفاق کے پیغام اور حب الوطنی کے جذبے سے معمور ہے۔ ان اشعار میں حُبِّ وطن بھی ہے، قومی یکجہتی بھی، بھائی چارہ اور ہندوستانی تہذیب کا خوبصورت نظارہ بھی۔ ملک زادہ منظور احمد کے اندر حب الوطنی، اور وطن کے لیے کس قدر تڑپ تھی؟ ان اشعار سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی غزلوں اور نظموں میں ملک کے حالات کی منظر کشی، قوم کی زبوں حالی، امن و ایکتا، قومی یکجہتی، بھائی چارہ، اتحاد واتفاق اور ملک کی تعمیر وترقی کی روشن تصاویر اور فرحت بخش مناظر دیکھے جاسکتے ہیں۔

حوالہ جات:

1,2,3. اردو کا ایک عظیم مجاہد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد: شفیق احمد باغبان، ملخصا صفحات متفرقہ
4,5. دیباچہ شہر ستم: ملک زادہ منظور احمد، ص7
6. ملک زادہ منظور احمد: انور جلال پوری، ص222
7. شہر ستم: ملک زادہ منظور احمد، ص9
8. شہر ستم: ملک زادہ منظور احمد، ص71.72

■

Sufyan Ahmad Ansari Qasmi
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Lucknow, Lucknow - 226007 (UP)
Mob.:9839574196

انسان دوستی کا پیغامبر
آنند نرائن ملا

محمد افضل خان

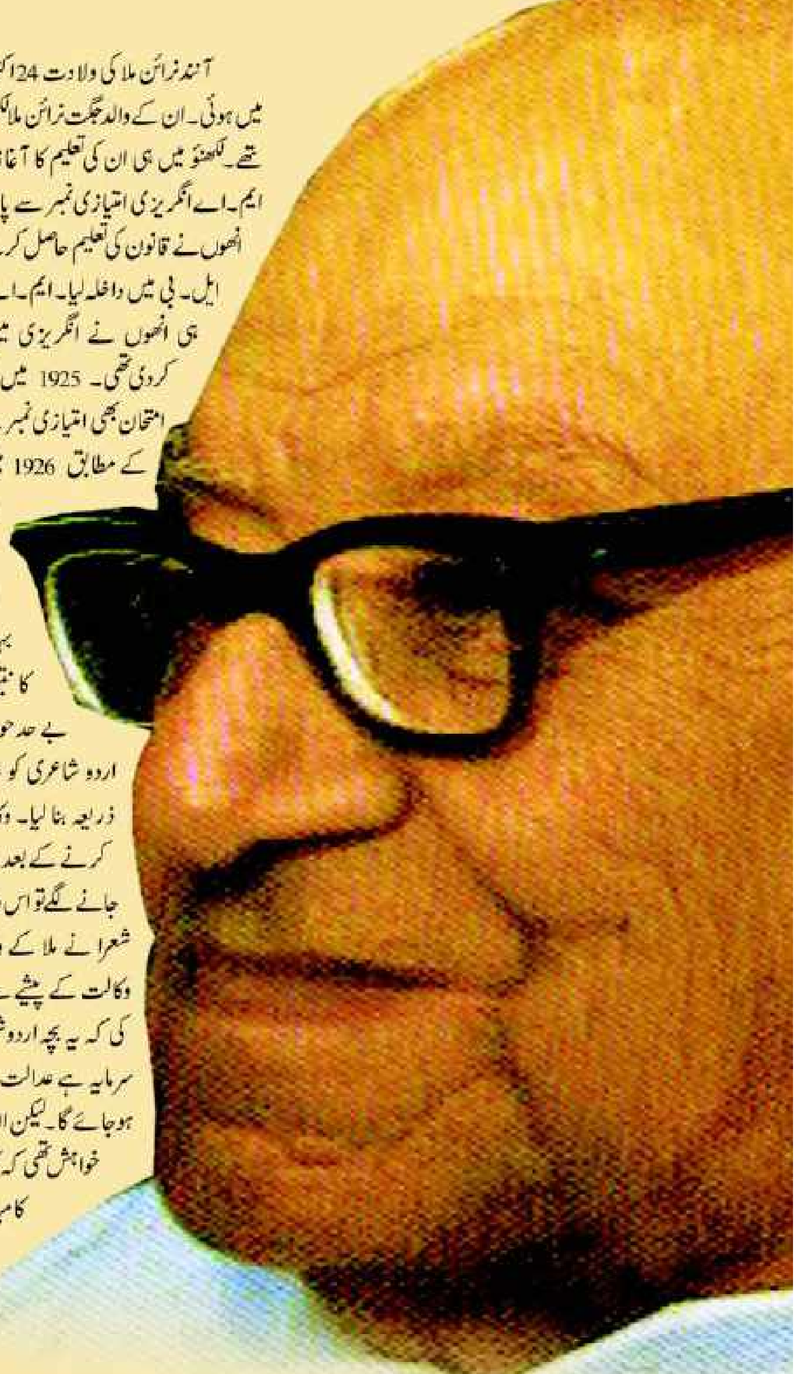

آنند نرائن ملا کی ولادت 24 اکتوبر 1901 کو لکھنؤ میں ہوئی۔ ان کے والد جگت نرائن ملا لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے۔ لکھنؤ میں ہی ان کی تعلیم کا آغاز ہوا۔ 1923 میں ایم۔اے انگریزی امتیازی نمبر سے پاس کرنے کے بعد انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایل۔ ایل۔ بی میں داخلہ لیا۔ ایم۔اے کے زمانے میں ہی انھوں نے انگریزی میں شاعری شروع کردی تھی۔ 1925 میں ایل۔ ایل۔ بی کا امتحان بھی امتیازی نمبر سے پاس کرلیا۔ ملا کے مطابق 1926 میں نظم نگاری سے اردو میں شاعری کا انھوں نے آغاز کیا جسے بہت سراہا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں بے حد حوصلہ ملا اور ملا نے اردو شاعری کو ہی اظہار خیال کا ذریعہ بنا لیا۔ وکالت کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب اس پیشے میں جانے لگے تو اس وقت کے ممتاز اردو شعرا نے ملا کے والد سے یہ کہہ کر وکالت کے پیشے سے روکنے کی کوشش کی کہ یہ بچہ اردو شعر و ادب کا قیمتی سرمایہ ہے عدالت جانے سے ضائع ہوجائے گا۔ لیکن ان کے والد کی دلی خواہش تھی کہ آنند نرائن ملا ایک کامیاب وکیل بنے چنانچہ وکالت کا پیشہ جوائن کرادیا۔ اپنی محنت، صلاحیت اور ایمان داری کی بدولت وہ 1954 میں الہ آباد ہائی کورٹ کے جج بن گئے۔ 1961 کو ملازمت سے سبک دوش ہوگئے۔

آنند نرائن ملا کے آبا و اجداد چونکہ کشمیری پنڈت تھے جو کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنؤ آباد ہوگئے تھے اسی لیے ان کو اردو زبان و ادب سے طبعی لگاؤ تھا۔ چنانچہ انگریزی زبان و ادب سے اپنی تعلیم کا آغاز کرنے اور ماسٹر ڈگری امتیازی نمبر سے پاس کرنے کے بعد بھی اردو کے ہو کر رہ گئے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ ملا انگریزی ادب میں کمزور نہیں تھے۔ محض بائیس سال کی عمر میں انگریزی میں شعر بھی کہنے لگے تاہم اردو کی طبعی کشش نے ان کا رخ اردو کی جانب موڑ دیا۔ اس کے بعد ملا نے اردو شاعری کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ 1949 میں 'جوئے شیر' نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا۔ جس نے ان کے شعری و ادبی سفر کو استناد بخشا۔ چار سو آٹھ صفحات پر محیط یہ ضخیم مجموعہ ہے جس کا دیباچہ آل احمد سرور نے تحریر کیا ہے۔ اس مجموعے میں کلام کو سال بہ سال ترتیب وار رکھا گیا ہے جس سے ملا کے ذہنی و فکری ارتقا کو سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ ملا کی شعری لطافت اور انفرادیت کے بارے میں آل احمد سرور کہتے ہیں'' 1935 تک ملا کی غزلوں اور نظموں میں انفرادیت نہیں آئی ان میں تازگی، شگفتگی اور لطافت ہے مگر کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ہمیں چونکا دے۔ 1935 کے بعد ملا کے فکر و فن میں انسان دوستی کا جذبہ ایسی گہرائی اور گیرائی اور ایک ایسی قوت شفا پیدا کردیتا ہے کہ اس کی طرف نگاہیں فوراً اٹھ جاتی ہیں۔''[1] پہلے مجموعے کی اشاعت کے دس سال بعد'' کچھ ذرے کچھ تارے'' (1959) کے نام سے دوسرا مجموعہ شائع ہوا۔ چار سال کے بعد تیسرا شعری مجموعہ 'میری حدیث عمر گریزاں' (1963) کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ابتدا میں مختصر تعارف پھر اس کے بعد مقدمے کی جگہ قارئین کے نام ایک خط لکھا ہے ملا نے۔ جس میں شعر و ادب کے تئیں

اپنے خیالات کو واضح کیا ہے۔ اس کے دس سال کے بعد 'سیاہی کی ایک بوند' (1973) کے نام سے چوتھا مجموعہ آیا۔ ملا کا نظریہ تھا کہ فن کار کے قلم کی 'سیاہی کی ایک بوند' شہید کے خون سے بہتر ہے۔ 'خون شہید سے بھی ہے قیمت میں کچھ سوا فن کار کے قلم کی سیاہی کی ایک بوند' اسی شعر اور نظریہ کی مناسبت سے اس مجموعہ کا نام 'سیاہی کی ایک بوند' رکھا گیا۔ 'کرب آگہی' کے نام سے پانچواں شعری مجموعہ 1977 میں اور چھٹا شعری مجموعہ 'جادۂ ملا' 1988 میں شائع ہوا۔ نثر میں ملا کے خطبات اور خیالات کا مجموعہ 'کچھ نثر میں بھی' کے عنوان سے 1978 میں شائع ہوا۔ ملا کی کل ادبی کائنات یہی چھے شعری مجموعے اور ایک نثری نمونہ ہیں۔ تاہم ان میں فکر وفن اور علم وآگہی کا ایک سمندر ہے اور انسانیت کے لیے نسخہ حیات۔

ملا کو جیتے جی سب کچھ ملا جس کے وہ حق دار تھے۔ عزت، شہرت جاہ وحشمت اور منصب کسی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مختلف اداروں نے اعزازات دیے۔ اترپردیش حکومت نے 1959 میں آنند نرائن ملا اور فراق گورکھپوری کو مشترکہ طور پر غالب ایوارڈ سے نوازا۔ 'میری حدیث عمر گریزاں' پر 1964 میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ اور 1989 میں فخرالدین علی احمد ایوارڈ دیا گیا۔ 1969 میں انجمن ترقی اردو ہند کے صدر منتخب ہوئے اور مسلسل دس سال تک اس عہدے پر رہے۔ اس دوران اردو کی تعمیر وترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ 1967 میں ملا نے عملی سیاست میں حصہ لیا اور لکھنؤ سے لوک سبھا کا الیکشن کانگریس کی طرف سے جیت کر انسانیت کی نمائندگی کی اور پانچ سال کامیابی سے گزارنے کے بعد راجیہ سبھا کے رکن بنائے گئے۔ کل ملا کر سیاست میں بھی ملا نے اپنی کامیابی کے پرچم لہرائے۔

اردو کے تقریباً تمام شعرا نے غزل گوئی سے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ حتیٰ کہ اقبال اور جوش جیسے عظیم نظم نگاروں نے بھی غزل گوئی سے ہی شعری میدان میں قدم رکھا تاہم آنند نرائن ملا نے اس عام روش سے انحراف کرتے ہوئے نظم نگاری سے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور سب سے پہلی نظم 'پرستار حسن' کے عنوان سے لکھی۔ اس نظم کے بارے میں خلیق انجم کہتے ہیں "...اس میں معنویت بھی ہے اور فکری عنصر بھی اس نظم میں اظہار کی جو پختگی، لہجے کی متانت اور بیان کی جو تازہ کاری ہے وہ بے شمار شاعروں کو مدتوں مشق سخن کے بعد بھی نصیب نہیں ہوتی۔"[2]

ملا کی نظموں اور غزلوں میں فکر وآگہی کی سطح پر نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ اس عہد کے لکھنؤ میں جہاں خارجی معاملات اور داد وعیش کی گونج تھی ملا نے داخلی معاملات اور انسانی کرب کو موضوع بنایا۔ غزلوں میں عام حسن وعشق کے بجائے انسانی اقدار کو پیش کیا۔ 'کرب آگہی' کے دیباچے میں گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں: "غزل کو ملا محدود معنی میں نہیں لیتے، ان کا شعری وجدان ذاتی واردات اور پیکار حیات دونوں سے متاثر ہوتا ہے اور اپنے تخلیقی اظہار کا تار و پود دونوں کی ملی جلی کیفیات سے تیار کرتا ہے۔ ان کے یہاں "شبستان سے میدان تک" کا احساس بیک وقت ملتا ہے اور درد انسانیت کی سماجی حوالگی کی بدولت انھوں نے غزل کو نظم کی قدر دینے کی کوشش بھی کی ہے۔"[3]

تراجم کے حوالے سے بھی ملا نے نمایاں کام کیے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی انیس، غالب اور اقبال کے اشعار انگریزی میں ترجمے کیے۔ مضامین نہرو کے نام سے پنڈت جواہر لال نہرو کے انگریزی مضامین کا ترجمہ 1939 میں شائع کیا۔ ملا کو انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ تھا۔ چنانچہ ادبیات عالم نے ان کے ذہن وفکر کو آفاقیت بخشی۔ اردو شعرا میں غالب، اقبال اور چکبست سے متاثر تھے۔ غالب سے اتنی گہری عقیدت تھی کہ بے شمار مرتبہ دیوان غالب کا مطالعہ انھوں نے کیا ہوگا۔ گویا کلام غالب کے حافظ تھے۔ ملا نے مختلف ادبیات سے مواد اخذ کیا 'سیاہی کی ایک بوند' میں سنسکرت ادب سے ماخوذ نظمیں بھی شامل ہیں۔

ملا ادب کے نقاد تو نہیں البتہ زندگی کے اصول وفروغ پر گہرا نقد ونظر انھوں نے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک شاعر چونکہ محض فن کار نہیں بلکہ 'دانائے راز اور پیمبر' ہے اس لیے اس کے سر وہ ذمے داری بھی ڈالتے ہیں اور بہتر معاشرے کی تشکیل میں ان کا رول بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ملا کے نزدیک ادب عالیہ ظاہری حسن اور محض فنی خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ جو انسانی اقدار کا حامل ہو وہی ادب عالیہ ہے۔ ملا انسانیت کے پجاری اور انسانی اقدار کے حامل تھے۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی کا تصور اس قدر رچا بسا ہے کہ اس کے بغیر ملا جی کا قلم چلتا ہی نہیں۔ انھوں نے دین ومذہب سے بالاتر خالص انسانیت کا تصور پیش کیا۔ چند اشعار ملاحظہ کریں۔

> ملا ادب کے نقاد تو نہیں البتہ زندگی کے اصول و فروع پر گہرا نقد و نظر انہوں نے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک شاعر چونکہ محض فن کار نہیں بلکہ 'دانائے راز اور پیمبر' ہے اس لیے اس کے سر وہ ذمے داری بھی ڈالتے ہیں اور بہتر معاشرے کی تشکیل میں ان کا رول بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ملا کے نزدیک ادب عالیہ ظاہری حسن اور محض فنی خوبیوں کی وجہ سے نہیں بلکہ جو انسانی اقدار کا حامل ہو وہی ادب عالیہ ہے۔ ملا انسانیت کے پجاری اور انسانی اقدار کے حامل تھے۔ ان کی شاعری میں انسان دوستی کا تصور اس قدر رچا بسا ہے کہ اس کے بغیر ملا جی کا قلم چلتا ہی نہیں۔

ابھی روئے حقیقت پر پڑا ہے پردۂ ایماں
ابھی انساں فقط ہندو مسلماں ہے جہاں میں ہوں
معبد انساں بنے کیسے یہ ضد ہر دل میں ہے
اس کی پیشانی پہ ہو میرے ہی بت خانے کا نام

آنند نرائن ملا پوری زندگی متحرک رہے۔ سیاسی، سماجی اور علمی وادبی ہر حوالے سے سرگرم رہے تاہم انھوں نے کسی تحریک یا ازم سے خود کو وابستہ نہیں کیا اور ادبی سیاست سے ہمیشہ دور رہے۔ ملا کا تعلق چونکہ لکھنؤ سے تھا جہاں اردو کی ہر تحریک اور سرگرمیوں کی آواز بلند رہی اس لیے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت تینوں کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا لیکن اس کے باوجود وہ کسی گروہ میں شامل نہیں ہوئے۔ ملا کے عہد شباب میں ترقی پسند تحریک کا وجود عمل میں آیا۔ 1936 میں ترقی پسند تحریک کی بنیاد پڑی اور اس کے تیرہ سال بعد ملا کا مجموعہ منظر عام پر آیا۔ یہ عہد ترقی پسندی کے شباب کا تھا تاہم انھوں نے اس تحریک سے اپنے دامن کو بچا کر رکھا۔ حالانکہ اپنے ذہن وفکر اور طبیعت کے لحاظ سے ترقی پسند خیالات کے نہایت قریب رہے بلکہ پوری زندگی اسی خیال کی ترویج واشاعت کرتے رہے لیکن پھر بھی وہ خود کو ترقی پسند شاعر کہلانا پسند نہیں کرتے۔ اس حوالے سے خلیق انجم رقم طراز ہیں:

"اپنے ذہنی رویے کے اعتبار سے ملا صاحب سو فیصدی ترقی پسند ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنی شناخت اس ترقی پسندی کے ساتھ نہیں کی جو ایک زمانے میں سکہ رائج الوقت بن چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب احتشام حسین، آل احمد سرور اور بعض دوسرے نقادوں نے ان پر ترقی پسند کا لیبل چپکانا چاہا تو انھوں نے انھیں اس کی قطعی اجازت نہیں دی بلکہ اپنی نظم اور نثر دونوں کے ذریعے اس کی تردید کی۔ وہ سیاست کو ادب کا حصہ ضرور سمجھتے ہیں لیکن ادب کو سیاست بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری میں نہ کوئی نعرے بازی ہے اور نہ ان کے ہاں انقلاب کی کوئی رومانی لے ہے۔ وہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے تشدد کے بھی قائل نہیں۔ لیکن پھر بھی

شاعری کے بارے میں ان کا ایک موقف ہے وہ جو کچھ لکھتے ہیں پورے اعتماد کے ساتھ لکھتے ہیں اس اعتبار سے ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے اس منشور کی خلاف ورزی نہیں کرتی جو 1936 میں جاری ہوا تھا۔“[4]

مجھے اے خالق کون و مکاں خاموش کر دینا
مرے لب پر نہ جس دن دردِ انساں کی پکار آئے
عقل کے بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھلاتے ہوئے
ہم نے کاٹی زندگی دیوانہ کہلاتے ہوئے
ہر دیر و حرم سے کترا کر ملا آیا ہے خانے میں
ملا کے سے لیکن دنیا میں سلجھے ہوئے انساں کتنے ہیں

ملا اپنی شاعری کے بارے میں کہتے ہیں ”میں نے اپنے اکثر اشعار میں جنوں کو خرد پر ترجیح دی ہے“۔ ملا جنون کی توضیح بھی کرتے ہیں کہ دو طرح کا جنون انسان میں ہوتا ہے۔ ایک وہ جنون جو مشترکہ انسانی مفادات اور مقاصد کے حصول کے لیے اپنے ذاتی مفاد اور مقصد کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور بہتر معاشرہ کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔ دوسرا اس کے برعکس جو صرف اور صرف اپنے مفاد کو نظر میں رکھتا ہے۔ چنانچہ پہلے قسم کے جنونی کو ملا شریف سمجھتے ہیں اور سراہتے ہیں۔ دوسری قسم کو بیمار اور غیر متوازن ذہنیت قرار دیتے ہیں۔[5] اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ملا کے نزدیک انسانیت اور تیاگ سے بڑا کوئی دھرم نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا فن کار کیوں نہ ہو اگر اس میں انسانیت نہیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ ملا کے یہاں خلوص و محبت کا جذبہ اس قدر رچا بسا ہوا ہے کہ وہ شعر و ادب میں بھی خلوص کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ مدعی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر ادب میں خلوص نہیں تو ادب عالیہ ہو ہی نہیں سکتا خواہ اس تخلیق میں جتنا حسن ہو۔ ان کا یہ مستحکم نظریہ ہے کہ جس ادب میں دردمندی نہ ہو وہ محض ذہنی عیاشی کے سامان فراہم کرتا ہے۔ ملا انسانی دکھ درد کے ہمدرد اور غم خوار ہیں۔ ان کے اندر ایک عاشق مزاج شاعر بھی چھپا ہے لیکن وہ اپنے عشق کا دھارا انسانیت کی جانب موڑ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ شوخی اور ظرافت بھی ان میں موجود ہے۔ چنانچہ بڑی سے بڑی بات کو شگفتہ لہجے میں آسانی سے کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار دیکھیں۔

وہ کون ہیں جنھیں توبہ کی مل گئی فرصت
ہمیں گناہ بھی کرنے کو زندگی کم ہے
سرِ محشر یہی پوچھوں گا خدا سے پہلے
تو نے روکا بھی تھا مجرم کو خطا سے پہلے
کفر بدظن تو ہم سے دیں بیزار
نام ملا ہے آستیں میں صنم
تو نے پھیری لاکھ نرمی سے نظر
دل کے آئینے میں بال آ ہی گیا

آنند نرائن ملا کو نثر لکھنے میں کوئی دلچسپی نہ تھی اس کا بیان انھوں نے خود کیا ہے۔ تاہم ریڈیو ٹاک اور خطبات وغیرہ کے طور پر چند تحریریں لکھی ہیں جن کو 'کچھ نثر میں بھی' کے عنوان سے یکجا کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں شامل جو خطبات ہیں ان میں انسان کے بنیادی حقوق و فرائض، آئین اور عدلیہ اور انسانیت کے حوالے سے بہترین مواد موجود ہیں۔ ملا کا انسانیت کے تئیں ایک واضح اور صاف رویہ تھا۔ آزادی، امن و سلامتی اور بقائے باہم اور ہم آہنگی ان کے نزدیک سماج کے بنیادی عناصر ہیں۔ طاقت و قوت کے اصول کے سخت خلاف اور اخوت و رواداری کے اصول کے داعی ہیں۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ کریں انسانیت کے تئیں ان کا واضح رویہ سامنے آ جائے گا:

”تاریخ عالم ہم کو بتاتی ہے کہ روز آفرینش سے لے کر آج تک طفل انسانی نے ہمیشہ ایک ایسے نظام ہستی کے خواب دیکھے جس میں وہ اپنے شوق کی زندگی آزادی کے ساتھ بسر کر سکے۔ اس کا اپنا گھر ہو جہاں وہ اپنی بیوی بچوں کے ساتھ جب کار دنیا سے فرصت پائے تو کچھ لمحات سکون اور آرام کے ساتھ گزارے۔ اس کے جسم کو کسی جبر کے شکار بننے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے ذہن کو غلام بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اسے امن اور محبت کی کھلی اور بے خوف فضا میں سانس لے کر اپنے پورے انسانی قد رتک پہنچنے کا موقع ملے۔“[6]

آنند نرائن ملا نے شاعری کی متعدد اصناف سخن پر طبع آزمائی کی۔ انھوں نے نظم اور غزل کے علاوہ رباعی، مرثیہ اور قطعہ بھی لکھا تاہم غزل اور نظم میں ان کے فکری میلانات اور ذہنی سروکار واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔ ملا اعلیٰ انسانی اور سماجی اقدار کے مبلغ اور گنگا جمنی تہذیب کے پیروکار اور داعی تھے۔ ملا کی نظمیں اپنے موضوعات و بیانات کے اعتبار سے نہایت ہی اہم ہیں۔ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر انھوں نے نظمیں لکھی ہیں۔ ”میری شاعری، جادۂ امن، صبح آزادی، لال قلعہ، مہاتما گاندھی کا قتل، سروجنی نائیڈو، مریم ثانی وغیرہ میں امن و آشتی، آزادیِ انساں اور عظیم شخصیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ”دوشیزہ کا راز، سماج کا شکار، آخری سلام اور بیسوا' ایسی نظمیں ہیں جن میں خواتین کے جذبات و کیفیات کو نفسیاتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

غرض کہ آنند نرائن ملا ایک ایسے شاعر و ادیب تھے جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اردو زبان و ادب اور انسانیت کے لیے آواز بلند کرنے میں گزرا۔ وہ دردمندی

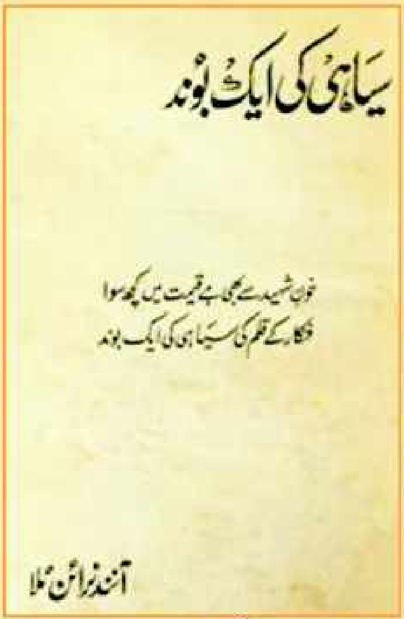

اور انسانیت کے ایسے پیکر تھے کہ مذہب و مسلک سے بے نیاز انسانی اقدار کے متلاشی تھے بلکہ یہ کہا جائے کہ انسانیت ہی ان کا مذہب تھا تو غلط نہ ہوگا۔ آج کے اس اضطراب و انتشار کے ماحول میں آنند نرائن ملا کی شاعری کا مطالعہ کرنا اور ان کے افکار و نظریات کو ہندوستانی معاشرے میں زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ امن و سلامتی اور اخوت و رواداری کی راہیں ہموار ہوں۔ ان کی ذات اردو کے لیے انتہائی بابرکت تھی۔ انھوں نے جب سے عملی میدان میں قدم رکھا اور شعر و ادب کو ذریعہ اظہار بنایا اسی وقت سے اردو زبان و ادب کی تعمیر و ترقی کے لیے ہر محاذ پر کوشاں رہے۔ ان کی حیثیت محض شاعر اور ادیب کی نہیں بلکہ اردو کے مجاہد کی بھی ہے۔ ان کی زبان سے نکلا ہوا جملہ ”اردو میری مادری زبان ہے میں مذہب چھوڑ سکتا ہوں زبان نہیں“ بے پناہ توانائیاں بخشتا ہے۔ ایسے ہی اکابرین ادب کی بدولت اردو زبان و ادب آج تک زندہ و پائندہ ہے اور آئندہ بھی اپنی روشنی لٹاتا رہے گا۔

اب آگے تیری قسمت ہے اے قافلۂ گم راہ بشر
میں نے تو اندھیری راہوں میں کچھ دیپ جلا کر چھوڑ دیے

حواشی

(1) آل احمد سرور، جوئے شیر، ص 14
(2) جادۂ ملا، ص 19
(3) کرب آگہی، ص 4
(4) خلیق انجم جادۂ ملا، ص 20-21
(5) کچھ نثر میں بھی، ص 78
(6) آنند نرائن ملا، کچھ نثر میں بھی، ص 17

■

Mohd Afzal Khan
C-13, Medical Colony, AMU
Aligarh - 202002 (UP)
Email.: afzalalig21@gmail.com

ابوبکرعباد

بدھ مت

اس کا صحیفہ

دھمپد اور اردو

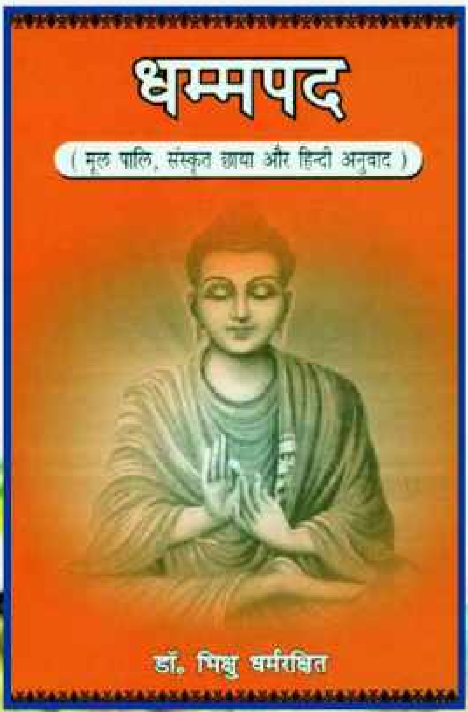

دنیا کے بیشتر بڑے مذاہب اور عقائد کی اپنی مقدس کتابیں ہیں جن میں ان کے اصول وضوابط، احکام و مسائل اور تاریخ و واقعات محفوظ ہیں۔ یہ کتابیں یا تو آسمانی صحائف کی شکل میں ہیں جیسے قران، انجیل، زبور اور تورات یا مذہب یا عقیدے کے بانی یا بزرگوں کے اقوال و ملفوظات پر مبنی یا پھر ان کے پیروکاروں کے ذریعے لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ جیسے سکھوں کی گرو گرنتھ صاحب، زرتشت کی 'ژند وستا' ہندو دھرم کی وید مقدس، اپنشد، پُران اور گیتا وغیرہ۔ لیکن بودھ کی مذہبی کتاب ایک دو یا پانچ سات نہیں، بلکہ متعدد کتابوں کے مجموعے ہیں، جنہیں تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

قبل مسیح کی چھٹی اور پانچویں صدیاں اس اعتبار سے بے حد اہم ہیں کہ ان میں کئی فلسفوں اور مذہبوں کے بانیان پیدا ہوئے جنھوں نے دنیا کو روشن خیالی، روحانی عرفان اور ذہنی آسودگی کے اسباب مہیا کرائے۔ چین میں کنفیوشش، ایران میں زرتشت، یونان میں فیثا غورث اور ہندوستان میں گوتم بدھ اور مہابیر کا تعلق انھی دو صدیوں سے ہے۔ فی الوقت گفتگو مہاتما بدھ، بدھ مت، اس کے صحیفے 'دھمپد' اور ان سب کے رشتوں میں آنے والی اردو زبان کے حوالے سے کی جائے گی۔

عہد عتیق کی چند بے حد برگزیدہ شخصیتوں میں سے ایک اہم اور محترم نام مہاتما گوتم بدھ کا ہے۔ گوتم بدھ کا پیدائشی نام سدھارتھ ہے۔ ان کے والد قدیم ہندوستان کی ایک چھوٹی سی ریاست 'کپل وستو کے راجہ تھے (کپل وستو اب نیپال میں ہے)۔ نوجوانی میں گوتم کی شادی یشودھرا نام کی دوشیزہ سے ہوئی، دونوں کو ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام راہل رکھا گیا۔ اور پھر یوں ہوا کہ گوتم بدھ شاہانہ زندگی اور بیوی بچے کو چھوڑ کر حق کی تلاش میں نکل پڑے۔ برسوں کی تپسیا، ریاضت اور مراقبے کے بعد آخر کار انھیں حق سے آشنائی یعنی معرفت حاصل ہوئی۔ اور ان پر یہ اسرار منکشف ہوئے کہ ریاضت، تپسیا اور چلہ کشی سے نہیں بلکہ نیک اور پاکیزہ زندگی، اعتدال پسندی، صلہ رحمی اور ترک خواہشات سے حق کو پایا اور معرفت حاصل کی جاسکتی ہے۔

گوتم بدھ نے معرفت حاصل کرنے کے بعد عام لوگوں کو شفقت و محبت، ہمدردی و احترام، وفاداری، مساوات، حسن سلوک اور ادب و تعظیم کی ہدایات دیں۔ انھیں انسان کی بنیادی صفات و خصوصیات سمجھائیں، موت وحیات کا فلسفہ بیان کیا، رنج وغم کے اسباب بتائے اور ان سے نجات کے طریقوں کی تعلیم دی۔ تاہم انھوں نے دوسرے بڑے مذاہب جیسے ہندو، عیسائی، یہودی اور اسلام کی مانند نہ تو خدا کے وجود پر کوئی بحث کی ہے، نہ کائنات کی تخلیق کے اسباب پر روشنی ڈالی، اور نہ ہی زندگی، موت اور روح کی وضاحت کی ہے۔ آخرت، قیامت، حشر ونشر اور جنت وجہنم جیسے مسائل پر بھی ان کے فرمودات بہت واضح نہیں ہیں۔ بدھ نے ان کے متعلق غور وفکر، گفتگو یا سوالات کو غیر ضروری قرار دیا ہے۔ اُن کے مطابق ان سب باتوں کا جاننا، یا نہ جاننا انسان کے لیے نہ تو فائدہ مند ہے، نہ نقصاندہ۔ گویا وہ ایک مذہب کے بانی سے کہیں زیادہ انسانی زندگی کے فلسفی، مصلح اخلاق اور انسان دوست کے بطور اپنے افکار بیان کرتے ہیں۔ مابعد الطبیعاتی پیچیدگیوں کے بجائے ان کا سارا زور دنیاوی زندگی کے فلسفے، حسن اخلاق، عمدہ افکار اور اعمالِ صالح پر ہے۔ البتہ عقیدہ 'تناسخ یعنی آواگون (Arvagona) کو انھوں نے تسلیم کیا ہے اور اسے کافی اہمیت دی ہے۔

دنیا کے بیشتر بڑے مذاہب اور عقائد کی اپنی مقدس کتابیں ہیں جن میں ان کے اصول وضوابط، احکام و مسائل اور تاریخ و واقعات محفوظ ہیں۔ یہ کتابیں یا تو آسمانی صحائف کی شکل میں ہیں جیسے قران، انجیل، زبور اور تورات یا مذہب یا عقیدے کے بانی یا بزرگوں کے اقوال وملفوظات پر مبنی یا پھر ان کے پیروکاروں کے ذریعے لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ جیسے سکھوں کی گرو گرنتھ صاحب، زرتشت کی 'ژندوستا' ہندو دھرم کی وید مقدس، اپنشد، پُران

اور گیتا وغیرہ۔ لیکن بودھ کی مذہبی کتاب ایک دو یا پانچ سات نہیں، بلکہ متعدد کتابوں کے مجموعے ہیں، جنھیں تین زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

یہ زمرے 'تری پٹک' (Tripitaka) یعنی تین پٹاریوں کے نام سے منسوب ہیں۔ تینوں پٹاریوں میں متعدد ابواب پر مشتمل کئی کئی کتابیں شامل ہیں۔ متعدد کتابوں پر مشتمل پہلی ٹوکری کا نام 'ونیا پٹک' (Vinaya Pitaka) ہے۔ تیسری پٹک کا نام 'ابھی دھم' (Abhidhamma-Pitaka) ہے۔ اس میں بھی کئی ایک کتابیں ہیں۔ اور دوسری کا نام 'ست پٹک' (Sutta Pitaka) ہے۔ ست پٹک پانچ حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے پانچویں حصے 'کھدک' (Khuddak) میں پندرہ گرنتھ ہیں انھی گرنتھوں میں سے دوسرے نمبر کا گرنتھ 'دھمپد' (Dhammapada) ہے۔

چونکہ گوتم بدھ (563 ق م) کے زمانے میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم تھا اس لیے ایک عرصے تک ان کی تعلیمات سینہ بہ سینہ یا کہیے زبانی منتقل ہوتی اور دیس بدیس پہنچتی رہیں۔ تقریباً تین سو سال کے بعد 252 ق م میں اشوک کے عہد میں پہلی مرتبہ انھیں مبسوط شکل میں 'پالی' زبان میں قلمبند کیا گیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ بودھ گرنتھوں کو پہلی بار لنکا کے راجہ 'وتا گامی' (88-76 ق۔م) کے حکم سے تحریری شکل میں جمع کیا گیا۔ 'مہاونش' نام کے گرنتھ میں اس بات کا ذکر موجود ہے۔ (دھمپد، ہندی، کن چھیدی لال گپت، چوکھبا وڈیا بھون، وارانسی، 2012، ص، 14) ذہن نشیں رہے کہ بھگوان بدھ نے تمام احکامات وتلقینات اور پند ووعظ بہار کی زبان 'ماگدھی' میں ارشاد فرمائے تھے، جو اس وقت مگدھ کے عام لوگوں کی بول چال کی زبان تھی (جسے دیسی، یا پراکرت بھی کہا جاتا ہے)۔ بدھ کی ان تمام باتوں اور وعظوں کو تحریری شکل میں لانے کے لیے انھیں 'پالی' زبان میں مرتب کیا گیا۔ مگر اصل جلدیں مرتب کیے جانے کے بعد کم عرصے میں ہی ناپید ہوگئیں۔ حسن اتفاق ان کی ایک نقل راجا اشوک کے بیٹے مہند (Mahend) کے پاس محفوظ تھیں جنھیں وہ اپنے ساتھ سری لنکا لے گئے تھے جہاں ان کا ترجمہ وہاں کی سنگھالی زبان میں ہوا۔ کچھ عرصے بعد راجہ مہند والی وہ نقلیں بھی جو وہ اپنے ساتھ سری لنکا لے گئے تھے، اصل جلدوں کی طرح معدوم ہوگئیں، مگر سنگھالی کا ترجمہ رہ گیا تھا جسے صوبۂ بہار کے ضلع 'گیا' کے ایک راہب بدھ گھوش (Budh Gosh) نے اصل تسلیم کرتے ہوئے پھر سے اس کا ترجمہ پالی زبان میں کیا۔ اب برصغیر میں یہی تری پٹک Tripitaka مستند اور قدیم سمجھی جاتی ہیں۔

تری پٹک کو مذہب، فلسفہ، منطق، تمثیل، کتھا، تجربات (بشمول انسان اور متعدد جانداروں کے) اور سائنس کا خزانہ کہیے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ ان میں علمیت، ادبیت، شعریت، تجسس، آسودگی اور کنونسنگ پاور غضب کی ہے۔ اسی تری پٹک خزانے کا ایک بیش بہا موتی 'دھمپد' ہے۔ 'دھمپد' دو لفظوں سے بنا ہے۔ ایک سنسکرت لفظ 'دھرم' جسے پالی زبان میں 'دھم' کہتے ہیں۔ دوسرا 'پد' جس کے معنی راستے کے ہیں، یوں اس کے معنی ہوئے دھرم کا راستہ۔ 'پد' کے معنی 'فرمان' یا 'بول' کے بھی ہیں۔ اس طرح 'دھمپد' کا ترجمہ 'مذہبی فرمان' یا 'بھگوان بدھ کی باتیں' بھی کر سکتے ہیں۔ 'دھمپد' چھبیس ابواب اور چار سو تئیس گاتھاؤں (اقوال / باتوں) پر مشتمل صحیفہ ہے۔ چھبیس ابواب کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ عنوانات کے اردو ترجمے پنڈت بشیشور پرشاد منور لکھنوی کے کیے ہوئے ہیں۔ پندرھویں باب کے عنوان کا انھوں نے کوئی ترجمہ نہیں کیا ہے:

پہلی گفتگو: نیک و بد کا مقابلہ۔ 2۔ عمل کی فضیلت۔ 3۔ دل کی تربیت۔ 4۔ پھولوں کا استعارہ۔ 5۔ جہالت کا نتیجہ۔ 6۔ پنڈت (عالم) کا بیان۔ 7۔ تارک کامل کا بیان۔ 8۔ ہزار کا بیان۔ 9۔ گناہ کا ذکر۔ 10۔ سزا کا ذکر۔ 11۔ آگ کی تمثیل۔ 12۔ اپنی ذات کے بارے میں۔ 13۔ دنیا و عقبیٰ کے بارے میں۔ 14۔ عقل مندوں کے باب میں۔ 15۔ ...... 16۔ محبت کے ذکر میں۔ 17۔ غصے کے ذکر میں۔ 18۔ کثافت کے باب میں۔ 19۔ مضبوط دھرم کے باب میں۔ 20۔ طریق عمل کے باب میں۔ 21۔ بہترین مفاد کے بارے میں۔ 22۔ دوزخ کے بارے میں۔ 23۔ ہاتھی کی مثال۔ 24۔ ترشنا یعنی حرص کے باب میں۔ 25۔ فقیری کے ذکر میں۔ 26۔ برہمن کے بارے میں۔ (دھمپد، بشیشور پرشاد، انجمن ترقی اردو، (ہند) علی گڑھ، 1954)

دلچسپ بات یہ ہے کہ دنیا کے چھ بڑے مذاہب عیسائی، یہودی، اسلام، ہندو، جین اور بودھ میں سے تین یعنی ہندو، جین اور بودھ کا تعلق ہندوستان سے ہے، اور ان میں سے آخرالذکر دو کا صوبۂ بہار سے ہے۔ گوتم بدھ کو بہار میں ہی معرفت حاصل ہوئی تھی اور انھوں نے بیشتر وعظ وتلقینات اور ہدایات بہار کے مختلف علاقوں میں ہی دیے تھے۔ 'دھمپد' میں بھی شامل بہت سے اپدیشوں کا تعلق بہار کی سرزمین سے ہے۔

دھمپد کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ بودھ مت کے مختلف گرنتھوں سے بھگوان بدھ کی باتوں کو منتخب کرکے اسے کتابی شکل دی گئی ہے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس میں دوسرے دھرموں کے شاستر کی اہم باتوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ (ایضاً، 13) 'دھمپد' کے انتخاب و ترتیب کے تعلق سے ایک روایت یہ ہے کہ اس کا انتخاب بھگوان بدھ کے نروان حاصل کرنے یعنی ان کے انتقال سے پہلے ہی کر لیا گیا تھا، البتہ اسے تحریری شکل یا تو 477 ق۔م، یا پھر لنکا کے راجہ وٹا گامی کے عہد (77-88 ق۔م) میں دی گئی۔ 'دھمپد' کی گاتھائیں چونکہ انتہائی اختصار سے بیان کی گئی ہیں اس لیے کن چھیدی لال گپت کا کہنا ہے انھیں اس وقت تک آسانی سے نہیں سمجھا جا سکتا ہے جب تک اس کے ساتھ دوسرا معاون گرنتھ 'دھمپد کتھا' نہ پڑھا جائے، جس میں دھمپد کے اپدیشوں سے متعلق تین سو پانچ کتھائیں (کہانیاں) ہیں۔ ممکن ہے کن چھیدی لال جی کی مراد 'دھمپد' کے اقوال کی شان نزول یا سائل کے سوال، یا تجسس کو سمجھنے، یا بیان کی باریکیوں تک پہنچنے سے متعلق ہو، جن کے جوابات، یا سیاق میں کہی گئی

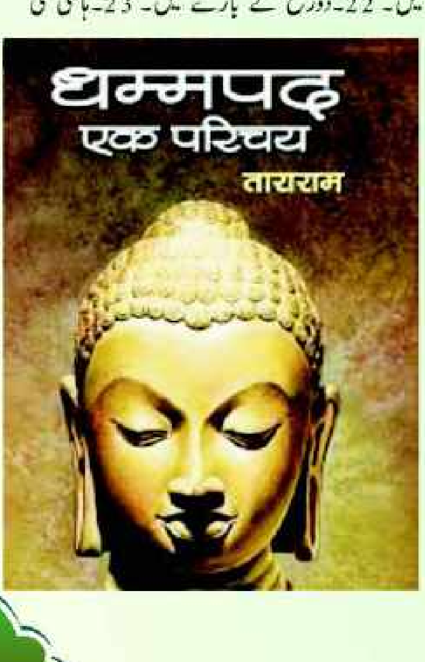

باتیں 'دھمپد' میں منقول ہیں۔ یوں 'دھمپد' کے بنیادی ایڈیشوں کو بغیر کسی معاون کتاب کے سمجھنا کچھ ایسا مشکل مسئلہ نہیں ہے، یہ کتاب اپنے آپ میں کافی ہے۔

'دھمپد' پر مزید گفتگو سے پہلے بدھ مت کے تعلق سے چند بنیادی باتوں کا جان لینا شاید زیادہ بہتر ہوگا۔ مثلاً یہ کہ بدھ مت کا کلیدی فکری نظام چار عظیم سچائیوں پر استوار ہے جن میں بدھ مت کا بنیادی فلسفہ مضمر ہے۔ پہلی عظیم سچائی یہ ہے کہ زندگی دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔ دوسری عظیم سچائی یہ ہے کہ دکھ بلا سبب نہیں، بلکہ ان دکھوں کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ تیسری عظیم سچائی یہ ہے کہ ان دکھوں سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے، اور چوتھی عظیم سچائی یہ کہ دکھوں سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے کچھ طریقے ہیں۔ پہلی تینوں سچائیاں دراصل بدھ مت کے نظریاتی اصول ہیں، جب کہ چوتھی سچائی آٹھ عملی طریق کار پر منحصر ہے جن کے اختیار کرنے سے دکھ دور ہو جاتے ہیں اور نروان حاصل ہوتا ہے۔ دکھ سے نجات حاصل کرنے کے یہ آٹھوں عملی طریقۂ کار 'اشٹانگک مارگ' (ہشت اصولی راستہ) کہلاتے ہیں۔ جو حسب ذیل ہیں: صحیح علم۔ صحیح ارادہ۔ صحیح گفتگو۔ صحیح عمل۔ صحیح ذریعہ معاش۔ صحیح کوشش۔ صحیح یادداشت، اور صحیح غور و فکر (مراقبہ)۔

اب ذرا چار عظیم سچائیوں اور ان سے متعلق آٹھ اصولوں کو قدرے وضاحت سے اس طرح جانیں کہ:

(1) انسانی زندگی پیدائش سے لے کر موت تک دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔ جس میں بشمول پیدائش اور موت، ناپسندیدہ چیزوں سے واسطہ پڑنا اور محبوب چیزوں کا بچھڑ جانا ہے۔

(2) دکھوں کی وجہیں لاعلمی، امید، لالچ، حرص و ہوس اور خواہشات ہیں۔

(3) سچے علم کے حصول اور نفسانی خواہشات پر کنٹرول کے ذریعے ان دکھوں سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

(4) سچے علم کو حاصل کرنے اور دکھوں سے نجات پانے کے لیے بدھ کے بتائے ہوئے وہ آٹھ طریقے یہ ہیں جنھیں بدھ مت میں اشٹانگک مارگ کہا جاتا ہے:

(1) سمیک درشٹی: (صحیح نقطۂ نظر)۔ چیزوں کو بالکل ویسی ہی دیکھنا جیسی کہ وہ ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ اس اصول کے تحت حقائق کی ماہیت اور ان کے صحیح ادراک پر زور دیا جاتا ہے، فانی اور غیر فانی میں امتیاز کیا جاتا ہے، شکوک اور غلط نظریات سے احتیاط کیا جاتا ہے، علم اور لاعلمی کے فرق کو جاننے کی کوشش کی جاتی ہے، اور چاروں عظیم سچائیوں پر یقین رکھا جاتا ہے۔

(2) صحیح سنکلپ: (صحیح ارادہ)۔ اُن خیالات و جذبات سے پرہیز کرنا جو اخلاقی برائیوں کو جنم دیتے ہیں، مثلاً نفرت، غصہ، غرور، حسد، لالچ، شک، خود غرضی، تعصب، تشدد، دھوکا اور لذت پرستی وغیرہ۔ ساتھ ہی تمام مخلوقات کے لیے ایثار، محبت اور ہمدردی کے رویے اپنانا۔

(3) سمیک واک: (صحیح کلام)۔ برائی اور فساد کو جنم دینے والی باتوں مثلاً جھوٹ، غیبت، سخت کلامی، خود ستائی، اور یاوہ گوئی سے پرہیز اور حق گوئی، نرم گفتاری، معتدل اور مدلل طرز گفتگو اپنانا۔

(4) سمیک کرمانتا: (صحیح اعمال)۔ ان تمام اعمال سے بچنا جنھیں بدھ نے ممنوع قرار دیا ہے، مثلاً جھوٹ، چوری، ظلم، خود غرضی، بدچلنی اور فتنہ و فساد وغیرہ۔ اسی طرح اس کے بتائے ہوئے اعمال کی پابندی کرنا جیسے حسن سلوک، خوش اخلاقی، ہمدردی، خدمت خلق، جانداروں پر رحم اور فیاضی وغیرہ۔

(5) سمیک اجیوا: (صحیح ذریعۂ معاش)۔ حلال رزق کا حصول اور کمانے کے غلط ذرائع سے پرہیز۔ مثلاً بے ایمانی، ظلم، زیادتی، رعب، جبر یا کسی کو نقصان پہنچا کر روزی یا دولت حاصل کرنا۔

(6) سمیک ویایام: (صحیح کوشش)۔ اپنے اندر پاکیزہ اور پسندیدہ خیالات و جذبات کو فروغ دینا اور غلط اور ناپسندیدہ خیالات و جذبات جیسے نفسانی خواہشات، نفرت، لالچ، ہوس اور غصہ وغیرہ کو ابھرنے سے روکے رکھنے کی کوشش کرنا۔

(7) سمیک سمرتی: (صحیح یادداشت)۔ اچھی اور مناسب باتوں کو یاد رکھنا، زندگی، موت اور دکھوں کو ذہن نشیں رکھنا اور غلط اور بری باتوں کو بھول جانا۔

(8) سمیک سمادھی: (صحیح مراقبہ)۔ صحیح غور و فکر کے ذریعے اصل حقیقت تک پہنچنا۔ یہ آٹھواں اصول بنیادی حیثیت کا حامل اور بدھ مذہب کی اہم ترین عبادت ہے کیونکہ بدھ مت کے مطابق صحیح مراقبہ زندگی کے اصل مقصد یعنی باطن کی تطہیر کے لیے لازمی اور نروان کے حصول میں کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔

بدھ مت میں نروان ('نجات') ایک خاص حالت کو کہتے ہیں جس میں انسان رنج و خوشی، دوستی اور دشمنی، آلام و مصائب آرزوؤں اور خواہشوں سے ماوریٰ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ زندگی اور موت (جنم اور مرن کے تسلسل یعنی مرنے اور پھر اعمال کے مطابق نئی نئی جون میں جنم لینے) سے دائمی نجات پا جاتا ہے۔ بار بار اپنے کرموں کے پھل کے مطابق جنم لینے اور مرنے کے تسلسل میں آخری جنم اور آخری موت کو نروان کہا جاتا ہے۔ یہ نروان یعنی جینے اور مرنے کے دکھوں سے نجات ایک یا دو جنموں میں نہیں بلکہ کئی جنموں کے بعد اچھے کرموں اور بالکل پاک صاف زندگی گزارنے بعد حاصل ہوتا ہے۔ بھگوان بدھ بھی کپل وستو میں پیدا ہونے اور شراوتی میں آخری بار مرنے سے پہلے متعدد بار جنم لے چکے تھے۔ یہ آخری موت بھگوان بدھ کے نروان کی منزل ہے۔

مذکورہ چار عظیم سچائیوں اور آٹھ اصولوں کے علاوہ مہاتما بدھ نے انسانی معاشرے کو انتشار سے بچانے اور افراد کو مہذب بنانے کے لیے پانچ باتوں پر مشتمل ایک اخلاقی نظام 'پنچ شیلا' بھی مرتب کیا، جو اس طرح ہے:

1۔ کسی بھی جاندار کی جان نہ لینا
2۔ چوری نہ کرنا
3۔ جھوٹ نہ بولنا
4۔ نشہ اور نشہ آور چیزوں سے پرہیز کرنا
5۔ زنا نہ کرنا

آج بھی بدھ مذہب میں داخل ہونے کے لیے 'پنچ شیلا' کو نبھانے کا عہد اس کے بنیادی ارکان میں سے ایک لازمی رکن ہے۔ اس کے علاوہ بدھسٹوں کے لیے شرن کے یہ تین اصول بھی ضروری ہیں: (1) بدھم شرنم گچھامی۔ (2) دھمم شرنم گچھامی۔ (3) سنگھم شرنم گچھامی۔ یعنی میں بدھ کی شرن (پناہ) میں جاتا ہوں۔ میں دھرم کی شرن میں جاتا ہوں۔ میں سنگھ (تنظیم) کی شرن میں جاتا ہوں۔

بدھ نے والدین اور اولاد، استاذ اور شاگرد، میاں بیوی، دوست اور ساتھی اور آقا اور ملازم کے احکام و فرائض بھی متعین کیے ہیں۔ بعض پیشوں کی انھوں نے ممانعت کی ہے، مثلاً ہتھیار بیچنے، لونڈی اور غلام کو خریدنے اور بیچنے، شراب بنانے اور بیچنے، گوشت بیچنے اور زہر بیچنے سے۔ بدھ مت میں نسل، ذات، کلاس اور جنسی تفریق کو کوئی دخل نہیں ہے۔

شاید اس بات کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے کہ پہلے پہل مہاتما بدھ کی تبلیغ کی طرف وہ لوگ راغب ہوئے جو معاشی اعتبار سے کمزور، سماجی لحاظ سے حاشیے پر رہنے والے اور لٹریری طور پر ادبی ذوق سے تقریباً عاری اور اعلیٰ طبقے کی زبان کے بجائے دیسی اور عام بول چال کی زبان بولنے اور سمجھنے والے لوگ تھے۔

بدھ مت کو ایک مذہبی انقلاب کہنا چاہیے جو آلام و مصائب، جسمانی کثافت، روحانی اسرار اور اور زندگی اور موت کی پیچیدگیوں کے حل کی تلاش کی صورت شروع ہوا تھا اور بالآخر ایک بے حد موثر اور منظم مذہب کے طور پر

تشکیل پایا۔ بدھ مت نے لوگوں کو انسانی برابری، سماجی انصاف، عزت نفس اور زندگی کے منطقی اور روحانی طریقوں سے روشناس کرایا اور حسن اخلاق اور نیک اعمال کی ترغیب دی۔ بدھ مت میں عقیدت کے مقابلے منطقیت، عبادات کے مقابلے اعمال اور احساس تفاخر کے مقابلے میں خاکساری پر زور دیا گیا ہے۔ اس نے ذات پات کی تفریق، عورت اور مرد کی برتری اور کمتری اور مذہبی امور کی اجارہ داری کو بھی ختم کیا۔ بنیادی طور پر اس مذہب کی روح عمدہ خیالات، اچھے اخلاق اور صحیح اعمال میں پوشیدہ ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ مہاتما بدھ نے ہندوستان میں انسانی مساوات کا پہلا باضابطہ منشور جاری کیا۔ شاید اسی وجہ سے عوام کی بڑی تعداد کے بعد خواص نے اور پھر بادشاہوں تک نے اس مذہب کو اپنایا، سرکاری حیثیتیں دیں اور اس کی تبلیغ کی۔ تسلیم یہ بھی کرنا چاہیے کہ غالباً تب تک کا یہ پہلا مذہب تھا جو بہار سے شروع ہوکر پورے ہندوستان اور پھر روم و یونان اور دوسرے ممالک تک پہنچا اور دنیا کے بیشتر حصوں میں پھلنے پھولنے لگا۔ لیکن اس کا دوسرا دردناک پہلو یہ بھی ہے کہ بوجوہ یہ ہندوستان میں کم اور پھر ختم ہونے لگا۔ علامہ اقبال نے 'بانگ درا' کی نظم 'نانک' میں، اپنی ہی جنم بھومی میں گوتم بدھ اور بدھ مت کے فلسفے کو نظرانداز کیے جانے کے حوالے سے بڑے معنی خیز اشارے کیے ہیں:

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکار اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفے پر ناز تھا
شمع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارش رحمت ہوئی لیکن زمیں قابل نہ تھی
برہمن سرشار ہے اب تک مئے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے اپنی مشہور زمانہ فارسی تخلیق 'جاوید نامہ' میں بھی گوتم بدھ کا ذکر بڑے ہی سلیقے اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ جب وہ رومی کے ساتھ فلک قمر پر پہنچتے ہیں تو وہاں ان کی ملاقات زرتشت، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمدؐ کے ساتھ ساتھ گوتم بدھ سے بھی ہوتی ہے۔

گوتم بدھ کے حوالے سے اردو میں کئی کتابیں لکھی گئیں، جیسے منشی احمدالدین کی 'مہاتما بدھ' جو 1903 میں کشمیری پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی، ڈاکٹر م۔ حفیظ سید

بدھ مت میں عقیدت کے مقابلے منطقیت، عبادات کے مقابلے اعمال اور احساس تفاخر کے مقابلے میں خاکساری پر زور دیا گیاھے۔ اس نے ذات پات کی تفریق، عورت اور مرد کی برتری اور کمتری اور مذہبی امور کی اجارہ داری کو بھی ختم کیا۔ بنیادی طور پر اس مذہب کی روح عمدہ خیالات، اچھے اخلاق اور صحیح اعمال میں پوشیدہ ھے۔

ایم۔ اے کی 'گوتم بدھ: سوانح حیات و تعلیمات' جسے انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی نے 1942 میں شائع کیا، ایسے ہی کئی اور کتابیں۔

'دھمپد' کا پہلا انگریزی ترجمہ 1840 میں ہوا تھا اور پھر دنیا کی بیشتر زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے۔ اردو میں بھی دنیا کی بیشتر مذہبی کتابوں کی طرح 'دھمپد' کے بھی ترجمے ہوئے۔ فی الوقت جو ترجمہ پیش نظر ہے، وہ ہے اہم شاعر بشیشور پرشاد منور لکھنوی کا منظوم ترجمہ 'دھمپد یا سچی راہ' کے عنوان سے جو 1954 میں انجمن ترقی (اردو ہند) علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ اسے اردو زبان کا امتیاز اور اس کی رواداری کہنا چاہیے کہ اس زبان نے اپنے اندر نہ صرف عالمی ادب، تاریخ و سیر، منطق و فلسفہ، سائنس و کیمیا اور ہر قسم کے موضوعات کو سمویا بلکہ دنیا کے تمام مذاہب اور بیشتر عقائد کا تعارف کرایا، مضامین اور کتابیں لکھیں اور ان کے مقدس صحیفوں کے ترجمے بھی عام لوگوں تک پہنچائے۔ دھمپد کا ترجمہ بھی اردو زبان کی علم دوستی اور مذہبی رواداری کی ایک عمدہ مثال ہے۔ اس ترجمے کی زبان بہت ہی آسان، عام فہم، دلنشیں اور دلچسپ ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ مشکل مسائل کو بھی کم سے کم اشعار میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ سلیقے سے ڈھالا گیا ہے۔

عالم بے عمل۔

دھرم گرنتھوں سے کیا حاصل
ان کا پڑھنا ہے لا حاصل
ان کو عمل میں لائے نہ جب تک
عیش پرستی جائے نہ جب تک
ایسا انساں ہے اک گوالا
گائیں پرائی دوہنے والا
اس کا بیڑا پار نہ ہوگا
وہ پھل کا حقدار نہ ہوگا

بے معنی ہے ایسا پڑھنا
بے مصرف ہے اس کا پڑھنا

جہالت کا نتیجہ۔

یہ تو میرا لخت جگر ہے
وہ تو میرا نور نظر ہے
میں ہوں مال و زر کا مالک
گھر کا مالک، در کا مالک
دعویٰ جو یہ کیا کرتا ہے
رنج وہ مول لیا کرتا ہے
خود یہ جسم نہیں جب اپنا
پھر بے کار یہ دعویٰ کیسا
ہیں یہ سب اسباب مصیبت
کس کا بیٹا، کس کی دولت

حرص۔

حرص سے ہے گرم بازار الم
حرص سے رہتا ہے دل پابند غم
اس بلائے بد سے جو رہتا ہے دور
اس کے نشہ سے نہیں رہتا جو چور
اس کے دل میں رنج آسکتا نہیں
وہ کسی سے خوف کھا سکتا نہیں

جسم۔

بے وقعت ہے جسم خاکی
ہے یہ اک تصویر فنا کی
ہوجائے گا یہ ناکارہ
کرلے گی جب روح کنارہ
کام نہ پھر کچھ بھی آئے گا
فرش زمیں پہ گر جائے گا

سزا کا ذکر۔

ہو کلام درشت سے پرہیز
تلخ گوئی سے واجبی ہے گریز
بولنے میں زبان سخت نہ ہو
لہجۂ گفتگو کرخت نہ ہو
بد زبانی خراب ہوتی ہے
اک گنہ، اک عذاب ہوتی ہے
نہ رہوگے جو اس عذاب سے دور
تم کو اس کی سزا ملے گی ضرور

■

Abu Bakar Abbad
Department of Urdu
University of Delhi
Delhi - 110007
Mob.: 9810532735

روح کے کاغذ پر کبیر کا 'حرفِ محبت'

حقانی القاسمی

کبیر تکثیری سماج میں تہذیبی وحدت کی ایک روشن علامت تھے۔ انھوں نے تشخص کی ان علامتوں (Identity Symbols) کو توڑا جو ذات، رنگ، نسل، مذہب اور بھاشا نے اپنی بالادستی اور اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے وضع کی تھیں۔ وہ ہیومنزم اور انسان دوستی کے لوک کوی تھے۔ پریم لیلا جن کی پہچان تھی اور انسانی محبت جن کی شناخت۔ کبیر نے ان مذہبی رسومات کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا جو اپنے مفاد اور منفعت کے لیے مذہبی ٹھیکیداروں نے معاشرے میں رائج کر رکھا تھا۔ کبیر موحد تھے مگر ترکِ رسوم پر ان کا یقین تھا اس لیے مذہب کے تخلیقی ذہن پر نہیں بلکہ مذہب پرستوں کے میکانکی ذہن پر انھوں نے وار کیا، اور ہر اس تصور کی نفی کی جو تعصب، تفریق اور تشدد کو بڑھاوا دیتا ہے۔ انھوں نے انسان کو ذات، زبان، دھرم یا بھاشا سے نہیں بلکہ انسانیت سے پہچاننے کا درس دیا۔ کبیر کا بنیادی مقصد، آزادی، اخوت، اتحاد، مساوات اور ہر انسانی فرد کا ممکنہ ارتقا تھا۔ وہ Indoctrination سے آزاد اعلیٰ انسانی سماج اور تمام طبقات میں ایک جذباتی ہم آہنگی کے قائل تھے۔ انسانوں کی فلاح و بہبود پر ان کا یقین کامل تھا۔ کبیر نے نسلی اور نسبی برتری کے تصور کو بھی مسمار کیا اور اچھے اعمال اور اقدار کو افضلیت کا معیار قرار دیا۔ کبیر نے یہ بتایا کہ ہر انسان میں ایک ہی وجود کی خوشبو بسی ہوئی ہے اور ہر ایک کے باطن کا روحانی آہنگ ایک ہے اور یہ بھی کہ ہریجن سے محبت کے بغیر ہری سے عشق مکمل نہیں ہوسکتا۔

کبیر بین مذاہب ہم آہنگی (Interfaith Harmony) کے مبلغ تھے۔ انھوں نے تصوف اور بھکتی سے اپنا رشتہ جوڑ کر رواداری، محبت، اخوت اور یگانگت کا پیغام پہنچایا۔ اور مذہبی تصادم اور تہذیبی آویزش کو ختم کرنے کے لیے دوہوں اور کتھاؤں کے ذریعہ سماج سے سوالات بھی کیے۔ کبیر کا ہر کلام سماج کے لیے ایک استفہامیہ تھا۔ کبیر کے کلامیے میں جو نشتریت تھی وہ آج بھی کند نہیں ہوئی ہے۔ جس طرح کا معاشرہ کبیر کے عہد میں تھا، کم و بیش ہمارے آج کے معاشرے کی صورت حال ویسی ہی ہے۔ دانشوروں، مفکروں اور مدبروں نے بھی کچھ اسی نوع کے سوالات قائم کیے۔ مگر جو قوت استدلال کبیر کے یہاں ملتی ہے وہ ان دانشوروں (intellectuals) کے یہاں نہیں ہے کیوں کہ کبیر نے 'کاگد کی لیکھی' پر نہیں بلکہ 'آنکھن دیکھی' پر اعتبار کیا۔ ان کا اندازِ فکر علمیاتی (Epistemological) نہیں وجودیاتی (Ontological) تھا۔ ویسے بھی کبیر اَن پڑھ تھے۔ خود انھوں نے کہا تھا۔

ودیا نہ پڑھوں واد نہیں جانوں

کبیر کا علم کتابی نہیں تجرباتی تھا۔ مگر انھوں نے حیات و کائنات کا مشاہدہ اس تیسری آنکھ سے کیا تھا جس سے ساری جہتیں اور طرفیں روشن ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ تیسری آنکھ ہے جو شیو جی کے پاس تھی۔ عرفان و وجدان کی آنکھ جو ایک اعلیٰ شعور کی علامت ہے۔ ایک چشمِ دانش جس سے سارے حقائق عیاں ہو جاتے ہیں۔ یہی تیسری آنکھ ہے جس نے کبیر کو اَن پڑھ ہونے کے باوجود اعلیٰ شعور عطا کیا اور اسی کی وجہ سے انھوں نے وہ ساری کائناتی حقیقتیں دیکھ لیں جن میں بہت سی دانشورانہ آنکھیں صدیوں تک الجھی رہیں۔ قدرت نے کبیر کو 'آتم درشٹ' عطا کیا تھا۔ وہ روحانی نظر، وہ نورِ بصر جس نے ان پر کائنات کے سارے اسرار و رموز منکشف کر دیے اور اس وجود سے آشنا کر دیا جس کا جلوہ ہر شے میں ہے۔ اسی میں انھوں نے اس انسانی وجود کو تلاش کیا جس میں انھیں چاند، سورج، ستارے نظر آئے، کاشی، کعبہ اور دوارکا بھی۔ آتم گیان

کبیر نے مذہب پرست معاشرہ سے جتنے بھی سوالات کیے ہیں وہ معقول ہیں۔ کبیر کے ہر سوال میں ایک زبردست کاٹ ہے۔ ایک طنز ہے ان تصورات پر جو مذہب کے نام پر لوگوں نے وضع کر لیے ہیں۔ کبیر یہ جانتے ہیں ہر وہ سوچ جس میں تفریق یا تعصب کی بو ہو وہ خدائی یا اُلوہی فکر نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے کبیر کا یہ بھی خیال ہے کہ پیدائشی اعتبار سے کوئی برہمن یا شودر نہیں ہوتا۔

نے ہی انھیں بتایا کہ انسانوں کے درمیان تفریق بے معنی ہے۔ نہ کوئی اعلیٰ نہ ادنیٰ، نہ کوئی برہمن نہ شودر، سب خدا کے بندے ہیں اور بندوں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ اسی آتم گیان کی قوت تھی کہ کبیر نے موروثی برہمن ازم کی مخالفت کی جب کہ ایک روایت کے مطابق وہ برہمن تھے۔ یا برہمن بیوہ کی اولاد تھے۔ اسی کے ساتھ مسلمانوں کے مذہبی رسومات پر بھی طنز کیا جب کہ کبیر خود مسلمان تھے۔ نیمہ اور نورو کے بیٹے، جولاہے، کوری یا کمینہ ذات سے تعلق رکھنے والے اور شیخ تقی کے مرید مگر ماتھے پر تلک لگاتے تھے اور جنیو پہنتے تھے اور علی الاعلان یہ کہتے تھے کہ میں نہ ہندو ہوں اور نہ مسلمان:

ہندو کہو تو میں نہیں مو مسلمان بھی ناہیں
پانچ تتو کا پوتلا گیبی کھیلے ماہیں

ناتھ پنتھی کبیر کی بغاوت اندھی مذہب پرستی سے تھی یا ان رسومات سے جن کا مذہب کی روح اور روایت سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ انھوں نے دین پر نہیں دینیات اور مذہب کی شعریات مرتب کرنے والوں پر سوالات قائم کیے کہ مذہبی بنیاد پر ہی سب سے زیادہ تنازعے ہوتے ہیں اور یہ تنازعے جنگ و جدال، قتل و غارت گری کا موجب بن جاتے ہیں۔ جب کہ حقیقی مذہب امن، محبت، مساوات، مواساۃ اور ہم آہنگی پر زور دیتا ہے اور انسانوں کے مابین نفرت اور تعصبات کو ختم کرتا ہے۔ کبیر نے مذاہب کے مشترکہ اقدار اور تمام مذاہب کی روح کو سمجھتے ہوئے غیر طبقاتی انسانی معاشرہ کی تشکیل پر زور دیا۔ انھوں نے تنوع میں وحدت (Unity in Diversity) کی تلاش کی اور یہ بتایا کہ جتنے بھی مذاہب ہیں سب ایک ہیں۔ انھوں نے اپنے دوہوں میں یہ اشارہ کیا کہ ہندوؤں کے رام اور مسلمانوں کے رحیم میں کوئی فرق نہیں ہے۔

وہی مہادیو وہی محمد برہما آدم کہیے
کوئی ہندو کوئی ترک کہاوے ایک زمیں پر رہیے
وید کتاب پڑھے وے کتبہ وے مولانا وے پانڈے
وگت وگت کے نام دھرایو اک مائی کے بھانڈے

(— جو مہادیو ہیں وہی محمد ہیں، برہما کو آدم کہنا چاہیے کوئی ہندو کہلاتا ہے کوئی مسلمان، رہتے سب ایک ہی زمین پر ہیں۔ وہ وید پڑھتے ہیں وہ کتاب کتبہ، وہ مولانا ہیں وہ پنڈت ہیں۔ علاحدہ علاحدہ نام رکھ لیے گئے ہیں لیکن سب ایک ہی مٹی کے برتن ہیں—

متن اور ترجمہ: کبیر وچناولی، تالیف ہری اودھ، مترجم: سرسوتی سرن کیف، ساہتیہ اکادمی نئی دہلی، 1990)

یہ ویسے ہی خیالات ہیں جو حافظ، بابا فغانی، غزالی، فیضی، عرفی، صائب وغیرہ کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ فیضی کا ایک شعر ہے:

کعبہ و بتکدہ یک رنگ و حریفان دو بین
خود مسلمانی و خود برہمنی ساختہ اند

(— کعبہ و بت خانہ تو ایک ہیں لیکن مخالفین انھیں دو سمجھتے ہیں اور خود کو انھوں نے مسلمان اور برہمن بنا رکھا ہے—)

اسی طرح ایک اور شعر ہے۔

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دیں، چرا است
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

(— میں کفر اور اسلام کی دشمنی پر حیران ہوں جب کہ ایک ہی چراغ سے کعبہ و بت خانہ روشن ہیں—)

کبیر کا سلسلۂ خیال ایسے ہی روشن خیال اور وسیع النظر صوفی شعراء سے ملتا ہے۔

کبیر نے جہاں مذہبی وحدت پر زور دیا ہے وہیں متھیا چار پر زبردست وار بھی کیا ہے۔ وہ اپنے ایک دوہے میں کہتے ہیں:

میں توہے پوچھوں مسلمانا
لال زرد کا تانا بانا
قاضی کاج کرو تم کیسا
گھر گھر ذبح کراؤ ویسا

(— اے مسلمان میں تجھ سے پوچھتا ہوں، تو نے لال پیلا تانا بانا کیسا بن لیا ہے۔ اے قاضی تم کیسا کام کرتے ہو، گھر گھر جا کر ذبیحہ کرواتے ہو—

متن اور ترجمہ: کبیر وچناولی—سرسوتی سرن کیف)

کبیر نے صرف شیخ، قاضی اور ملاؤں پر طنز کے تیر نہیں برسائے بلکہ سادھوؤں کو بھی نشانہ بنایا ہے:

سادھو بھیا تو کیا بھیا مالا پہری چار
باہر بھیس بنایا بھیتر بھری بھنگار

(— چار چار مالائیں پہن کر سادھو بننے سے کیا ہوتا ہے۔ باہر سے تو بھیس بنا لیا اندر یعنی دل میں کوڑا کرکٹ بھرا ہے—

(کبیر وچناولی تالیف ہری اودھ ترجمہ: سرسوتی سرن کیف، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی)

کبیر نے مذاہب کی حقیقی روح پر کبھی وار نہیں کیا بلکہ مذاہب کے ظاہری لبادہ پر طنز کیا۔ کبیر کو جہاں پنیہ، پاپ، پوجا پاٹھ، ہون یگ، سبھی بے معنی رسومات لگتے تھے۔ وہیں مالا، تسبیح، مسجد، مندر، کعبہ، کیلاش سے بھی ان کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ ان سب چیزوں کو مذہب کی ایک ظاہری علامت کے طور پر دیکھتے تھے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ ہر انسان کے اندر کعبہ اور کیلاش ہے۔ اور خدا تک پہنچنے کا اصل ذریعہ عرفان نفس ہے۔ عشق الٰہی ہے۔ اگر خدا اور خدا کے بندوں سے محبت نہیں ہے تو اس طرح کے ظاہری مذہبی اعمال پورا کرنے پر بھی وہ خدا کا برگزیدہ بندہ نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کبیر نے مذہبی ریاکاری اور نمائش پسندی، مکاری، منافقت پر سوالات اٹھائے۔

کبیر کا ہر سوال نہایت منطقی اور معروضی ہوتا تھا۔ کبیر ریشنل انسان تھے۔ اس لیے انھوں نے بہت ہی لوجیکل سوالات کیے ہیں۔ ان کے ہر سوال میں ایک سائنٹفک انداز ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پتھر کو پوجنے سے کسی کو خدا مل سکتا ہے تو میں بڑے پہاڑ کو کیوں نہ پوجوں۔ غوطے لگانے سے نجات کے دروازے کھل سکتے ہیں تو پھر مینڈک تو روز ہی غوطے لگاتے ہیں۔ کبیر کا یہ بھی سوال ہے کہ کیا ایشور یا اللہ صرف مندر اور مسجد میں رہتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر باقی جگہ پر کون ہے۔ یہ بھی ایک سوال ہے کہ برہمن صرف 24 دن ہی برت رکھتے ہیں اور مسلمان رمضان میں صرف تیس روزے رکھتے ہیں تو کیا سال کے باقی دن منحوس ہیں۔

کبیر نے مذہب پرست معاشرہ سے جتنے بھی سوالات کیے ہیں وہ معقول ہیں۔ کبیر کے ہر سوال میں ایک زبردست کاٹ ہے۔ ایک طنز ہے ان تصورات پر جو مذہب کے نام پر لوگوں نے وضع کر لیے ہیں۔ کبیر یہ جانتے ہیں ہر وہ سوچ جس میں تفریق یا تعصب کی بو ہو وہ خدائی یا اُلوہی فکر نہیں ہو سکتی ہے۔ اسی لیے کبیر کا یہ بھی

خیال ہے کہ پیدائشی اعتبار سے کوئی برہمن یا شودر نہیں ہوتا۔ ان کا یہ اعتراض بھی معقول ہے کہ اگر جنیو پہن کر کوئی برہمن بن جاتا ہے تو برہمن اپنی عورتوں کو جنیو کیوں نہیں پہناتے۔ مسلمان ختنہ کرا کر مسلمان بن جاتے ہیں تو پھر عورتوں کا ختنہ کیوں نہیں کرایا جاتا؟ ایک معقولیت پسند انسان کے ذہن میں ہی اس طرح کے دندان شکن سوالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور کبیر کے تمام تصورات اور خیالات کی عمارت ایسے ہی سوالات پر کھڑی ہے۔ کبیر کا جو استفہامیہ ہے وہ ہر مذہبی معاشرہ کے لیے ہے۔ کبیر نے ہر اس تصور پر سوال اٹھائے ہیں جس کے اردگرد تقدس کا ہالا بن دیا گیا ہے۔ اور یہ انتباہ بھی دیا گیا ہے کہ یہ مقدس تصورات تنقید سے بالاتر ہیں۔ مگر کبیر نے ان تصورات کو بھی منہدم اور مسمار کرنے کی کوشش کی کہ دراصل ان تصورات کی کوئی حقیقت نہیں ہے اور نہ ہی ایسے افکار کی کوئی معروضی منطق ہے۔ کبیر نے اس تصور کو بھی مسترد کیا کہ کاشی میں مرنے سے مکتی مل جاتی ہے اور مگہر میں مرنے والے کو گدھے کی صورت میں جنم لینا پڑتا ہے۔ ''کاشی مرے سو مکتی پاوے مگہر مرے سو گدھا''

کیا کاشی کیا وسر مگہر رام ہروے بس مورا
جو کاشی تن تجے کبیرا دامے کون ہنورا

(— کاشی ہو یا اجاڑ مگہر میرے لیے دونوں برابر ہیں کیونکہ میرے دل میں بھگوان بسا ہوا ہے اگر کبیر کی روح کاشی میں نجات حاصل کرے تو اس میں رام کا کون سا احسان ہے —)

کبیر کے کلام میں بہت سارے سوالات ہیں اور ایسے ہی سوالات کو عقیدتوں میں محصور معاشرہ برداشت نہیں کر پایا۔ اسی لیے کبیر کو زاہد تنگ نظر نے کافر وزندیق اور دہریہ کہا اور ہندوؤں نے اُدھرم اور ان کی کردار کشی کرتے ہوئے یہ بھی الزام لگایا کہ کبیر کے بدکردار عورتوں سے ناجائز تعلقات رہے ہیں۔ جبکہ کبیر تو کائنات کے ورق پر ایک حرف محبت تھے۔ بس کبیر کا گناہ کبیرہ یہ تھا کہ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ظاہری مذہبی رسومات اور تخیلات کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا اور یہ احساس دلایا کہ مذہب کی بنیاد پر پہچان بے معنی ہے۔ نہ کوئی ہندو ہے نہ کوئی مسلمان۔ کعبہ اور کاشی ایک ہیں۔

کہے کبیر رام رم رہیا ہندو ترک نہ کوئی

(— کبیر کہتے ہیں کہ سبھی میں رام بسے ہوئے ہیں نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان —)

'سم درشتا' فکر کبیر کا ایک خصوصی وصف ہے۔ وہ ایک ہی نظر سے سارے انسان اور جہان کو دیکھتے ہیں۔

کبیر نے جو مذہبی ڈسکورس قائم کیا تھا آج بھی بہت سے دانشور اور مفکر انہی خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ دراصل ہمارے سائنسی عہد نے مذہب کے تعلق سے بھی ذہنوں میں بہت سے سوالات قائم کر دیے ہیں۔ کبیر نے جب یہ سوالات پوچھے تھے تو اس وقت شاید سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ یا لوگوں کا ذہن نہ اتنا سائنٹفک تھا نہ اتنے ذرائع تھے۔ لیکن کبیر کو جو وژن ملا تھا اس کی وجہ سے انھوں نے مذہب کی تہوں میں اتر کر ایسے سوالات کیے تاکہ مذہب کا حقیقی اور اصلی روپ لوگوں کے ذہن میں نقش ہو جائے۔

صدیوں پہلے جس کبیر نے جنم لیا تھا اور جس کی فکر نے معاشرے کے ایک بڑے طبقے پر اپنا اثر ڈالا تھا اس کے فکر کی معنویت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ کبیر ایک ایسے سورج کی مانند تھا جس کے وجود میں بہت ساری توانائیاں تھیں۔ انھوں نے اس عہد میں جو چراغ جلایا تھا اس کی لو مدھم ضرور ہے لیکن بجھی نہیں ہے۔ محبت کا جو چراغ کبیر نے روشن کیا تھا آج ہمارے معاشرے کو اسی چراغ کی ضرورت ہے۔ علی سردار جعفری نے بڑی اچھی بات لکھی تھی کہ ''پنڈت کا منتر اور مُلا کی اذان آسمان کے سناٹوں میں گم ہو جاتی ہے اور کبیر کا حرف محبت دھرتی کے سینے میں دھڑکتا رہتا ہے۔'' میں سمجھتا ہوں کہ روح کے کاغذ پر کبیر نے جو حرف محبت لکھا تھا وہ

کبیر نے جو مذہبی ڈسکورس قائم کیا تھا آج بھی بہت سے دانشور اور مفکر انہی خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ دراصل ہمارے سائنسی عہد نے مذہب کے تعلق سے بھی ذہنوں میں بہت سے سوالات قائم کر دیے ہیں۔ کبیر نے جب یہ سوالات پوچھے تھے تو اس وقت شاید سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ یا لوگوں کا ذہن نہ اتنا سائنٹفک تھا نہ اتنے ذرائع تھے۔ لیکن کبیر کو جو وژن ملا تھا اس کی وجہ سے انھوں نے مذہب کی تہوں میں اتر کر ایسے سوالات کیے تاکہ مذہب کا حقیقی اور اصلی روپ لوگوں کے ذہن میں نقش ہو جائے۔

سورج، چاند، ستاروں کی طرح ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

موجودہ سماجی اور سیاسی تناظر میں دیکھا جائے تو کبیر کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے کیوں کہ ہم جس عہد میں سانس لے رہے ہیں۔ مذہب، ذات، پات اور زبان کی بنیاد پر تنازعے بڑھ رہے ہیں۔ پوری دنیا میں علامتوں کی جنگ (War of Symbols) جاری ہے۔ سموئیل ہن ٹن گٹن کے تہذیبی تصادم Clash of Civilisation نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ سماجی اور سیاسی Dissonance بڑھتا جا رہا ہے۔ مذہبی تکثیریت کے اس ماحول میں پُرامن بقائے باہم اور بین مذاہب ہم آہنگی کی ضرورت بڑھ گئی ہے۔ Inter civlisational Discord کو ختم کرنے کے لیے Harmony without Uniformity کے اصول کو اختیار کرنا ہوگا۔ کبیر نے یہی راہ اختیار کی تھی کہ مختلف اعتقاد رکھنے والے امن اور ہم آہنگی کے ساتھ رہ سکیں۔ جیو اور جینے دو کے فلسفے پر عمل کر سکیں۔ کبیر نے اس زمانے میں جمہوریت اور حقوق انسانی کی آواز بلند کی تھی جب جمہوریت کا کوئی تصور بھی نہیں تھا۔ انھوں نے انسانی زندگی کے وجودیاتی مسائل کو اپنی شاعری کا مرکز بنایا اور انسانی سچائی اور صداقت کی تلاش کا عمل جاری رکھا۔ اس راہ میں وہ معتوب اور مقہور بھی ہوئے۔ مگر اپنی کج کلاہی قائم رکھی۔ انھوں نے بڑی جرأت اور استقامت کے ساتھ مذہبی معاشرے کی خامیوں، بدعملیوں اور مغالطوں کو بیان کیا اور جو بداعمالیاں مذہب کی راہ سے معاشرے میں در آئی تھیں ان کی شدید مذمت کی۔ سادہ لوح عوام کو اس دجل وفریب اور تلبیس کے جال سے باہر نکالا جو کفر مذہبی لوگوں نے عوام کے اردگرد بن رکھا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ سب اللہ کی مخلوق ہیں تو ایک مشترکہ زمین پر مشترک دکھ، درد اور خوشی کے ساتھ رہنا چاہئے اور سب کی بھلائی سوچنی چاہیے:

کبیرا کھڑا بازار میں مانگے سب کی خیر
نہ کاہو سے دوستی نہ کاہو سے بیر

یہی کبیر کی زندگی کا منشور تھا اور یہی ان کی شاعری کا ایجنڈا بھی۔ اور وہ اپنی وفات تک اسی منشور پر قائم رہے۔

آج ہم جس عہد میں جی رہے ہیں اس میں کبیر بانی کا احیا ضروری ہے کہ ہمیں نفرت نہیں محبت کے چراغوں کی ضرورت ہے۔

■

Haqqani Al Qasmi
Cel.:9891726444
Email.: haqqanialqasmi@gmail.com

خراج عقیدت

جی ایم پٹیل

ساحر لدھیانوی

عبدالحئی گھر کے تمام بچوں میں اپنی منفرد سوچ، مزاج میں افسردگی اور اپنے برتاؤ کی مناسبت سے کافی نرالے تھے۔ عبدالحئی کی ’تلخ یادوں کی پرچھائیاں‘ ان کی ذاتی زندگی پر غالب رہیں اور عبدالحئی کی حساس طبیعت اور وقت سے پہلے ہی زندگی کی کڑواہٹ نے انھیں کچھ سخت، تلخ اور انقلابی مزاج بنا دیا۔ والد چودھری فضل محمد جاگیردار، فرنگیوں کے طفیل میں ملیں جاگیریں، نہ محنت نہ مشقت، بس فرنگیوں کی خوشامد، عاجزی اور چاپلوسی یہی ان کا مشغلہ رہا۔ جاگیردارانہ رویہ، دولت کا گھمنڈ، عیاشی کے نت نئے سامان، کبھی میخانوں کے رقص نے انھیں معاشرتی، سماجی اور روایتی زندگی سے کوسوں دور رکھا اور اسی خمار میں وہ ’گیارہ سوتنیں‘ لے آئے۔ عبدالحئی اور ان کی والدہ نے جب اپنی ناراضگی، نفرت اور غصہ کا اظہار کیا تو فضل محمد نے ان دونوں کو اذیت پہنچانی شروع کر دی اور جب ظلم وستم برداشت سے باہر ہوا تو عبدالحئی کی والدہ نے انصاف پانے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ عبدالحئی نے عمر کے 12 سال ہی میں والدہ کو انصاف دلانے کے لیے فضل محمد کے خلاف عدالت میں گواہی دے دی۔ فضل محمد بے قابو اور اس قدر غصہ میں تھے کہ انھوں نے عبدالحئی کو جان سے مارنے کی دھمکی دے دی اور جب انھوں نے ماں کی ممتا کو للکارا تو ماں نے اپنے سارے زیورات اور رہی سہی پونجی داؤ پہ لگا دی اور عبدالحئی کی حفاظت کے لیے گارڈ تعینات کر دیے۔ فضل محمد کی بے رخی، ظالمانہ برتاؤ، نہ ہی عبدالحئی اور نہ ہی والدہ کے جذبات و احساسات کی کوئی قدر و قیمت۔ بالآخر عبدالحئی نے اس جاگیردارانا روایت کو ٹھکرا دیا اور صرف اس روایت کو قبول کیا کہ ماں کے پاؤں تلے جنت ہوتی ہے اور آخری دم تک اسے نبھاتے رہے۔ عبدالحئی اور اس کی ماں ان کے چچا جان کے پاس رہنے لگے اور عبدالحئی نے اپنی تعلیم جاری رکھی۔

ایک یخ بستہ اداسی ہے دل و جاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی نہ امید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی اُمیدوں کا خروش

عبدالحئی کی ابتدائی بنیادی تعلیم مالوہ یا خالصہ اسکول میں ہوئی۔ امرتا بھی اسی اسکول میں زیرِ تعلیم تھیں۔ عبدالحئی نے جب امرتا کو دیکھا تو امرتا کی خوبصورتی نے انھیں پاگل کر دیا۔ عشق کی چنگاری ان کے دل و دماغ میں سلگ گئی جس سے آہستہ آہستہ عشق و محبت کے شعلے لپکنے لگے۔ کالج کی نشاط خیز فضا، گلہائے رنگ و بو اور حسین محبوبہ کے کارواں اور عشق کے راگ الاپتے وادیٔ عشق میں پرواز کا آغاز شروع ہوا۔ عبدالحئی نے امرتا کا پتہ ڈھونڈ لیا وہاں پہنچ گئے اور امرتا کی چاہت، اس جنون میں امرتا کی ایک جھلک کے لیے وہ بے تاب رہتے۔ جس کے لیے قریبی چائے کی دُکان میں چائے کی چسکیوں کے ساتھ اپنی نظروں کو امرتا کے دیدار کے لیے متحرک رکھتے۔ بالآخر امرتا نے عبدالحئی کی محبت کے جنون اور نظروں سے جھلکتی عشق کی عبارت کو پڑھ لیا اور اب دونوں میں سُلگ گئیں عشق کی چنگاریاں۔ نزدیکیاں بڑھیں اور دونوں بے تکلف ہوئے، ملاقاتوں کے سلسلے بڑھتے ہی چلے گئے۔ ان دونوں کی داستانِ عشق جب اسکول کی دیواروں پر پھلانگنے لگیں تو اس کی خبر امرتا کے والد کرتار سنگھ تک پہنچی۔ انھوں نے اسکول کے پرنسپل کی بدنظامی کے لیے انھیں خوب بھلا برا کہا اور پرنسپل سے فوراً ایکشن لینے کو کہا اور پرنسپل نے عبدالحئی کو اسکول سے بے دخل کر دیا۔ اس خطرناک حادثہ نے امرتا اور عبدالحئی کے دل و دماغ پر ایک گہری ضرب، گہری چوٹ اور گہرے عشقیہ زخم لگائے۔ عبدالحئی اور امرتا دونوں میں عشق گہرا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امرتا نے قسم کھائی کہ وہ اپنی زندگی میں عبدالحئی کو حاصل کر کے ہی دم لے گی اور حقیقی طور سے امرتا اپنی ضد اور اپنی قسم پہ زندگی کی آخری سانس تک قائم رہیں۔ ان کے ٹوٹے، بکھرے، مجروح جذبات نے عبدالحئی میں ایک نئی روح پھونک دی اور عبدالحئی اسی دور طالب علمی میں اپنی معیاری اور پختہ شاعری کا آغاز کیا۔

عبدالحئی نے کالج میں اپنا تخلص ’ساحر‘ اختیار کر لیا۔ ان کی تمثیل کاری، منظوم ڈرامہ نگاری، منظر کشی، فنی مصوری، احساسات اور جذبات کی عکاسی بے مثال تھی ’پرچھائیاں‘ یہ طویل نظم ان کی زندہ جیتی جاگتی مثال سارے عالم کے سامنے موجود ہے جو ساحر کی طالب علمی کے زمانے کی عشقیہ تخلیق کا ایک سنگِ میل ہے۔ ایک شاہکار ہے۔ پرچھائیاں مشاعروں کی جان بن گئی اور تقریباً ہر مشاعرے میں اس کی فرمائش ضرور ہوتی۔ ساحر کی اسی طویل منظوم تمثیل کاری، اس داستان عشق نے اردو ادب میں ایک اعلیٰ ترین مقام پالیا جو آج بھی برقرار ہے۔ اس طرح ساحر نے کم عمری میں اپنا لوہا منوالیا اور اپنی عشق کی داستان کو امر بنا دیا۔ یہ مبالغہ ہرگز نہیں۔ پرچھائیاں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ساحر نے پرچھائیاں امرتا سے اپنی محبت اپنے عشق کے نیک جذبے اور نفیس احساس کی بہترین عکاسی کی ہے۔

وہ پیڑ جن کے تلے ہم پناہ لیتے تھے
کھڑے ہیں آج بھی ساکت کسی امیں کی طرح
انھیں کے سائے میں پھر آج دو دھڑکتے دل
خموش ہونٹوں سے کچھ کہنے سننے آئے ہیں
نہ جانے کتنی کشاکش سے کتنی کاوش سے
یہ سوتے جاگتے لمحے چُرا کے لائے ہیں
یہی فضا تھی، یہی رُت، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی
دھڑکتے دل سے، لرزتی ہوئی نگاہوں سے
حضورِ غیب میں ننھی سی التجا کی تھی

کہ آرزو کے کنول کھل کے پھول ہو جائیں
دل و نظر کی دعائیں قبول ہو جائیں
تصورات کی پرچھائیاں اُبھرتی ہیں
کبھی گمان کی صورت کبھی یقیں کی طرح

ساحر سے امرتا کا آغازِ عشق بھی کچھ اسی انداز سے ہوا تھا۔ دونوں ملتے رہے، روحوں میں سماتے گئے۔ جب دونوں کی داستانِ عشق مقامی لوگ گنگنانے لگے، کالج کی دیواروں پر ان کی محبت کی داستاں پھلا نگنے لگی۔

ساحر کے دل کا سوز، خلش، چبھن اور تکلیف کا احساس 'تلخیاں' کے مطالعے سے ہوتا ہے کہ ساحر کس قدر حساس تھا۔ ایک معمولی سا حادثہ، معمولی چوٹ، ناانصافی اسے ہرگز برداشت نہ ہوتی اور وہ فوراً اپنا ردِّعمل ظاہر کرتا اسے کاغذ پر اتارتا اور پڑھنے والوں کو تڑپا دیتا، انھیں رلا دیتا، ان کے ضمیر کو جگا دیتا۔ یہی اس کی زندگی کی تلخیاں ہیں۔ اس کی تلخ یادوں کا پہلا مجموعہ 'تلخیاں' شائع ہوا جس میں تقریباً 52 نظمیں شامل ہیں۔ چاہنے والوں نے، پرستاروں نے ساحر کے مجموعۂ کلام 'تلخیاں' کو ہاتھوں ہاتھ لے لیا اور جاگیر دار عبدالحئی اب عوامی ساحر 'ساحر لدھیانوی' کا مظہر بن گئے۔ تلخیاں کے کئی شمارے چھپ چکے ہیں۔ ساحر درد و غم اور کسک کی آماجگاہ تھا جس میں مزدوروں، کسانوں اور ہر مظلوم کا درد بھرا ہوا تھا جو اسے کسی پل چین نہ دیتا۔

ہر ایک جسم گھائل، ہر ایک روح پیاسی
نگاہوں میں اُلجھن دلوں میں اداسی، یہ دنیا ہے یا عالمِ بدحواسی
یہاں ایک کھلونا ہے انساں کی ہستی
یہ بستی ہے مردہ پرستوں کی بستی، یہاں پر تو جیون سے ہے موت سستی

ساحر ہی تو تھا جو دوسروں کے چوٹ لگنے سے خود مجروح بے چین ہو کر ان کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ ہو کر ظلم کے خلاف آواز بلند کرتا۔

خون پھر خون ہے سو شکل بدل سکتا ہے
ایسی شکلیں کہ مٹاؤ تو مٹائے نہ بنے
ایسے شعلے کہ بجھاؤ تو بجھائے نہ بنے
ایسے نعرے کہ دباؤ تو دبائے نہ بنے
یہ کوچے یہ نیلام گھر دل کشی کے
یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے
کہاں ہیں، کہاں ہیں محافظ خودی کے
ثنا خوانِ تقدیسِ مشرق کہاں ہیں
ذرا ملک کے رہبروں کو بلاؤ
یہ کوچے، یہ گلیاں یہ منظر دکھاؤ

دہلی میں ساحر کو نہ ہی دلی سکون حاصل تھا اور نہ ہی اپنے کامیاب مستقبل کی کوئی امید انھیں نظر آ رہی تھی! اسی کشمکش، اضطراب و بے چینی کے عالم میں ساحر نے اچانک ہی دہلی چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ اپنی امی کو وہیں دہلی میں پرکاش پنڈت کے پاس چھوڑ کر اور خود 'بمبئی' پہنچ گئے اور بمبئی میں چار بنگلہ میں کرشن چندر کے پاس رہنے لگے۔ اب ان کا رجحان بمبئی میں فلمی نغمے لکھنے کی طرف راغب ہوا اور اپنی خواہش کے مطابق اسی جدوجہد میں رہے اور بالآخر کافی کوششوں کے بعد 1948 میں ساحر کو 'آزادی کی راہ' اس فلم کے لیے پہلا گیت لکھنے کا موقعہ ملا۔ نغمے کے اشعار کچھ یوں تھے۔

یہ اجڑی اجڑی بستیاں، یہ لوٹ کی نشانیاں
وہ اجنبی پہ اجنبی کہ ظلم کی کہانیاں
اب دکھوں کے باہر، نکل رہی ہے زندگی
بدل رہی ہے زندگی

فلم کامیاب تو نہیں ہوئی البتہ ساحر نے جادوئی نگری بمبئی پر دستک دے دی۔ دو سال بعد 1951 میں فلم 'نوجوان' کے نغمے لکھے۔ جس کے موسیقار تھے 'برمن دادا'۔ ساحر کے لکھے ان فلمی نغموں نے دھوم مچائی۔ نغموں کو فلمی شائقین نے بے حد پسند کیا۔

ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں
رت ہے جواں، ان کو یہاں، کیسے بلائیں
چاند اور تارے، ہنستے نظارے
مل کے سبھی، دل میں سکھی، جادو جگائیں...... ٹھنڈی ہوائیں

ہدایت کار گرودت اور موسیقار برمن دادا کی 'بازی' اور اس کے بعد 'پیاسا' ان فلموں کے نغموں نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے اور ساحر اب فلمستان بمبئی کے افق کا جگمگاتا روشن ستارہ بن گیا۔

تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنالے، تقدیر بنالے
اپنے پہ بھروسہ ہے تو یہ داؤ لگا دے، یہ داؤ لگا دے

یہ لٹتے ہوئے کارواں زندگی کے،
کہاں ہیں کہاں ہیں محافظ خودی کے
جنھیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں؟

یہ محلوں، یہ تختوں، یہ تاجوں کی دنیا
یہ انساں کے دشمن، سماجوں کی دنیا
یہ دولت کے بھوکے، رواجوں کی دنیا
یہ دنیا اگر، مل بھی جائے تو کیا ہے

ساحر میں تکبر نہیں تھا، اپنی ذہانت، قلم کی جادوگری اور خود اعتمادی اس قدر کہ چشم زدن میں ساحر نے فلمی دنیا پر اپنا سکہ جما لیا اور آگے آگے زمانے نے وہ دن بھی اجاگر کر دیے جہاں فلمی دنیا کی ہر فلم ساحر کے حوالے سے جانی جانے لگی۔ اب پروڈیوسر کا خواب ہوتا کہ ان کے فلم کے نغمے ساحر کے لکھے ہوئے ہوں۔ ساحر میں یہ خداداد چیز تھی کہ محبت کے گیت لکھتا تو پیار کرنے والے دو دل دھڑک جاتے، ساتھ ساتھ چرند پرند بھی تھرکنے لگتے۔ دکھ بھرے گیت میں فنکار کے ساتھ ساتھ دھرتی کا سینا کا بھی کانپ جاتا۔ اس طرح ساحر نے اپنے سینہ کی جلن اپنے دکھ درد، اپنے احساسات کی عکاسی کی اور ناظرین کو مقبول ترین نغموں کی سوغات کا نذرانہ پیش کیا۔ ہر فلم پرستار بخوبی واقف ہے کہ معروف ہدایت کار اور اداکار 'راج کپور جی' کی تقریباً ہر فلم کے موسیقار 'شنکر جے کشن' ہوا کرتے ہیں۔ لیکن فلم 'پھر صبح ہوگی' کے لیے محض ساحر کے اصرار پر 'موسیقار خیام' کو ترجیح دی گئی۔ محض اس لیے کہ 'موسیقار خیام' نے 'کرائم اور پنیش منٹ' ناول کو بخوبی سمجھ کر پڑھ لیا تھا اور اسی ناول پر بنی فلم 'پھر صبح ہوگی' کی کہانی تھی۔

ہندوستانی فلمیں اکثر فلمی نغموں کے وجہ سے ہی کامیاب ہوتی ہیں مگر فلموں میں صرف موسیقار کا نام ہی نمایاں ہوتا ہے، پردوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ خوددار اور انصاف پسند ساحر نے بڑی ہمت، اور دلیری سے پروڈیوسر سے تکرار کی کہ "جتنی رائیلٹی کی رقم موسیقار کو ملتی ہے اس سے ایک روپیہ زیادہ نغمہ نگار کو ملنا چاہیے"۔ سارے پروڈیوسر پہلے تو کافی پریشان ہوئے، پر جب انھوں نے غور کیا اور ان کی فلموں کی کامیابی کا جائزہ لیا تو وہ جان گئے کہ ان کی فلموں کی کامیابی کے روحِ رواں تو فلمی نغمے ہی ہیں۔ تب انھوں نے ساحر کی شرط مان لی اور یہ بھی تسلیم کر لیا کہ ہر فلم کے 'موسیقار' کے نام کے ساتھ ساتھ 'نغمہ نگار' کا نام بھی نشر ہوگا اور چھپے گا۔

بچپن میں ساحر کے ذہن پر لگی ضرب نے انھیں تلخ مزاج، افسردہ، اداس بنا دیا، ان کی خواہشات، ان کے ارمانوں کو مانوس کر دیا۔ احساسِ کمتری اس قدر کہ ہر مثبت سوچ میں منفی کو ترجیح دینا ان کی فطرت میں شامل ہوا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مارے خوف کے وہ ٹرین یا ہوائی جہاز سے سفر کرنا ٹالتے اور صرف کار ہی سے سفر کرنا پسند کرتے اور اپنے ساتھ ایک دوسری کار بھی رکھ لیتے تاکہ ایک کار میں بگاڑ آ جائے تو اس اضافی کار سے ان کا سفر مسلسل جاری رہے۔ ساحر شراب کے عادی بالکل بھی نہیں تھے۔ لیکن جب انھیں 'لو بلڈ پریشر' کی شکایت ہوئی تو خود ڈاکٹر نے کچھ الکحل لینے کی اجازت انھیں دے دی۔ انھوں نے بطور دوا الکحل پینا شروع کیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ساحر الکحل کے اس قدر عادی ہوئے کہ بعد ازاں شراب نے ساحر کو پینا شروع کر دیا۔ ساحر کی نایاب تخلیق 'کبھی کبھی' نے سارے عالم میں اور کم عرصہ میں اپنی مقبولیت کی تمام بلندیوں کو چھو لیا۔

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آیا ہے
کہ زندگی تری زلفوں کی نرم چھاؤں میں

گزرنے پاتی تو، شاداب ہو بھی سکتی تھی
یہ تیرگی، جو مری زیست کا مقدر ہے
تری نظر کی شعاعوں میں، کھو بھی سکتی تھی
عجب نہ تھا کہ میں بیگانۂ الم ہوکر
ترے جمال کی رعنائیوں میں کھو رہتا
ترا گداز بدن، تیری نیم باز آنکھیں
انہی حسین فسانوں میں محو ہو رہتا
پکارتیں مجھے جب تلخیاں زمانے کی
ترے لبوں سے حلاوت کے گھونٹ پی لیتا
حیات چیختی پھرتی برہنہ سر اور میں
گھنیری زلفوں کے سائے میں چھپ کے جی لیتا
مگر یہ ہو نہ سکا اور اب یہ عالم ہے
کہ تو نہیں ترا غم نہیں، تیری جستجو بھی نہیں
گزر رہی ہے کچھ اس طرح زندگی جیسے
اسے کسی سہارے کی آرزو بھی نہیں
نہ کوئی جادہ، نہ منزل نہ روشنی کا سراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
انھیں خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھوکر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس، مگر یوں ہی
کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے

ساحر بمبئی میں اور امرتا پریتم دہلی میں مقیم تھیں۔ ساحر امرتا کی ملاقات کے لیے کئی دفعہ دہلی پہنچ کر دونوں کی طالب علمی میں ہوئی پہلی محبت کی یادوں کو آباد و شاداب رکھتے اور اپنی طویل نظم 'پرچھائیاں' میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ امرتا پریتم ایک پنجابی خاتون نے بڑی بے باکی و دلیری سے ساحر سے اپنے بے لوث، لافانی اور روحانی عشق کو سارے زمانے کے سامنے اپنی نظم 'سنہڑے' اور 'رسیدی ٹکٹ' میں عام کردیا۔ امرتا کی داستان عشق میں 'دہرہ دون کے ایک مشاعرے کے کچھ طربیہ لمحات کا ذکر کافی رومانی ہے۔ جب پریتم کو پتہ چلا کہ اس کے دل کی دھڑکن ساحر بھی اس میں مدعو ہے تو بس وہ مخبوط الحواس ہوئیں۔ موسم کی پرواہ کیے بغیر اس گاؤں پہنچ گئیں اور مشاعرے میں جب ساحر کو اپنے روبرو دیکھا تو بس دیکھتی ہی رہ گئیں۔ مشاعرے کے بعد امرتا اور ساحر دونوں نے قریب 5 کلومیٹر کا فاصلہ ایک ساتھ پیدل طے کیا۔ امرتا نے ساحر کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور رب سے فریاد کرتی رہی کہ یوں ہی ساحر کا ساتھ رہے اور اسی چہل قدمی میں ساری عمر بیت جائے۔ اب خود امرتا کی زبانی بھی عشقیہ کلام حاضر ہے جو ساحر کی سوانح کا اہم جزو بھی ہے۔

''جب کبھی ساحر، مجھ سے ملنے گھر آتا تو جیسے میری ہی خاموشی سے نکلا خاموشی کا ایک ٹکڑا میرے سامنے کرسی پر بیٹھ کر چپ چاپ سگریٹ کے کش پہ کش لگاتا، آدھی سگریٹ کو بجھا کر راکھ دانی میں رکھ دیتا اور جب میں تنہا ہوتی اور عشق کی آگ سینے میں سلگتی تو سگریٹ کے ان ٹکڑوں کو الماری سے نکال کر اپنی انگلیوں سے چھو لیتی تو بس ساحر کی انگلیوں کا لمس مجھ میں روحانی مسرت کا احساس ہوجاتا۔ یہیں سے میں سگریٹ نوشی کی عادی ہوگئی۔'' ایک دن ساحر تھکا تھکا یا میرے گھر دہلی پہنچ گیا۔ میں نے جب اس کے ماتھے کو چھوا تو اسے تیز بخار تھا۔ اس کے گلے میں خشکی، سانسوں میں کھنچاؤ کی کیفیت۔ اس روز میں پیروں پر کھڑی، پوروں سے، انگلیوں اور، ہتھیلیوں سے اس کے چھاتی اور گلے پر وِکس ملتی رہی اور رب سے فریاد کرتی رہی۔ 'اسی کیف میں گم، اسی حالت میں میری زندگی تمام ہوجائے'' '' 1946 میں جب میرا بیٹا میرے جسم کی آس بنا تھا۔ تب میں نے اپنے خیالات اور اپنے تصور میں ساحر کے چہرے کو بسائے رکھا، جسے زندگی میں نہ پاسکی۔ اسے خوابوں میں پالینے کی ایک کرشمہ ساز کوشش، جسم کا ایک آزادانہ عمل صرف روایت ہی سے نہیں خون اور نسل کی گرفت سے بھی رہائی۔ جب 3 جولائی 1947 میں بچے کا جنم ہوا اور جب پہلی بار میں نے اس کی شکل دیکھی تو اپنی خلاقی پر یقین ہوا اور بچے کے واضح ہوتے ہوئے خد و خال کے ساتھ اپنا تصور واقعی ساحر کا متشکل ہوتا نظر پڑا اور میرے بیٹے کی کی صورت سچ مچ ساحر سے ملتی تھی''

'' جب مجھے پتہ چلا کہ ساحر دہلی آیا ہے۔ ساحر سے ملاقات کے لیے میں امروز کے ہمراہ اس ہوٹل پہنچ گئی جہاں ساحر رکا ہوا تھا۔ گپ شپ بحث کے بعد ٹیبل پر تین گلاس میں شراب چھلک گئی، نہ میں نے اور نہ ہی امروز نے، بس ساحر اکیلا ہی پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہم دونوں وہاں واپس گھر نکل گئے۔ آدھی رات قریب 12 بجے ساحر نے مجھے فون کیا۔ ساحر نے اپنی اس تنہائی میں لکھی نظم مجھے سنائی۔

محفل سے اُٹھ جانے والو، تم لوگوں پر کیا الزام
تم آباد گھروں کے باسی، میں آوارہ اور بدنام
تم دنیا کو بہتر سمجھے، میں پاگل تھا خوار ہوا
تم کو اپنانے نکلا تھا، خود سے بھی بیزار ہوا
دیکھ لیا گھر پھونک تماشہ، دیکھ لیا اپنا انجام
میرے ساتھی، خالی جام

فلم فیئر ایوارڈ یافتہ نظم 'تاج محل' کو ساحر نے ایک تحفے کی صورت مجھے عطا کیا۔ میں نے انمول تحفہ کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے محفوظ رکھا۔

اَن گنت لوگوں نے دُنیا میں محبت کی ہے
کون کہتا ہے کہ صادق نہ تھے جذبے ان کے
لیکن ان کے لیے تشہیر کا سامان نہیں
کیونکہ وہ لوگ بھی میری ہی طرح مفلس تھے
یہ چمن زار، یہ جمنا کا کنارہ یہ محل
یہ منقش در و دیوار، یہ محراب یہ تاک
ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

اعزازات: 1970 گولڈ میڈل گورنمنٹ کالج لدھیانہ، 1970 میں مہاراشٹر اسٹیٹ لٹریری ایوارڈ، 1071 میں پدم شری، 1972 سویت لینڈ نہرو ایوارڈ

فلمی ایوارڈس : 1959 تاج محل، 1964، سادھنا (عورت نے جنم دیا مردوں کو)، 1977 کبھی کبھی۔

ہند و پاک جنگ کے بعد 1972 میں ہمارے نوجوانوں نے کچھ فوجی چوکیوں کے نام ساحر کے نام پر رکھے۔ ساحر کی 'پنڈت نہرو' پر لکھی نظم کو سٹی پارک کرنال میں نصب کے لیے پنڈت جواہر لال نہرو کے مجسمہ کے نیچے ان کی وصیت کے ساتھ کندہ کیا گیا۔ سینا سیوا کور پس کے لیے 'ترانۂ ساحر لدھیانوی نے لکھا۔ سول لائن لدھیانہ میں ایک سڑک کا نام 1975 میں 'ساحر روڈ' رکھا گیا۔

تصانیف: تلخیاں، پرچھائیاں، گاتا جائے بنجارا (گیتوں کا مجموعہ) آؤ کہ خواب بنیں، نظموں کا مجموعہ

25 / اکتوبر کا وہ دن بھی آگیا جب ان کی بہن انور سلطانہ ساحر کو ڈاکٹر کپور کے یہاں لے گئیں۔ اس وقت ساحر اچھے خاصے تھے۔

ڈاکٹر سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ان کا سر ڈھلک گیا اور وہ خاموش ہوگئے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس طرح چشم زدن میں ایک ادبی روشن ستارہ ٹوٹ گیا آسماں سے۔ ساحر کے لاکھوں پرستاروں، شیدائیوں اور اس کے چاہنے والوں نے نم آلود آنکھوں سے ساحر کو الوداع کہا۔

سارے ماحول میں ساحر کا مقبول ترین نغمہ گونج اُٹھا

میں پل دو پل کا شاعر ہوں پل دو پل مری کہانی ہے
پل دو پل میری ہستی ہے پل دو پل مری جوانی ہے
مجھ سے پہلے کتنے شاعر آئے اور آکر چلے گئے
کچھ آہیں بھر کر لوٹ گئے کچھ نغمے گا کر چلے گئے
وہ بھی اک پل کا قصہ تھے میں بھی اک پل کا قصہ ہوں
کل تم سے جدا ہو جاؤں گا گو آج تمہارا حصہ ہوں
کل اور آئیں گے نغموں کی کھلتی کلیاں چننے والے
مجھ سے بہتر کہنے والے تم سے بہتر سننے والے

■

Dr. G M Patel
B5/402, Bramha Majestic, NIBM Road
Kondhwa Khurd
Pune - 4110048 (MS)
Mob.: 9822 031 031

ایم نسیم اعظمی

مولانا محمد علی جوہر

تعلیمی نقطہ نظر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی مرحوم کاقومی اردو کونسل اور ماہنامہ اردو دنیا سے خاص لگاؤ تھا۔ ان کی نگارشات اس مجلہ میں اہتمام کے ساتھ چھپتی بھی رہی ہیں۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے مگر قلم و قرطاس سے ان کا رشتہ زندگی کی آخری سانس تک قائم رہا۔ انہوں نے علالت کے دوران وفات سے قبل ماہنامہ 'اردو دنیا' کے لئے یہ قیمتی مضمون تحریر کیا تھا یہ شاید ان کی زندگی کی آخری تحریر ہو۔ ان کی صاحبزادی عدیلہ نسیم نے یہ مضمون 'اردو دنیا' کو ارسال کیا تھا۔ ایم نسیم اعظمی کی پہلی برسی پر ان کی یہ بیش قیمت تحریر قارئین کی خدمت میں پیش ہے۔

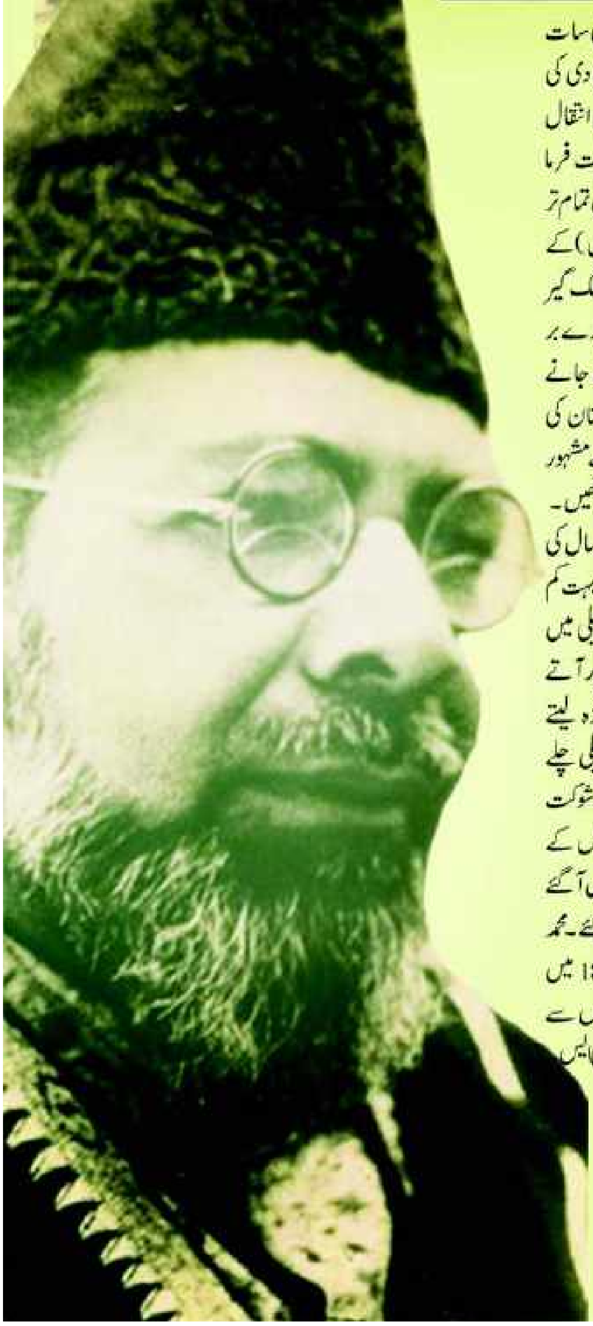

مولانا محمد علی جوہر (1878-1931) کا شمار ہندوستان کی ان مایہ ناز اور نابغۂ روزگار ہستیوں میں کیا جاتا ہے، جنھوں نے ہندوستان میں آزادی، ذہنی فکری بیداری، ہندو مسلم اتحاد، خلافت اور قومی تعلیم کی فضا سازی اور فروغ میں تاریخ ساز اور انقلاب آفریں کارنامے انجام دیے۔ وہ بیک وقت ممتاز و بے باک مجاہد آزادی، مصلح قوم، سیاسی رہنما، خطیب وصحافی، ادیب وشاعر، مفکر تعلیم اور عالم اسلام میں خلافت کے علمبردار تھے۔ انھوں نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے اور آزادی سے ہم کنار کرانے کے لیے مایوسی واضمحلال کے عام ماحول میں نئے عزم و حوصلے سے کام لیتے ہوئے نو آبادیاتی نظام کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ کسی بھی حال میں اسے باقی رکھنے یا قبول کرنے سے ہی انکار کر کے اس ذہنیت وتہذیب کے خاتمے کے لیے ایسی ماحول سازی کر دی کہ بالآخر 1947 میں انھیں مجبوراً ہندوستان کو آزاد کرنا پڑا۔

مولانا محمد علی جوہر ریاست رام پور میں 10 / دسمبر 1878 کو پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان ریاست رام پور کا وفادار اور خدمت گزار تھا۔ اس لیے اس خاندان کے بہت سے لوگ ریاست کے سول اور فوجی محکموں میں ملازم تھے۔ مولانا محمد علی کے دادا شیخ علی بخش غالباً پہلے ایسے شخص تھے جنھوں نے ریاست رام پور کی ملازمت اختیار کی تھی۔ ان کے والد عبدالعلی خاں بھی اسی ریاست سے وابستہ تھے اور دوران ملازمت ہی صرف 32 سال کی عمر میں شادی کے چند سالوں بعد ہی ہیضہ کی بیماری میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے انتقال کے وقت ان کی اہلیہ آبادی بانو (بی اماں) کی عمر 27 سال، شوکت علی کی سات سال اور محمد علی کی دو سال تھی۔ عبدالعلی خاں اور آبادی کی کل چھ اولادیں ہوئیں۔ بندہ علی کا کم سنی میں انتقال ہو گیا۔ نوازش علی بھی تیرہ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ ذوالفقار علی، شوکت علی، محمد علی اور محمدی بیگم کی تمام تر پرورش و پرداخت ان کی والدہ آبادی بانو (بی اماں) کے زیر سایہ ونگرانی ہوئی جس میں شوکت علی اور محمد علی ملک گیر اور عالمی شہرت ومقبولیت سے ہم کنار ہوئے اور پورے بر صغیر اور ساری دنیا میں علی برادران کے نام سے جانے پہچانے گئے۔ ان کی والدہ آبادی بانو بھی ہندوستان کی اہم ترین خاتون رہنما اور بی اماں کے نام سے مشہور ہوئیں۔ وہ بڑی بے باک، پرعزم اور باہمت خاتون تھیں۔

محمد علی سب سے چھوٹے تھے۔ تقریباً پانچ سال کی عمر میں ان کی مکتبی تعلیم کا آغاز ہوا۔ انھوں نے بہت کم دنوں میں کلام پاک ناظرہ ختم کر لیا۔ شوکت علی بریلی میں زیر تعلیم تھے اور اکثر تعطیل کے دنوں میں رام پور آتے تھے اپنے چھوٹے بھائی محمد علی کی پڑھائی کا جائزہ لیتے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد محمد علی بھی ان کے ہمراہ بریلی چلے گئے اور تقریباً چار سالوں تک وہاں زیر تعلیم رہے۔ شوکت علی جب بریلی سے علی گڑھ آ گئے اور سر سید احمد خاں کے قائم کردہ مدرسہ میں داخلہ لے لیا تو محمد علی بھی یہیں آ گئے اور دونوں بھائی علی گڑھ میں حصول تعلیم میں لگ گئے۔ محمد علی 1892 تک یہاں رہے اور یہیں سے 1894 میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ 1898 میں امتیازی نمبروں سے بیس سال کی عمر میں بی. اے. کیا۔ اس کے بعد آئی سی ایس

(موجودہ آئی اے ایس) کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کی غرض سے لندن چلے گئے مگر آئی سی ایس (ICS) میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ پھر دوبارہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے 'جدید تاریخ' میں بی. اے. آنرز کی ڈگری لے کر ہندوستان آئے اور رام پور اسٹیٹ ہائی اسکول کے پرنسپل اور ریاست کے چیف ایجوکیشن آفیسر مقرر کیے گئے اور انھوں نے اس منصب پر رہتے ہوئے ریاست رام پور میں بہت سی تعلیمی اصلاحات کا نفاذ بھی کیا۔ اس طرح ان کی عملی زندگی کا آغاز ہی تعلیمی خدمات، نظم وضبط اور تعلیم وتعلم وغیرہ سے ہوا۔ لیکن وہ فطرتاً بڑے حق پرست، صاف گو، کھرے اور بے باک قسم کے انسان تھے اس لیے ان کی ریاست رام پور کے عملے اور نواب حامد علی خان سے ہم آہنگی نہ ہو سکی اور بالآخر اختلاف رونما ہو گیا اور انھوں نے ریاست رام پور کی ملازمت چھوڑ دی۔

ریاست رام پور کی ملازمت ترک کرنے کے بعد محمد علی 1903 میں ریاست بڑودہ میں ملازم ہو گئے اور تقریباً سات سالوں تک انتہائی خوش اسلوبی سے اپنی ذمے داریوں کو نبھاتے ہوئے بالآخر ملازمت نہ کرنے کا فیصلہ کر کے صحافت میں آگئے اور اخبار کے اجرا کا ارادہ کرلیا۔

1911 میں 'کامریڈ' (انگریزی) کا کلکتہ سے اجراء ہوا۔ 1912 میں دارالحکومت کلکتہ سے دہلی منتقل ہوا تو کامریڈ بھی 12 / اکتوبر 1912 سے دہلی سے نکلنے لگا۔ فروری 1913 میں دہلی سے اردو اخبار 'نقیب ہمدرد' بھی نکالا جو جون 1914 میں 'ہمدرد' کے نام سے شائع ہونے لگا۔ مولانا محمد علی کو مسلمانوں کے سارے مسائل ومعاملات سے شروع سے ہی دلچسپی رہی ہے کیونکہ وہ مسلمانوں کے سچے رہنما اور بہی خواہ تھے۔ انھیں مسلمانوں کی تعلیم سے بھی دلچسپی تھی اور تعلیم کو ہی وہ ہر قسم کی ترقی کی کلید اور ہر درد کا مداوا تصور کرتے تھے اس لیے تعلیم کے معاملات میں جہاں پوری سنجیدگی سے غور وفکر کرتے تھے وہیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، چنانچہ 1902 میں لارڈ کرزن نے ہندوستان میں تعلیم کو محدود کرنے کی غرض سے سرکاری اسکولوں میں تعلیمی فیس میں اضافہ کرنا چاہا تو محمد علی نے اس کی کھل کر مخالفت کی اور ہندوستانیوں کے حق میں نامناسب قرار دیتے ہوئے دہلی کی ایک تعلیمی کانفرنس میں تعلیمی فیس کے اضافے کو نقصان دہ بتاتے ہوئے بڑے صاف لفظوں میں کہا تھا۔

''یہ کانفرنس لارڈ کرزن کے متعین کردہ فیس سے متفق نہیں ہے۔........ واقعات ومشاہدات اور تجربوں کی بنیاد پر ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی رائے مسترد کردیں اور گورنمنٹ پر ثابت کریں کہ ان تجاویز سے یہ نقصان ہیں''

علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے 'جدید اردو تعلیم کی ضرورت' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس کی کافی شہرت بھی ہوئی تھی اور جو اس زمانے میں انسپکٹر آف اسکول کی رپورٹ کے ساتھ 22 / ستمبر 1890 کو 'رام پور اسٹیٹ گزٹ' میں شائع بھی ہوا تھا۔ علی گڑھ میں محمد علی کی قوت حافظہ، مضبوط یادداشت اور وسعت معلومات کا بھی بڑا شہرہ تھا جس کو سن کر مولانا شبلی نعمانی نے بھی انھیں اور ان کے بھائی کو اپنے گھر بلایا تھا اور کھانے پر مدعو کیا تھا اور ان کا امتحان لینے کی غرض سے خلیفہ مامون رشید کی اولاد کا سلسلہ جاننا چاہا تھا نیز خلیفہ کے شجرے کی تفصیل بھی پوچھی تھی اور محمد علی کے تسلی بخش جواب سے خوش بھی ہوئے تھے اور متاثر بھی۔ اور ایک مصرعہ دے کر اور دوسرا مصرعہ لگا کر شعر مکمل کرنے کے لیے بھی کہا تھا اور جب انھوں نے برجستہ شعر پورا کردیا تو ان کی ذہانت ووسعت معلومات کا جادو مولانا شبلی نعمانی پر بھی چل گیا اور دونوں میں اچھے تعلقات بھی ہو گئے جو تاحیات باقی رہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ محمد علی میں اسلام اور تعلیمات قرآنی سے دلچسپی بڑھانے اور ذوق وشوق پیدا کرنے میں شبلی نعمانی کا ہی ہاتھ ہے۔ محمد علی انگریزی سرکار کی تعلیمی پالیسی کے زیر اثر علی گڑھ کے تعلیمی ماحول و فضا اور طریقۂ کار سے مطمئن نہیں تھے اور اسے گھپ اندھیرے سے تعبیر کرتے تھے مولانا شبلی کی موجودگی کو روشن نشان کہا کرتے تھے۔

علی گڑھ میں محمد علی کو اگرچہ مولانا شبلی نعمانی سے کلاس روم میں باقاعدہ فیضیاب ہونے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن مولانا شبلی کی شفقت ومحبت اور خود محمد علی کے ذوق و شوق نے مولانا کے درس قرآن میں شرکت کے مواقع پیدا کر دیے تھے جس سے محمد علی کو مولانا شبلی سے ایک طرح سے شاگردی کا شرف ہاتھ آگیا تھا اور اسی شاگردی کی بدولت محمد علی میں قرآن پاک کا ایسا ذوق پیدا ہو گیا تھا جو زندگی بھر باقی رہا اور جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا۔

جس طرح مولانا شبلی نعمانی کے درس قرآن سے محمد علی متاثر تھے اسی طرح ان کے مرکب تعلیمی افکار و نظریات کے بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے تھے۔ چنانچہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے بعد محمد علی جب اس کے اولین شیخ الجامعہ بنائے گئے تو انھوں نے جامعہ میں درس قرآن کا جو انتظام واہتمام کیا وہ دراصل علی گڑھ میں مولانا شبلی کے ہی درس قرآن کا جامعہ میں احیاء تھا اور اس بارے میں انھوں نے خود بھی لکھا تھا:

''بعد ازاں جب جامعہ ملیہ اسلامیہ نیشنل مسلم یونیورسٹی بنی اور میں اس کا شیخ الجامعہ مقرر ہوا تو پہلے ہی دن سے میں نے اس امر کا اہتمام کیا کہ اس میں مولانا شبلی کے درس قرآن کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ ہمارے یہاں تعلیمی دن کا آغاز ایک گھنٹہ بھر کے روزانہ درس قرآن سے ہوا کرتا ہے۔ جس میں قرآنی آیات کی مختصر تشریح کی جاتی ہے۔ لیکن افسوس اس وقت درس دینے کے لیے مولانا شبلی نعمانی موجود نہ تھے''۔

علامہ شبلی نعمانی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک ایسے مرکب تعلیمی نظریات کے علمبردار تھے جو دین و دنیا دونوں لحاظ سے انتہائی مفید و کارآمد ہو۔ محمد علی بھی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک ایسے ہی تعلیمی نظریے کے حامل تھے جو انھیں دین و دنیا دونوں لحاظ سے کامیابی و کامرانی عطا کر سکے اس لیے مولانا شبلی نعمانی کے تعلیمی نظریات اور محمد علی کے تعلیمی نقطۂ نظر میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے۔ محمد علی فطرتاً اگرچہ جذباتی، جوشیلے اور شدت پسند قسم کے حق گو اور بے خوف انسان تھے لیکن مسلمانوں کی تعلیم کے معاملے میں انتہائی سنجیدہ، مخلص اور تعمیری فکر رکھتے تھے اور اس میں کسی قسم کی مصلحت اندیشی کے لیے کسی بھی حال میں تیار نہیں تھے۔ وہ ہندوستان میں عام ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی صحیح تعلیمی صورت حال اور ضروریات وتقاضوں سے بھی پورے طور پر واقف تھے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر پوری سنجیدگی اور گہرائی سے غور وفکر بھی کیا کرتے تھے۔ وہ مسلمانوں کی صنعتی اور حرفتی تعلیم کو بھی ناگزیر تصور کرتے تھے مگر اس سے قبل ان میں عام تعلیم کے فروغ کو لازمی سمجھتے تھے۔ چنانچہ 1905 میں جب ہندوستان میں شرح خواندگی افسوس ناک حد تک کم تھی اور تعلیم کا عام رواج بھی نہیں تھا

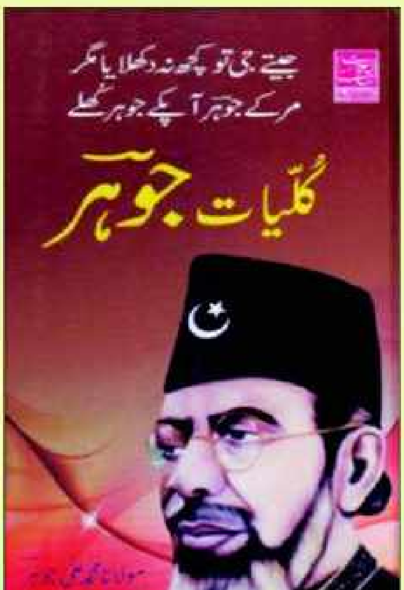

اور تعلیم خصوصاً جنرل ایجوکیشن اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کے اداروں کے قیام کے بارے میں بحث اور غور وفکر کی جانے لگی تھی تو انھوں نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بڑے دوٹوک اور واضح انداز میں اس بات پر زور دے کر کہا تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ ہم گورنمنٹ اسکولوں کا بائیکاٹ کریں اور تکنیکی تعلیمی اداروں کے قیام میں لگ جائیں۔

خلافت تحریک بیسویں صدی کی سب سے پہلی اور سب سے توانا مذہبی اور سیاسی تحریک تھی اور مولانا محمد علی ہی اس تحریک کے اصل سرخیل اور روح رواں بھی تھے۔ ان کی والدہ بی اماں، بڑے بھائی مولانا شوکت علی اور اہلیہ محمد علی (امجدی بیگم) مہاتما گاندھی اور دوسرے قومی رہنماؤں نے نہ صرف اس میں شرکت کی بلکہ خلافت تحریک کے پلیٹ فارم اور اسی اخراجات سے پورے ہندوستان کا دورہ کیا تو ہندوستان میں بیداری اور آزادی کی ایک نئی لہر چلنے لگی۔ ہندو مسلم اتحاد کو فروغ حاصل ہوا اور یہ سب اس وقت ہوا جب ہندوستانی مسلمانوں میں بہترین دل و دماغ رکھنے والے علمائے کرام اور دانشوران عظام موجود تھے اور قومی ملی معاملات میں بڑی حد تک ان میں اشتراک فکر وعمل بھی تھا۔ جس میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن، حکیم اجمل خاں، مفتی کفایت اللہ، مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا عبیداللہ سندھی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سید محمود آغا صفدر، مولانا سجاد بہاری، مسٹر مظہر الحق، مولانا عبدالماجد بدایونی، مولانا سید فاخر الہ آبادی، سید سلیمان ندوی، مولانا سلامت اللہ فرنگی محلی، مولانا سلطان احمد مئوی، مشیر حسن قدوائی، مولانا احمد سعید، مولانا سید احمد داؤد مئوی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا آزاد سبحانی، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی، مولانا حسرت موہانی، ظفر الملک علوی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ کا نام بطور مثال لیا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے خلافت کے معاملے میں پورے خلوص، نیک نیتی اور سرفروشانہ جدوجہد کے ساتھ اپنی شرکت اور سرگرم حصہ داری کا مظاہرہ بھی کیا۔

مولانا محمد علی جوہر ایک اہم ترین قومی رہنما، ممتاز اسلامی مدبر اور تعلیمی دانشور بھی تھے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کے بارے میں ان کی اپنی تعلیمی فکر اور نقطۂ نظر بھی تھا۔ وہ مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے تقریباً تمام پہلوؤں سے بخوبی آگاہ بھی تھے۔ انھیں اس بات کا بھی شدید احساس تھا کہ تعلیم کے بغیر ہندوستانی مسلمان موجودہ اور آئندہ حالات میں ممتاز اہمیت وحیثیت سے ہم کنار نہیں ہو سکتے اس لیے وہ مسلمانوں کے لیے ایسے تعلیمی ادارے، نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم کے حق میں تھے جن کے توسط سے مسلمان جلد سے جلد تعلیم سے بہرور ہو سکیں اور معاشی لحاظ سے مجبور محض نہ ہوں۔ اس لیے وہ مسلمانوں کی عام تعلیم اور اس تعلیم میں پیشہ ورانہ اور حرفتی تعلیم کی شمولیت کے بھی قائل تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ تعلیم میں صنعت و حرفت اور تجارت وسپہ گری وغیرہ کا صرف اتنا ہی حصہ شامل ہونا چاہیے جتنا رائج الوقت مذہبی تعلیم کے حصول میں کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ تاکہ تعلیم سے فراغت کے بعد کوئی نوجوان اپنی عملی زندگی میں محض ملازمت کا محتاج نہ رہے بلکہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کا اہل بھی ہو۔ وہ مسلمانوں کی عام اور ہمہ جہت تعلیم کے ساتھ ساتھ اسلامی تمدن کی بنیادوں پر مسلم خواتین کی بھی اعلا تعلیم کے ہم نوا تھے۔ وہ غریبوں کی تعلیم کے بھی حق میں تھے اور کہا کرتے تھے کہ "غریب طلبا کے لیے اسکول موجود ہیں ارباب اختیار ان کا انتظام اور معیار مقرر کریں کہ ہر شخص خواہ کیسا بھی غریب ہو اس میں داخل ہو سکے"۔ وہ تعلیم نسواں کے بارے میں بھی اپنا الگ اور مخصوص نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے کہا بھی تھا:

"میں بھی ہندوستانیوں، خصوصاً عام مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت اور مستورات کی تعلیم ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے عورتوں کے لیے مستورات کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی عورتوں کا مستور ہونا پسند کرتا ہوں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ اعلا تعلیم بھی پائیں اور مستور بھی رہیں۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ یورپ سے جو بے حیائی کا سیلاب آرہا ہے وہ اس کے ساتھ بہہ جائیں اور یورپ کی شرمناک معاشرت کی تبلیغ کریں۔ ہم دنیا کی عام قوموں کی طرح معمولی قوم نہیں، ہماری تہذیب وتمدن دوسری قوموں سے بڑھ کر ہے۔"

عہد وسطی میں مسلمانوں کی تعلیمی اور سائنسی ترقی، مسلمانوں کے عروج وزوال، ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی تاریخ اور ملکی اور عالمی تعلیمی تاریخ کے ساتھ ہی مبادیات تعلیم وغیرہ پر بھی ان کی طائرانہ نظر تھی۔ وہ مختلف عمروں کے طلبا کے مزاج ونفسیات سے بھی بڑی حد تک روشناس تھے۔ ان کا اپنا جداگانہ تعلیمی نقطۂ نظر بھی تھا۔ اگرچہ وہ عالمی سطح کے بعض تعلیمی مفکرین اور ماہرین تعلیم جیسے ژاں ژاک روسو (1712-1778)، پستالوزی (1746-1827)، فریڈرک فروبل (1782-1852)، ہربارٹ اسپینسر (1830-1903) اور جان ڈیوی (1859-1952) وغیرہ کے تعلیمی نظریات وتصورات سے بالکل مختلف اور ہندوستانی خصوصاً مسلم طلبا کے مزاج ورجحانات سے ہم آہنگ ان کی نفسیات، تقاضوں اور مذہبی، معاشرتی اور تمدنی ضرورتوں اور نزاکتوں کے مطابق ان کی مادری زبان

میں بھی ہندوستانیوں، خصوصاً عام مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت اور مستورات کی تعلیم ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے عورتوں کے لیے مستورات کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی عورتوں کا مستور ہونا پسند کرتا ہوں میرا مطلب یہ ہے کہ وہ اعلا تعلیم بھی پائیں اور مستور بھی رہیں میں یہ پسند نہیں کرتا کہ یورپ سے جو بے حیائی کا سیلاب آرہا ہے وہ اس کے ساتھ بہہ جائیں اور یورپ کی شرمناک معاشرت کی تبلیغ کریں ہم دنیا کی عام قوموں کی طرح معمولی قوم نہیں ہماری تہذیب و تمدن دوسری قوموں سے بڑھ کر ہے

میں تعلیم دینے پر زور دیتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنائے بغیر اصل تعلیمی ترقی نہیں حاصل کی جا سکتی۔ وہ یورپ وامریکہ کی تمام تر تعلیمی ترقی وفروغ کا اصل راز مادری زبان کا ذریعہ تعلیم ہونا ہی مانتے تھے اور انگریزی ذریعہ تعلیم کو غلامانہ ذہنیت کی علامت خیال کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اس بارے میں کہا بھی ہے:

"ہماری غلامانہ ذہنیت کسی چیز سے اس قدر ثابت نہیں ہوتی جس قدر ایک غیر زبان میں تحصیل علوم کی مشقت رائیگاں سے ثابت ہوتی ہے۔ ہم مشرقی تو وحشی لوگ ہیں اور بربریت میں مبتلا ہیں لیکن خود ترقی یافتہ مغربیوں کا کیا شمار ہے۔ کوئی انگریز اپنے بچے کو تاریخ سائنس جرمن زبان میں پڑھواتا ہے؟ کیا کوئی فرانسیسی یا اطالوی اپنے بچے کو جغرافیہ یا ریاضی انگریزی یا دوسری زبان میں سکھواتا ہے۔ لیکن ہماری غلامی اور ہماری غلامانہ ذہنیت کو دیکھ کر ہمارے اسکولوں اور کالجوں کے ہندوستانی اساتذہ بھی جو اکثر انگریزی زبان کو خود بھی اس طرح نہیں جانتے جس طرح انگریز جانتے تھے۔ ہندوستانی بچوں کو تاریخ، سائنس، جغرافیہ اور ریاضی انگریزی زبان میں سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اگرچہ یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ مولانا محمد علی اپنے زمانے میں انگریزی زبان وادب پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے اور ان کی انگریزی دانی اور انشاء پردازی پر ان کے بہت سے ہم عصر انگریزی ادیب ودانشور حیرت زدہ رہا کرتے تھے۔ وہ علی گڑھ اور آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ تھے اور انگریزی کے مایہ ناز ہندوستانی صحافی اور انشا پرداز کی حیثیت سے اپنی خاص شناخت بھی رکھتے تھے، لیکن ان کی اپنی مادری زبان اردو کے باعث کبھی کسی

قسم کی احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے بلکہ اردو کے ذریعے ہمیشہ ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم کی وکالت کرتے رہے کیونکہ وہ مادری زبان ذریعۂ تعلیم بنانے کی اہمیت و افادیت سے پوری طرح واقف تھے اور ان کے نزدیک اس کی تعلیم میں بنیادی اہمیت ہوتی ہے اور اس کے التزام کو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے سب سے جلد اور آسان تعلیمی ترقی کا نسخۂ کیمیا سمجھتے تھے۔

سرسید احمد خاں کی قائم کردہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مولانا محمد علی کی مادر علمی تھی۔ اس لیے اس سے ان کا دلی اور جذباتی لگاؤ بھی تھا اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے وہ دل و جان سے خواہاں بھی تھے اور سرسید کے تعلیمی کارناموں کے قدرداں بھی تھے مگر انگریزی حکومت کے زیر اثر ہونے کے سبب اور تعلیمی صورت حال سے غیر مطمئن ہونے کے باوجود بھی اس کی اہمیت و افادیت کو بخوبی سمجھتے تھے اور انھیں اس بات کا بھی اچھی طرح احساس تھا کہ یہ علی گڑھ ہی کی دین ہے کہ مسلمانوں میں جدید تعلیم یافتہ لوگ نظر آتے ہیں اور نئے انداز سے سوچنے والے افراد پیدا ہو رہے اور پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں اضافے ہوتے نظر آتے ہیں مگر وہ اس کا بھی ادراک رکھتے تھے کہ انگریزوں کے موجودہ تعلیمی نظام کے تحت فی زمانہ علی گڑھ سے جو تعلیم یافتہ نکل رہے ہیں ان کی اکثریت انگریزوں اور انگریزیت سے مرعوب ہوتی جارہی ہے اور بقول علامہ شبلی نعمانی ''زندہ انگریزوں نے ہمارے زندہ افراد کو مرعوب کر رکھا ہے۔ بلکہ مردہ انگریزوں نے ہمارے مردوں پر بھی غلبہ حاصل کرلیا ہے۔ اس لیے یہ مرعوب اور مغلوب لوگ آزادی کے مجاہد نہیں بن سکتے''۔ اس کے علاوہ بھی بہت ساری وجوہات پیدا ہوگئیں تھی جس سے مسلمان دانشوروں اور رہنماؤں کا ایک طبقہ بہت پہلے سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے علاوہ ایک دوسرے انداز و معیار کا مسلمانوں کا ایک ایسا مرکزی تعلیمی ادارہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جس میں مسلمانوں کی مکمل خودمختاری ہو اور وہ سرکاری اثرات سے بھی بالکل آزاد ہو جیسا کہ شیخ محمد اکرام نے بھی لکھا ہے:

''علی گڑھ کالج کے سکریٹری اور سرسید کے خلیفۂ ثانی نواب وقارالملک نے 1912 میں ان مسلمانوں کے لیے جو سرکاری ملازمتوں کے خواستگار نہیں۔ ایک جداگانہ جامعہ اسلامیہ قائم کرنے کی اسکیم پیش کی۔ نواب صاحب کی خواہش تھی کہ یہ نئی یونیورسٹی گورنمنٹ کے اثرات سے آزاد ہو۔ اس میں ذریعۂ تعلیم اردو ہو لیکن انگریزی ایک لازمی مضمون کے طور پر شامل درس رہے، اور طلبا کی تعلیم میں مذہبی تربیت اور کفایت شعاری کی تعلیم کو خاص اہمیت ہو۔ نواب وقارالملک اپنے خیالات کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ لیکن جامعہ ملیہ اسلامیہ سے متعلق انھوں نے جو مفصل مضمون لکھا تھا، اسے پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کی اسکیم اور جامعہ ملیہ کی عملی صورت میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اور یہ حقیقت بھی بہت اہم ہے کہ جامعہ ملیہ کی بنا میں سب سے اہم حصہ اس بزرگ (مولانا محمد علی) کا ہے جو علی گڑھ کا اولڈ بوائے تھا اور جس کا بیان ہے کہ تقریباً جو کچھ میں نے حاصل کیا ہے، وہ اسی علی گڑھ کا طفیل ہے''۔

ہندوستان کے بہت سے دانشور اور قومی ملی رہنما ایک عرصہ سے ہندوستان میں مسلمانوں کے ایک ایسے تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جو انگریزی عہد میں سرکاری اثرات سے بالکل آزاد ہو اور جس پر مسلمانوں کا کلی اختیار بھی ہو چنانچہ 1920 میں عدم تعاون اور ترک موالات کی تحریک کے تحت جب سرکاری تعلیمی اداروں کا بائیکاٹ کیا جانے لگا تھا۔ اسی زمانے میں مولانا محمد علی جوہر الہ آباد کے ایک سہ روزہ اجلاس میں شرکت کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔ جہاں علی گڑھ کے بعض طلباء نے ان سے ملاقات کی۔ دوران گفتگو مولانا نے یہ خواہش ظاہر کہ ان کی دلی آرزو ہے کہ علی گڑھ کے طلباء کی ایک بڑی جماعت کے سامنے ترک موالات کی حقیقت اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی جائے، تاکہ ہمارے طلبا بھی وطن کے صحیح سپاہی بن سکیں۔ مولانا محمد علی سے الہ آباد میں ملنے والے طلبا نے علی گڑھ میں جاکر اچھا خاصا ماحول بنادیا جس کے نتیجے میں اتحاد یونین نے مولانا محمد علی کو علی گڑھ مدعو کیا۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ علی گڑھ پہنچ گئے۔ مولانا نے ترک موالات اور ہندوستان کی آزادی کے خدوخال کی بڑے موثر اور پرخلوص انداز میں تصویر کشی کی اور علی گڑھ کی جامع مسجد میں قابل ذکر تعداد میں جمع لوگوں کے سامنے حکیم اجمل خاں نے مجوزہ نیشنل مسلم یونیورسٹی کا خاکہ پیش کیا جس کے مطابق 29 / اکتوبر 1920 کو شیخ الہند مولانا محمود الحسن نے بیماری کی حالت میں اس کا باقاعدہ افتتاح کیا اور اپنی تاریخی افتتاحی تقریر کی۔ 74 لوگوں پر مشتمل ایک فاؤنڈیشن کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کا پہلا اجلاس 22 /نومبر 1920 کو حکیم اجمل خاں کی صدارت میں علی گڑھ میں منعقد ہوا اور مولانا محمد علی جوہر نے کمیٹی کی مدد و تائید سے نصاب تعلیم کی اسکیم تیار کی اور مجوزہ نیشنل یونیورسٹی کا نام جامعہ ملیہ اسلامیہ رکھا گیا۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام اگرچہ بڑی بے سروسامانی کی حالت میں اور بڑے نامساعد ماحول میں ہوا تھا۔ لیکن مولانا محمد علی اور اس کے دوسرے بنیادگزاروں کے ذہن میں مستقبل کا ایک وسیع منصوبہ اور ایک عظیم الشان مرکزی اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے عزائم تھے اور مسلمانوں کی تمدنی بنیادوں پر ان کی مادری زبان اردو میڈیم سے ہر قسم کی بہتر اور معیاری تعلیم کی سہولیات پیدا کرنے کا نیک اور پختہ ارادہ تھا نیز کم سے کم خرچ میں ایک ایسی مرکب تعلیم کا خیال تھا جو دین اور دنیا دونوں لحاظ سے مسلمانوں کے لیے مفید اور کارآمد تعلیم کے بندوبست کرنے کی نیک نیت تھی تاکہ ہر شخص تعلیم کی نعمت سے بہرور ہو سکے۔ چنانچہ مذکورہ مقاصد کے تحت مولانا محمد علی جوہر نے جو نصاب تعلیم، تعلیمی منشور اور نصب العین، ترتیب دیا تھا اس کا بنیادی مقصد ہندوستانی مسلمانوں کی آئندہ ایسی نسلیں تیار کرنا تھا جو وقت و حالات کے تمام چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے اور ان میں کبر و نخوت کے بجائے ایثار و انکساری اور خادم انسانیت کا جذبہ کارفرما ہو جس کے لیے اس کے پانچ اہم ترین بنیادی عناصر قرار دیے گئے جو مسلمانوں کی قومی تعلیم کے لیے ناگریز تھے۔

1۔ اسلام اور اس سے وابستہ مذہبی علوم کی تعلیم خصوصاً قرآن پاک کی تعلیم۔
2۔ آزادی وطن کے پاک جذبے کی ترتیب اور اس کی نشوونما۔
3۔ علوم وفنون، تاریخ، فلسفہ، ہیئت اور سائنس کی تعلیم۔
4۔ معاش کے لیے مختلف فن و حرفت کی تعلیم۔
5۔ مادری زبان اردو کے ذریعہ ہر قسم کی تعلیم۔

جامعہ کے نصاب اور نظام تعلیم میں مذہبی تعلیم کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی تاکہ طلبا کو بااخلاق مہذب اور باکردار بنایا جاسکے اور تاریخ و سائنس وغیرہ مضامین سے ماضی کے حالات، کارناموں کے ساتھ ساتھ معاصر ترقیات اور مستقبل کے امکانات سے انھیں آگاہی کے ساتھ معاشی اور دوسرے مسائل و معاملات سے باخبر رکھا جاسکے۔ چنانچہ پورے تعلیمی طریقہ کار میں طلبا کو مرکزی اور کلیدی محور کی حیثیت حاصل تھی اور سارے وسائل کو ان کے معاون کی حیثیت دی گئی تھی جس سے ہر قسم کے سرد و گرم حالات و مخالف و موافق ہواؤں کی تیزی و تندی کے باوجود بھی جامعہ کا چراغ روشن رہنے میں کامیاب رہا اور خلافت اور عدم تعاون وغیرہ کی تحریکوں کے بعد بھی جب ایسے حالات رونما ہوگئے اور جامعہ کا باقی رکھنا مشکل نظر آنے لگا اور کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہوگیا کہ موجودہ بدلے ہوئے حالات میں جامعہ اپنی افادیت کھو چکا ہے اور اپنا کام بھی انجام دے چکا ہے اس لیے اسے باقی رکھنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے۔ لیکن جامعہ کی تاریخ

کے اس نازک موڑ پر جہاں مہاتما گاندھی نے نئے حوصلے دیئے وہیں بعض اساتذہ اور بہی خواہوں نے نئی تاب و توانائی کے ساتھ جامعہ میں نئی روح پھونکنے کی کامیاب کوشش کی اور ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر محمد مجیب اور سید عابد حسین وغیرہ نے ہر قسم کی قربانی دے کر جامعہ کو بہر حال زندہ و باقی رکھنے اور ترقی کی نئی راہوں پر گامزن کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور ایسا کرنے میں وہ اس لیے کامیاب ہو سکے کہ مولانا محمد علی جوہر نے جامعہ میں جو ایثار، قربانی اور خلوص کی فضا تشکیل دی تھی وہ بڑی اہمیت کی حامل تھی اور اسی بنیاد پر جامعہ قائم و دائم بھی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کی تعلیم اور جامعہ کا تعارف کراتے ہوئے انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا بھی ہے۔

''جامعہ نے ابتدا ہی سے جو مقصد پیش نظر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں سے سچے خدا پرست مسلمان اور وطن پرست ہندوستانی پیدا ہوں۔ اس کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو حق دوست اور خدا پرست مسلمان بنایا جائے اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کو وطن دوست اور حریت پرور ہندوستانی بنایا جائے .... مسلمانوں کے مذہب کی مختصر اور جامع تعریف یہ ہے کہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کی تعلیم دینے کی غرض سے مبعوث ہوئے جس نے ع ''از کلید دین در دنیا کشاد'' .... اس لیے اسلام اور انسانوں کی اس تفریق کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا ان کا صرف ایک حصہ دین دار ہو اور باقی دنیا دار ہو۔''

جامعہ ملیہ کے بانیاں نے جس خلوص، نیک نیتی اور اعلیٰ مقصد کے پیش نظر اس کو قائم کیا تھا، اور ان کے ذہن میں جو وسیع منصوبے تھے اور اسے یکے بعد دیگرے جو مخلص افراد ملتے گئے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ زمانے کے سرد و گرم اور نت نئے نشیب و فراز سے دوچار ہونے کے باوجود جامعہ آگے بڑھتا گیا۔ 1925 میں یہ علی گڑھ سے دہلی (قرول باغ) اور پھر اوکھلا (جامعہ نگر) میں منتقل ہو کر ایک اعلا معیار کی یونیورسٹی بننے کی طرف بدستور گامزن ہو گیا۔ یہ ادارہ اپنے آغاز میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم تک محدود تھا۔ اسے ہندوستان کا منفرد اور ممتاز تعلیمی ادارہ بنانے میں سب سے اہم، بنیادی اور نمایاں کردار مولانا محمد علی جوہر کا رہا ہے۔ انھوں نے اس کے آغاز میں ہی اس کی انفرادیت پر خاص توجہ دی تھی اور اس کے لیے اس کے نصاب تعلیم، نظام تعلیم اور طریقۂ تعلیم میں ایسے نئے تجربات کو اہمیت دی جو خاص ان کے ذہن کی اُپج تھے اور ان کے مخصوص نقطۂ نظر کی دین تھے اور جو قدرے مختلف بھی تھے اور روایت و جدت کی آمیزش سے موثر اور کار آمد بھی تھے۔ انھوں نے جس انداز تدریس کو فروغ دیا وہ انداز تدریس خاص انھیں کا تیار کردہ تھا۔ اس کے بعد کے لوگوں نے بھی اسی کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جب اس میں اعلا تعلیم کی سہولیات پیدا ہو گئیں اور مختلف مضامین میں اعلا تعلیم کا بندوبست بھی ہو گیا تب بھی یہ اپنے اسی بنیادی اور ممتاز و منفرد انداز پر قائم رہتے ہوئے اس میں مزید توسیع کے لیے سرگرم عمل رہا اور بتدریج اپنے بنیادی اصولوں اور طریقوں پر چلتے ہوئے اپنے بنیادی مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں رہا اور بدستور آگے بڑھتا رہا۔

ملک کی آزادی کے بعد نئے عزم و حوصلے سے اس کے ذمے داروں نے اسے ترقی دینے کی کوشش کی۔ 1963 میں یونیورسٹی گرانٹ کمیشن آف انڈیا (U.G.C.) نے جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کو متصور یونیورسٹی (Deemed University) کا درجہ عطا کیا، جس سے جامعہ ہندوستان کی ایک اہم اور ممتاز یونیورسٹی کی حیثیت سے اپنے تدریسی اور انتظامی معاملات میں اپنی انفرادی شناخت قائم رکھتے ہوئے نئی شاہراہ ترقی پر گامزن رہا اور ایک نئی رجسٹرڈ یونیورسٹی کے طور پر اپنی تعلیمی، تدریسی اور انتظامی خدمات کی انجام دہی میں پورے طور پر مصروف عمل رہا اور اپنے قیام کے تقریباً اڑسٹھ (68) سالوں بعد 1988 میں ہندوستانی پارلیامنٹ کے ایک ایکٹ کے تحت ہندوستان کی ایک مرکزی یونیورسٹی بننے میں کامیاب ہو گیا جس میں مختلف علوم و فنون کی اعلا اور معیاری تعلیم و تحقیق کا معقول بندوبست ہے۔ اس کی مختلف اور متعدد فیکلٹیاں اور اس کے دیگر ادارے اپنے تعلیمی اور تحقیقی کاموں کے سبب اپنی الگ اور جداگانہ شہرت و مقبولیت رکھتے ہیں اور عالمی سطح پر بھی اسے ہندستان کی ایک ممتاز اور اہم ترین یونیورسٹی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اس کی حیثیت کی حصولیابی میں مولانا محمد علی جوہر کی فکری بصیرت، ان کی فراہم کردہ بنیادیں اور ان کے تعلیمی نقطۂ نظر کی بہر حال کارفرمائی شامل ہے۔ جو اپنی زندگی بھر ایک سچے پکے راسخ العقیدہ مسلمان اور عاشق ہندوستان کی حیثیت سے حق و آزادی کے لیے برسرپیکار رہے اور بقول پروفیسر خلیق احمد نظامی:

جامعہ ملیہ اسلامیہ دراصل مولانا محمد علی جوہر کے خلوص و ایثار، محنت و لگن، تعلیمی فکر و بصیرت اور ان کے تعلیمی نظریات کا ایسا عملی اور زندۂ جاوید نمونہ ہے جس کی مثال ہندوستان کی کوئی اور یونیورسٹی نہیں پیش کر سکتی۔ مولانا محمد علی جوہر بہت ساری امتیازی خصوصیات کے حامل تھے۔

''ہندوستان نے سیاسی بصیرت، فہم و فراست، تدبیر اور مستقل مزاجی، ایثار اور قربانی کے بہت سے نمونے پیش کیے ہیں، لیکن حق گوئی، بے باکی اور سرفروشی میں کوئی شخص محمد علی جوہر کے درجے کو نہیں پہنچا۔''

جامعہ ملیہ اسلامیہ دراصل مولانا محمد علی جوہر کے خلوص و ایثار، محنت و لگن، تعلیمی فکر و بصیرت اور ان کے تعلیمی نظریات کا ایسا عملی اور زندۂ جاوید نمونہ ہے جس کی مثال ہندوستان کی کوئی اور یونیورسٹی نہیں پیش کر سکتی۔ مولانا محمد علی جوہر بہت ساری امتیازی خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کا انداز گفتگو اور طرز اظہار بڑا استدلالی ہوتا تھا۔ وہ کوئی بات حق و صداقت کے خلاف زبان پر نہیں لاتے تھے۔ اس لیے اپنی بات پر اٹل اور بضد بھی رہتے تھے اور بڑی بڑی شخصیات کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں اور اپنی بات منوانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے اور نہ ہی مغلوب اور نہ ہی کسی کو مرعوب و مغلوب کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اپنی دھن کے پکے اور اپنے عزائم و منصوبے کی تکمیل کے دیوانے تھے۔ وہ کبھی کسی بھی مقصد کے حصول میں کوئی غلط یا ناجائز طریقہ استعمال کرنے کے سخت مخالف تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی اور اپنے زمانے میں پورے بر صغیر میں خلافت تحریک، تحریک آزادی، ہندو مسلم اتحاد، عدم تعاون، ترک موالات اور قومی تعلیم کے لیے جو فضا سازی کی اور جن حالات میں جامعہ ملیہ اسلامیہ جیسا ادارہ قائم کر کے ہندوستان میں آزادی سے قبل قومی تعلیم کے ادارے کا ایسا نمونہ پیش کیا جو آج بھی ہندوستان کی مثالی یونیورسٹی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔

تا قیامت قطع استبداد کرد
موج خون او چمن ایجاد کرد

حوالے

- سیرت محمد علی۔ مرتب: رئیس احمد جعفری
- محمد علی جوہر حیات و شخصیت، از ڈاکٹر محمد اطہر مسعود، محمد علی جوہر نمبر نیا دور لکھنؤ فروری / مارچ 2005
- مولانا محمد علی جوہر حیات اور تعلیمی نظریات۔ از شاہ الحق صدیقی 1975
- مولانا محمد علی جوہر کی تعلیمی تقاریر از سید مصطفیٰ بریلوی، العلم کراچی جوہر نمبر، اکتوبر تا دسمبر 1978
- مولانا محمد علی جوہر بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے۔ از محمد سرور 1962
- مولانا محمد علی جوہر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ: قاضی عبیدالرحمٰن محمد علی جوہر نمبر نیا دور لکھنؤ فروری / مارچ 2005
- موج کوثر: شیخ محمد اکرام۔ ادبی دنیا 1962
- مضامین محمد علی۔ از محمد سرور، دہلی، 1938
- محمد علی: جوہر حیات و خدمات۔ تنظیم انجم

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی

بحیثیت محقق وتنقید نگار

عتیق الرحمن

حیات و شخصیت: ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع مئو (مئو ناتھ بھنجن) کے مردم خیز خطہ ڈومن پورا میں 12 رجنوری 1968 کو ہوئی جو کہ زمانہ قدیم سے اہل علم وفن کا دیار اور صنعت پارچہ بافی میں بھی قومی اور بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہے۔ اس خطے کی خاصیت رہی ہے کہ بڑے بڑے علما، فضلا اور اہل علم وفن پیدا کیے ہیں ڈاکٹر نسیم صاحب انھیں کی ایک کڑی ہیں۔ آپ ادب پرور، نثر نگار، شاعر، صحافی اور علم دوست ہیں اور موصوف ایک محقق اور نقاد کی حیثیت سے بھی مشہور ومعروف ہیں۔ آپ کو 'اثر انصاری: حیات اور خدمات' کے عنوان سے تحقیقی اور تنقیدی مقالے پر ویر بہادر سنگھ پروانچل یونیورسٹی سے پی ایچ. ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی اور یہ مقالہ بھی کافی پہلے اشاعت کے مرحلے سے گذر کر منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کے تقریباً دو درجن تحقیقی اور تنقیدی مضامین پر مبنی کتاب 'نقد سخن' کے عنوان سے شائع ہوکر خوب داد وتحسین حاصل کر چکی ہے، جو ان کے اعلی تنقید نگار ہونے کی بہترین مثال ہے۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی 17 راکتوبر 2019 کو اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے اور وہ ہمیشہ اپنی علمی اور تعلیمی خدمات کی وجہ سے اردو دنیا میں یاد کیے جائیں گے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی ادبی خدمات: نسیم صاحب کی شخصیت اردو کے علمی اور ادبی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے، خواہ وہ نثر ہو یا نظم یا کہ صحافت بھی پر ان کے قلم یکساں روانی کے ساتھ چلے لیکن ان کا خاص موضوع تعلیم اور تنقید ہے اور 'نقد سخن' اس کی اعلی ترین مثال ہے۔ موصوف ایک خوش فکر شاعر، سلجھے ہوئے ادیب، محقق ونقاد اور 'ادب نکھار'، 'ادبی گزٹ' اور 'تخلیق وتحقیق' جیسے معیاری رسالے اور جریدے کے اجرا وادارت کے فرائض انجام دیے۔ آپ کی مشہور، مفید اور کارآمد کتابوں کی فہرست لمبی ہے لیکن 'اثر انصاری: فکر وفن کے آئینے میں'، نوائے سروش' (اثر انصاری کی حمد ونعت کا مجموعہ)'، 'تعلیمی تجزیے'، 'تعلیمی جہات'، 'تعلیمی نکات'، 'تعلیمی اشارات'، 'تعلیم اور تعلیمی افکار'، 'اختر الایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ' اور ان کا تحقیقی مقالہ 'اثر انصاری: حیات اور خدمات' بھی شائع ہوکر خوب داد وتحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مشہور ومعروف کتابیں جیسے 'مولانا قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات'، اثر انصاری پر چند تحریریں'، 'نوائے سروش'، 'میزان آگہی (مجموعہ غزلیات)'، 'اردو کے چند فکشن نگار'، اور فیضان آگہی (شعری مجموعہ)' شامل ہے۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی بحیثیت تحقیق وتنقید نگار:

اثر انصاری: حیات اور خدمات: ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی صاحب کی یہ کتاب ان کی پی. ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے جو 2007 میں فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی (حکومت اتر پردیش) کے مالی تعاون سے شائع ہوکر اہل علم وفن کے سامنے خوب پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ اس تحقیقی مقالے کو موصوف نے چار ابواب میں منقسم کیا ہے۔ پہلے باب میں 'عہد و ماحول' کے عنوان کے تحت تین ذیلی عنوان مثلاً علمی و ادبی ماحول، سیاسی و سماجی ماحول اور تہذیبی وتمدنی ماحول کے ذریعے مئو ناتھ بھنجن کے ادبی اور ثقافتی اور تہذیبی اہمیت پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور اس شہر کی علمی، ادبی اور صنعتی حرفت کو بخوبی نمایاں کیا گیا ہے۔ دوسرے باب 'سوانح اور شخصیت' کے عنوان سے مختلف ذیلی عنوان کے تحت ڈاکٹر صاحب نے اثر انصاری کے نام ونسب، خاندانی شجرہ، سیرت وشخصیت، مذہب ومشرب، اخلاق و عادات، سلسلۂ شعر وسخن، تصنیفات وتالیفات، انعامات واعزازات اور تلامذات عنوان کے تحت اثر انصاری کے علمی اور ادبی شعور کا بخوبی جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں 'اثر انصاری کی شاعری' میں ان کی غزل گوئی، نظم نگاری اور قطعہ نگاری پر مفصل اور جامع انداز میں بحث کی گئی ہے۔ چوتھے اور آخری باب میں 'تذکرہ نگاری اور تنقید نگاری' کے عنوان سے اثر انصاری کے تذکرہ 'سخنوران مئو' پر مدلل روشنی ڈالی گئی ہے اور انصاری صاحب کی تنقیدی خوبیوں کو تنقید کے پیرایہ میں جانچا اور پرکھا گیا ہے۔

نقد سخن: ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی مشہور زمانہ کتاب 'نقد سخن' جو 23 مضامین پر مشتمل ہے پہلے باب میں سولہ اور دوسرے باب میں سات مضامین ہیں۔ پہلے باب کا پہلا مقالہ 'میر تقی میر کا شعری تصوف' کے عنوان سے میر کی تصوف ومعرفت سے وابستگی ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی مغلیہ دور کے عام رجحان تصوف ومعرفت اور مافوق الفطرت حالات وواقعات سے عبارت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''میر کی شاعری کا وہ حصہ جس میں صوفیانہ افکار و خیالات کی ترجمانی پائی جاتی ہے وہ محض نظریاتی ہے اور میر کی داخلیت اور دروں بینی سے ان کا تعلق محض واجبی ہے''۔ (ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، ص 173)

ڈاکٹر نسیم اعظمی صاحب کی تجزیاتی وتنقیدی Analytical (& Critical) صلاحیت کا اندازہ ان کی دوسری مشہور کتاب 'اردو کے چند فکشن نگار (تنقید وتجزیہ)' سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا دیباچہ 67 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں موصوف نے اردو افسانہ منظر پس منظر، قصہ گوئی سے داستان سرائی تک، اردو میں افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش اور آغاز، اس کے پلاٹ، موضوع، کردار نگاری، اسلوب، اردو افسانہ بیسویں صدی میں، اردو افسانہ اور ترقی پسند تحریک، اردو افسانہ 1980 کے بعد، چند اہم خواتین افسانہ نگار اور اردو افسانہ اکیسویں صدی میں پر بڑی ناقدانہ اور تجزیاتی نظر سے افسانہ کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے۔

اس کتاب میں چوبیس مضامین مثلاً پریم چند کا سدا بہار افسانوی تشخص، پریم چند کا نظریۂ فن وادب، مجنوں گورکھپوری اور اردو فکشن، عزیز احمد کے افسانوی امتیازات، سعادت حسن منٹو کی افسانوی انفرادیت، زندگی کی حقیقتوں کا افسانہ نگار: کرشن چندر، تعلیم، سائنس اور کرشن چندر، اردو کا لاجواب افسانہ نگار: راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور اردو افسانہ اور کردار نگاری، قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری اور بیورو کریٹ معاشرت، قرۃ العین حیدر کی

ناول نگاری اور شعور کی رو کی تکنیک، خواجہ احمد عباس صحافت سے افسانہ نگاری تک، صالحہ عابد حسین اور ان کی افسانہ نگاری، بلونت سنگھ کے افسانوی طریقہ کار کی شناخت، سریندر پرکاش کے افسانوی امتیازات، ڈاکٹر علیم مسرور کے ناول "بہت دیر کردی" کا اجمالی جائزہ، ڈاکٹر علیم سرور کا ادبی نقطۂ نظر (بہت دیر کردی کے حوالے سے)، سہل ممتنع کا افسانہ :سعید فریدی، ساجد رشید کی افسانہ نگاری، شفق کا افسانوی افق، گھریلو سچائیوں کا افسانہ نگار: شاکر کریمی، ایس ایم عباس کی افسانہ نگاری، ایک بنگر نمائندہ افسانہ نگار: شرافت حسین اور ،گیسوئیں صدی، افسانہ اور اشتیاق سعید شامل ہیں۔

موصوف جہاں تنقید کے اصول اور رموز و نکات سے بخوبی واقف ہیں اور اپنی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہنے میں دسترس رکھتے ہیں۔ وہ عام طور سے اپنی بات تنقید، تخلیق اور ادب کے حوالے سے کرتے ہیں لیکن تخلیق کار اور ادیب سے جڑے رہتے ہیں۔ اسی لیے ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی تحریروں میں وسعت و ہمہ گیری بھی پائی جاتی ہے اور شگفتگی اور سلیقہ مندی کے ساتھ ساتھ ایک اچھے تنقید نگار کی ساری خوبیاں جھلکتی ہیں۔

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اپنی تنقید میں افسانہ نگار و ناول نویس کی تخلیق کی روح تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور بہت حد تک اس میں کامیاب بھی نظر آتے ہیں جس کی بابت ان کی فکشن تنقید کبھی بھی تخلیق سے لاتعلق نہیں ہوتی اور اسی کے پیش نظر وہ اپنی بات بڑی بے باکی سے کہہ جاتے ہیں۔ ان کی فکشن تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تخلیق کار اور ان کی کاوشوں کے اوصاف عموماً متوازن انداز میں بیان کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتے ہیں اور خامیوں اور کمیوں کو فقط اشاروں و کنایوں میں کہہ کر گزر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل دو حوالے پیش ہیں:

"افسانوی اجزائے ترکیبی سے عموماً پریم چند کے افسانے پر ہوتے ہیں۔ لیکن انھوں نے ایسے افسانے بھی لکھے ہیں جو پلاٹ اور کردار سے تقریباً عاری ہیں۔ مگر وحدت تاثر کی کارفرمائی سے پرے ہیں۔ جن سے زندگی کی کچھ ایسی گرہیں کھولنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے بشری صورت حال کے بعض نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر 'کشمیر کے کھیت' اور 'شکوہ شکایت' جیسے افسانوں کو پیش کیا جا سکتا ہے"۔

افسانوں میں فکر و رومان کے امتزاج کا غلبہ اس دور کا بھی اور مجنوں کی شخصیت کا بھی طرۂ امتیاز تھا۔ چنانچہ ان کے افسانوں اور ناولٹوں میں ایک مخصوص رومانی فضا کا پس منظر ہوتا ہے اور وہ اپنے کردار کی تخلیق اسی فضا و ماحول میں کرنے کے ساتھ ان کی داخلی کشمکش اور نفسیاتی عکاسی میں زندگی و کائنات کے فلسفیانہ مباحث اٹھاتے ہیں۔ جس سے ان کے افسانوں میں دلکش ماجرائی حسن نہیں پیدا ہو پاتا ہے"۔

فکشن آپ بیتی، جگ بیتی، تخیل اور جمالیات کا معجون مرکب ہوتا ہے۔ یہ چاروں اجزاء اپنا اپنا زور دکھانے میں کافی شدت کے خواہاں ہوتے ہیں۔ مگر بہترین اور کامیاب فکشن نگار توازن برقرار رکھتے ہوئے ہی اچھے اور کامیاب افسانے تخلیق کر سکتا ہے اور ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی اس فن سے بخوبی واقف تھے۔

(ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، ص 261، 262)

اخترالایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ: ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی یہ کتاب جیسا کہ عنوان سے پتہ چلتا ہے اخترالایمان کی نظم نگاری پر تنقیدی و تجزیاتی پہلو کا احاطہ کرتی ہے جو کہ 2017 میں اشاعت کے مرحلے سے گزر کر علمی و ادبی حلقے میں خوب پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف کی ناقدانہ نظر کتنی گہری ہے کہ اصناف کی خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات بڑی خوش اسلوبی سے بیان کر جاتے ہیں۔

نسیم صاحب عہد حاضر کے نہ صرف ایک معتبر محقق، ناقد، صحافی اور ماہر تعلیم ہیں بلکہ شاعری بھی اچھی کرتے ہیں۔ انھیں نثر اور نظم دونوں پر یکساں دسترس حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ان کے کلام کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف ایک منجھے ہوئے سنجیدہ اور خوش مذاق شاعر ہیں بلکہ شعر و سخن کے رموز و نکات سے پوری واقفیت رکھنے کے ساتھ ساتھ مضمون آفرینی کا شعری ہنر بھی جانتے ہیں۔ ان کے یہاں عصری حسیت اور موجودہ دور کی تلخ حقیقتوں کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ صرف لفظوں کی بازیگری کے قائل نہیں۔ ان کا کلام بعض ترقی پسندوں کی نعرہ بازی اور جدیدیت کے خود اختیاری ابہام اور کشش و پیچ کی سی کیفیت سے پاک و صاف نظر آتا ہے البتہ ان کے بعض اشعار عصری شعور اور پیرایۂ ادائیگی کے سبب ترقی پسند نظریے سے ضرور جا ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

آنے کو ہے دنیا میں آندھی وہ تغیر کی
جب چاند اگائیں گے کھیتوں سے گہن والے

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے زندگی اور حقیقت کو نہایت قریب سے دیکھا ہے۔ دنیائے آب و گل میں انسان جن مسائل سے دو چار ہوتا ہے وہی ان کے تجربات و مشاہدات ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو نہایت برجستگی اور خلوص و صداقت کے ساتھ شعری پیکر میں تراشنے کے ہنر سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اگر انگلی نہیں نبض جہاں پر
تو پھر بے فائدہ فکر و عمل ہے
حساب زندگی کیسے لگاؤں
منافع میں خسارہ بولتا ہے
نسیم کہہ دو یہ موسم کی کج ادائی سے
نہ گر سکا نہ گرے گا وقار خوشبو کا

(ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، ص 323)

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کے دو شعری مجموعے 'میزان آگہی' اور 'فیضان آگہی' پوری آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آ چکے ہیں اور اہل علم و فن سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ماخذ و کتابیات

1. اثر انصاری فکر و فن کے آئینے میں، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، نکھار پبلی کیشنز، 1998
2. نوائے سروش (اثر انصاری کی حمد و نعت کا مجموعہ)، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2001
3. تعلیمی تجربے (مضامین)، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2002
4. تعلیمی جہات، (تعلیمی موضوعات پر لکھے گئے مضامین)، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2006
5. اثر انصاری: حیات اور خدمات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2007
6. مولانا محمد قاسم نانوتوی کے تعلیمی تصورات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2008
7. نقد سخن (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2010
8. میزان آگہی (مجموعہ غزلیات)، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2011
9. تعلیم اور تعلیمی افکار، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2011
10. اثر انصاری پر چند تحریریں، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2011
11. تعلیمی نکات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2013
12. تعلیمی اشارات، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2014
13. اردو کے چند فکشن نگار (تنقید و تجزیہ)، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز، 2015
14. ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی: شخصیت اور جہات، مرتب: ظہیر حسن ظہیر، عدیلہ پبلی کیشنز 2015
15. راجا رام موہن رائے اور ان کے تحریکی و تعلیمی کارنامے، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2016
16. فیضان آگہی (شعری مجموعہ)، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2016
17. اخترالایمان کی نظم نگاری: تنقید و تجزیہ، ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی، عدیلہ پبلی کیشنز 2017

■

Dr. Atiqur Rahman
Assistant Professor of Persian (Stage-II)
Dept. of Arabic, Persian, Urdu & Islamic Studies, Bhasha Bhavana, Visva-Bharati, (A Central University)
Santiniketan-731235 (WB)
M.No. 09635193411, 8250056711
Email:atiqurs044@gmail.com

جاوید احسن

شاہ تراب علی قلندر کی اصلاحی شاعری

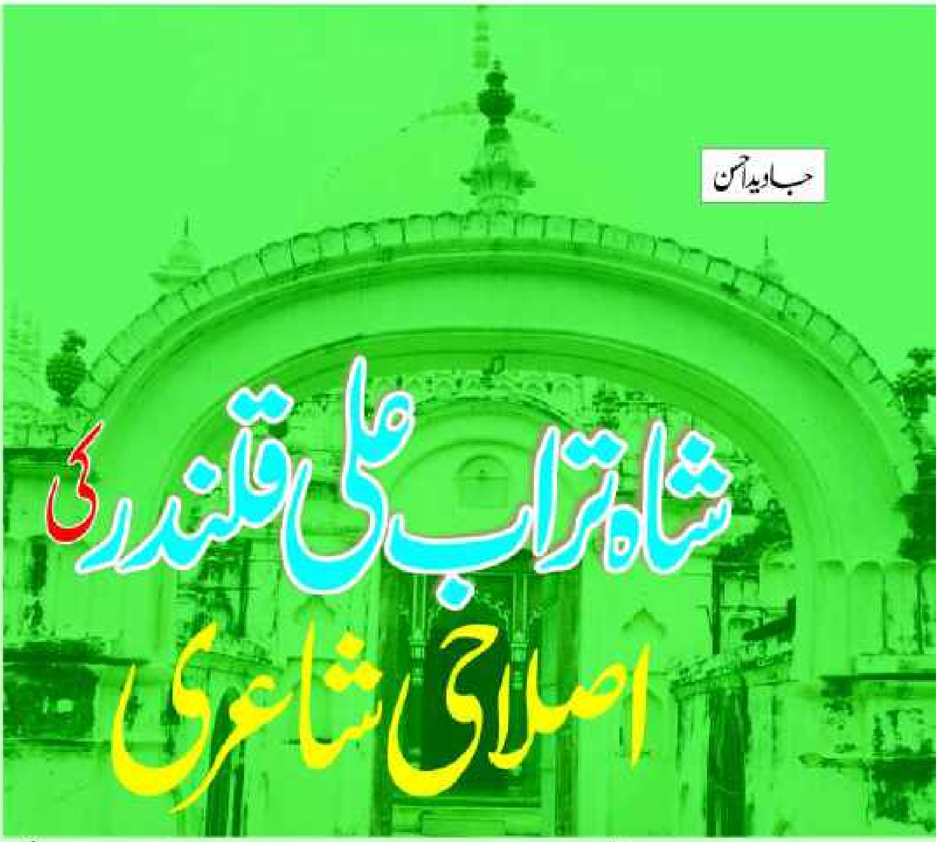

حضرت شاہ تراب علی قلندر کاکوروی قدس سرہ (ولادت 1768 - وفات 1858) خانقاہ کاظمیہ کے بانی حضرت شاہ محمد کاظم قلندر کاکورویؒ کے فرزند ارجمند تھے۔ آپ کا شمار اپنے دور کے نامور عالم، درویش، فقیہ، مورخ، شاعر، خدا ترس، حق شناس اور خدا پرست صوفیوں میں ہوتا ہے۔ آپ ہر طرح کے علم معقولات ومنقولات سے بہرہ مند تھے۔ ابتدائی کتابیں مُلّا قدرت اللہ بلگرامی، مولوی معین الدین بنگالی اور ملا حمید الدین محدث کاکوروی سے پڑھیں۔ فن عروض قاضی القضاۃ نجم الدین علی خاں بہادر ثاقب کاکوروی اور فقہ کی تعلیم مولوی فضل اللہ ساکن نیوتنی سے حاصل کی۔ آپ نے جس مقدس وپاکیزہ ماحول میں آنکھیں کھولیں وہاں پہلے سے ہی علم ومعرفت کی مستحکم روایت موجود تھی۔ آپ کے والد ماجد نے بیٹے کی استعداد کو بڑھانے کے لیے خود تصوف کی تعلیم دی۔ نوعمری میں ہی تیسیر الاحکام، زادالآخرت، منہاج العابدین، کیمیائے سعادت اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تصانیف کو بخوبی پڑھایا۔ حضرت تراب بچپن سے ہی شریعت، طریقت، تزکیۂ نفس تجلیہ روح کے اہم مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ بارہ سال کی عمر میں افکار کی مشق، اور پندرہ سال کی عمر میں تلقین وارشاد کے مراتب کو حاصل کیا، اگرچہ تعلیم وتربیت آپ کے والد نے فرمائی لیکن آپ نے شاہ مسعود علی قلندر (الٰہ آباد) سے بیعت کی اور انھوں نے ہی آپ کو اجازت بیعت وخلافت عطا کی۔

سترہ سال کی عمر میں آپ کی شادی محمد عوض چکلہ دار علوی کی چھوٹی صاحبزادی سے ہوگئی۔ والد نے شرع کے مطابق دعا دی کہ ''اللہ تعالیٰ تم کو فوائد نکاح سے متمتع فرمائے اور اس کے ضرر سے محفوظ رکھے'' آپ سے دو صاحبزادے مولانا شاہ حیدر علی قلندر، حضرت مولانا شاہ تقی علی قلندر اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔

شاہ تراب علی قلندر کا علمی وادبی پایہ نہایت ہی بلند ہے۔ انھوں نے نثر ونظم دونوں میدانوں میں اپنی گراں قدر صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی ادبی کاوشیں کیفیت وکمیت ہر دو اعتبار سے نہایت ہی وقیع ہیں۔ ان کی علمی وادبی فتوحات کا ثبوت ان کے علمی کارناموں سے ہوتا ہے۔ مسعود انور علوی کاکوروی لکھتے ہیں ''تصوف اور ارباب صفاء سلسلہ میں ان کی گراں قدر تصنیفات مقالات صوفیہ، شرائط الوسائط، فتح الکنوز، مطالب رشیدی، مجاہدات الاولیا (یہ پانچوں کتابیں بھی اردو زبان کا جامہ پہن چکی ہیں) نے اہل علم وفضل کے یہاں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ انھوں نے اپنی ان تصانیف اور بیش بہا مکتوبات کے ذریعہ عبادت ومعبود کا مفہوم سمجھایا، خودی وپنداری کے شیشوں کو چکنا چور کیا، حجابات دور کیے اور بیخودی شوق کی گراں قدر دولت سے دلوں کو مالا مال فرمایا۔'' (آجکل نئی دہلی، نومبر 2012، ص 21)

شاہ تراب علی قلندرؒ کا ضخیم اردو دیوان متعدد بار مختلف جگہوں سے شائع ہوا۔ یہ کلیات پہلی مرتبہ مطبع نظامی، کانپور سے 1280ھ مطابق 1863 میں شائع ہوا جو تین سو اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کلیات میں مثنوی 'عاشق وصنم' بھی شامل ہے جو تقریباً ڈیڑھ ہزار اشعار پر مبنی ہے۔ مادہ تاریخ 'بجا ہے داستاں عاشق صنم کی' 1218ھ مطابق 1803 ہے۔ ان کے کلیات میں بکثرت ایسے اشعار موجود ہیں جن میں عاشقانہ رنگ پایا جاتا ہے، لیکن اس عاشقانہ رنگ کو محض عاشقانہ شاعری کے ذیل میں نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایک حقیقی صوفی تھے اور انھوں نے عشق کو معرفت الٰہی کا ذریعہ بنایا تھا، اس لیے اُن کی عاشقانہ شاعری میں بھی موج تہہ نشیں کی صورت میں عارفانہ افکار وخیالات کی ہی جلوہ سامانی موجود رہتی ہے، لیکن اس کی شناخت کے لیے چشم بصیرت کی ضرورت ہے۔ ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی شاعری کی غرض وغایت صوفیانہ افکار وتصورات کی نقش گری ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

سوا ترے تو نہ رکھتا کسی سے الفت ہوں
ہوا میں خلق میں رسوا تری بدولت ہوں

عرفان حق سے جس کی ہوئی ہے نظر بلند
ہفت آسمان پست ہیں اس کی نگاہ میں

لیلی وشیریں سے کیا اس کو کوئی تمثیل دے
جس پری رو سے کوئی شکل بشر ملتی نہیں

شاہ تراب علی قلندر نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ غزل گو شاعر تھے۔ ان کا فطری میلان تصوف ومعرفت الٰہی کی طرف تھا۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ تصوف ومعرفت، فقر وغنا، حقائق ومعارف کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حق تعالیٰ عشق اپنا دے تو بہتر ہے تراب
حسن صوری کچھ نہیں اس سے تو جی بالکل اٹھا

یارو خدا شناسوں کی صحبت ہے کیمیا
بیٹھوں تراب صاحب عرفاں کے سامنے

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کردی
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

شاہ تراب آزاد خیال صوفی شاعر تھے اور ان کی شاعری کا غالب رجحان تصوف ہے لیکن اس کے علاوہ انھوں نے دیگر مضامین سے بھی اپنی شاعری کو مزین کیا ہے تاکہ اُن کی شاعری تعنیات وتحدیدات کا شکار نہ ہو جائے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے عہد کی بھرپور عکاسی کی ہے اور معاشرے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھا ہے۔ انھوں نے انگریزی حکومت کا جہاں کہیں بھی ذکر کیا ہے، اس میں حقارت اور نفرت صاف طور سے دیکھی جا سکتی ہے۔ مثلاً 1841 میں انگریزی حکومت نے جب کابل پر حملہ کیا تو موصوف نے کابل کی خیر وعافیت کی دعا فرمائی۔

غول بندر کے چلے ہیں پھر ولایت کی طرف
شیر حق جلد آ خبر لے، کفر کا بندر کھلا

کابل کی فوج نے انگریزی فوج کو بری طرح سے شکست دی

اور یہ خبر جب آپ کے کانوں تک پہنچی تو طنزیہ لہجے میں کہا۔

جس کا اقبال ہو تنزل پر
وہ چڑھے فوج لے کے کابل پر

جنگ آزادی سے پہلے ہندوستان پر انگریزوں نے جس طرح سے غاصبانہ قبضہ کرلیا اور یہاں کے نظم ونسق کو تباہ و برباد کرنے، اس کی تہذیب کو مٹانے کی جو ناروا کوشش کی، اس کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

سرکار کے خزانے میں کوئی رقم نہیں
دفتر میں پیشکار کے ہیں داخلے بہت
اس زمانے میں ہیں مبصر کم
کیوں نہ بازار لیویں اندھے لوٹ

ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کو سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا لیکن انگریزی حکومت کے دور میں ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی، اس بد انتظامی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

وہی جو چاہے تو ہو انتظام ہندوستاں
کرے جو زلف پریشاں کا اپنے بندوبست

شاہ صاحب نے اُمرا کی بزدلی اور بے راہ روی پر بھرپور طنز کرتے ہوئے کہا کہ یہ کیسے بہادر لوگ ہیں کہ دشمن فوج کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے اور ان ظالموں کی تلوار کا ذوالفقار نام کس نے رکھ دیا۔ وہ کہتے ہیں۔

کیا بہادر ہیں، سپہ سالار ہیں شمشیر جنگ
جن کو وقت جنگ تلوار و سپر ملتی نہیں
کس نے تلوار دے کے ظالم کو
نامور ذوالفقار جنگ کیا

شاہ تراب علی قلندر کاکوروی نے ہندوستان کے سماجی، سیاسی، مذہبی پہلوؤں پر گہری نظر رکھی اور اس زمانے میں زندگی کے ساتھ کیا کیا پریشانیاں پیش آئیں اس کی جیتی جاگتی تصویر اپنی شاعری میں پیش کی۔ ان کی بصیرت اور ژرف بینی پر غور کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ڈیڑھ صدی قبل کی نہیں بلکہ ہمارے زمانے کی بات ہو رہی ہو۔ ایک نام نہاد متقی پرہیزگار، زاہد، ملا دنیاوی فرائض کی انجام دہی کیسے کرتا ہے اور دنیا میں کس طرح غفلت کی زندگی گزارتا ہے، اس کے بارے میں کہتے ہیں۔

تراب انکار رکھتا تھا سماع و وجد سے جو شخص
وہ کیوں دیتا ہے فتوے رقص پر اس کی اباحت کا
کعبہ و مسجد میں جاتے ہو بھلا جی کس لیے
وہ تو ہے دل میں تمھارے پھرتے ہو تم جس لیے

اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے اور دو طرح کے حقوق رکھے ہیں۔ ایک حقوق اللہ اور دوسرا حقوق العباد لیکن انسان اتنا نادان ہے کہ اللہ کا حق ادا

کرنے کے لیے اسی کے بندوں کے حقوق غصب کرلیتا ہے اور پھر اپنے گناہوں کی تلافی کے لیے حج کرنے جاتا ہے لیکن اسے نہیں معلوم کہ انسان کا حق ادا کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ اللہ کا۔ اللہ کسی بندے کی طرف سے اپنے حقوق کی بجا آوری میں غفلت برتنے کے باوجود اپنی رحمت کے صدقے میں اس کی مغفرت کرسکتا ہے۔ لیکن اگر کسی انسان نے کسی انسان کی حق تلفی کی ہو اور اگر وہ معاف نہ کرے تو اس کی معافی کا ذمہ اللہ نے بھی نہیں لیا ہے۔ اس سلسلے میں شاہ تراب علی فرماتے ہیں۔

حق تلف کر کے یہاں، حاجیوں جاتے ہو کہاں
کس لیے پھرتے ہو ادھر سے ادھر سو سو کوس

رہبانیت کو ہدف تنقید بناتے ہوئے یہ دلیل دیتے ہیں۔

کلمۃ الحق میں اس سے کہہ دوں صاف
جو سُنے اور کہا مرا مانے
شہر کیا چھوڑ کے بیٹھا ہے تو جنگل میں تراب
پہلے ہستی کی دکاں اپنی لٹائی ہوتی

شاہ تراب نے گنگا جمنی تہذیب کو اپنی شاعری میں زندہ رکھا ہے۔ انھوں نے دوآبہ گنگ وجمن کے حسینوں کو دنیا کے حسین ترین افراد میں شمار کیا ہے۔

واہ کیا گنگا وجمنا دوآبے کا حسن
آب وتاب ایسا نہ ہو کشور پنجاب میں
حق کا جلوہ دیکھ کے صورت میں خوبوں کی تراب
ملک ہندوستان میں سیر ولایت کیجیے
شیریں ولیلی پہ عاشق ہوتے کب فرہاد وقیس
گر کبھی وہ دیکھتے معشوق ہندوستان کے

اس زمانے کے وکلا آج کے وکیل حضرات سے بالکل مختلف نہیں تھے ملزم کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے عدالت میں کیسے بحث کرتے تھے۔ اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

کوئی دیکھے تماشا قصہ والوں کا عدالت میں
مثال مرغ کیا وکلاء خوش تقریر لڑتے ہیں

اخبار کی ہر زمانے میں بڑی اہمیت تھی۔ اخبارات نے ملک کی آزادی میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے اس کو کس نظر سے دیکھا گیا وہ شاعر کی زبان سے سنیے۔

ترے صدقے میں اے اخبار والے
یہ غفلت اوس کی پرچے میں رقم کر
خبر یہ ہوگئی شائع، نہ عالمگیر ہو کیونکر
شہ خوباں، شکوہ حسن بھی دارا نگر پہنچا

پھر کہا ہے۔

کہیو لیلیٰ سے کہ پھر قیس کو وحشت بھائی
ملک صحرا سے یہ اخبار کا چھاپا آیا

شاہ تراب علی قلندر نے اپنے عہد کی درسگاہوں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ آج کی درس گاہوں سے ذرا بھی مختلف نہیں ہے۔

شوخیاں دیکھ کے طفلانِ پری چہروں کی
راہ لی گھر کی معلم نے دبستاں چھوڑا
جس میں نہ تمیز آئی خوردی و بزرگی کی
شاگرد ہوا تو کیا، استاد ہوا تو کیا

استاد کی عظمت وعزت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

نہ ہو شاگرد لائق سے، کبھی ایسی کوئی حرکت
کدورت جس سے کچھ بھی خاطر استاد میں آئے

قدیم زمانے سے ہی پہیلی کہنے کا عام رواج تھا جس کی مثالیں امیر خسرو کے یہاں بھی ملتی ہیں۔ تراب کے یہاں بھی اس روایت کا التزام ملتا ہے۔ حقہ کے بارے میں ایک پہیلی اس طرح کہی ہے۔

دروں ہے پانی بروں ہوا سر پہ آگ ہے تیز
کشش سے کرتی ہے وہ ذکر حق خفی وجلی

کثیر التصانیف ہونے کے باوجود ان کا تذکرہ خال خال ہی ملتا ہے۔ محض چند علما اور صوفیہ کے تذکروں جیسے روضۃ الازہر فارسی، الانتصاح عن ذکر اہل الصلاح، مشاہیر کاکوری، سخنوران کاکوری، اذکار الابرار، بہارستان تراب، اور تذکرہ گلشن کرم میں ان کے احوال وکوائف، نظریات و افکار کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ پر مبنی بیشتر کتابیں ان کے حالات زندگی وخدمات شعر وادب کے ذکر سے خالی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی عظیم شخصیت سے اردو ادب کو کما حقہ متعارف کرایا جائے۔

■

Javed Ahsan
Research Scholar, Dept of Urdu
Allahabad University, Prayagraj- 211002 (UP)
Mob.:7388137680
Email: javedahasan7@gmail.com

فاروق اعظم قاسمی

جن کتابوں نے متاثر کیا

بچپن میں سب سے پہلی کتاب جس نے ذہن و دماغ پر گہرا اثر چھوڑا وہ ہے ریاست بہار کی نصابی کتاب 'دارا، داور، روزی' اس کے بعد مولانا سید محمد میاں کی کتاب 'دینی تعلیم کا رسالہ' اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی 'اردو زبان کا قاعدہ' نے بھی کتابوں سے انسیت پیدا کی۔

کتابوں سے دوستی میں بچوں کے ماہنامہ امنگ کا بھی بڑا اہم رول رہا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب حروف والفاظ جوڑ کر اردو پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ اب اپنی پسند کی کتاب کی جستجو رہتی : ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میرے رشتے کا ایک بھانجا شمشاد عرف پتول آسنسول سے اپنی ننھیال مشکی پور آیا اور ساتھ ہی ماہنامہ امنگ کی ایک کاپی بھی لایا، ہمیں دکھایا، ہم اپنے ہم جولی زاہد اور اسرار وغیرہ کے ساتھ اسے دیکھنے لگے، یہ ہمارے لیے ایک نئی چیز تھی، ہمیں بہت پسند آئی، ذوق وشوق اور پورے انہماک کے ساتھ اس کی کہانیوں میں ہم کھو گئے، بندروں والی اس کی ایک کہانی نے تو ہمیں دیوانہ ہی کر دیا۔ اب ہم میں سے ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ وہ رسالہ اسی کے قبضے میں رہے اور وہ اسے حرز جان بنائے رکھے۔ بالآخر جنگ کی نوبت آن پہنچی اور ہوئی بھی۔ جانی نقصان تو کچھ نہیں بلکہ مالی بھی نہیں؛ بس ذرا سا جذباتی نقصان یہ ہوا کہ آپس کی چھینا جھپٹی میں ہماری محبوب ومعشوق کتاب شہید ہوگئی۔

جب حصول تعلیم کے لیے دیوبند جانا ہوا اور وہاں کی تعلیمی زندگی کا آغاز کیا تو ایک نئے ماحول سے سابقہ پڑا۔ ویسے بھی یہاں کا قیام میرے لیے ایک نیا تجربہ ثابت ہونے جا رہا تھا۔ ہر طرف پڑھنے لکھنے کا چرچہ، کہیں تقریر اور زبانی مشق ومزاولت کا غلغلہ تو کہیں تحریری مسابقت کی ہوڑ، کہتے ہیں نا کہ ماحول سب سے بڑا استاذ ہوتا ہے۔ اسی فضا میں راقم کے اندر مطالعے کی جوت جگی، کچھ مشفق اساتذہ نے اپنے مفید مشوروں سے نوازا اور بعض مخلص احباب نے بھی رہنمائی کی۔ اس سلسلے میں استاذ محترم مولانا سلمان بجنوری اور مفتی اسعد اللہ سلطانپوری کی ذات گرامی سرفہرست ہے اور دوستوں میں شاداب سہیل اور مظہر سوپولوی کے نام یاد رکھے جانے کے لائق ہیں۔ کچھ کتابوں نے اندرون کو جھنجھوڑا اور کچھ نے کھردری راہوں پہ چلنا سکھایا اور منزل کا راستہ آسان کیا۔ ایسی پیاری کتابوں کی کہکشاں میں مولانا علی میاں کی 'پاجا سراغ زندگی'، شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی 'وقت کی اہمیت'، مولانا محمد ساجد قاسمی کی 'تحصیل علم میں اسلاف کی قربانیاں'، مولانا محمد اسلم قاسمی شیخوپوری کی 'بڑوں کا بچپن'، مولانا محمد عمران خان ندوی کی 'مشاہیر اہل علم کی محسن کتابیں'، مولانا عبدالماجد دریابادی کی 'آپ بیتی'، شورش کاشمیری کی 'شب جائے کہ من بودم'، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب 'روائع اقبال' کا اردو ترجمہ 'نقوش اقبال' (پروفیسر شمس تبریز خاں قاسمی)، ڈاکٹر کلیم احمد عاجز کی کتاب 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا' اور ماہنامہ 'رفیق منزل' دہلی (مطالعہ نمبر) جیسی کتابیں بطور خاص شامل ہیں۔ ان کتابوں نے میری مطالعاتی زندگی میں جوالہ مکھی کا کام کیا جس کی چنگاری آج بھی گرم اور روشن ہے۔

آج کے اس ڈیجیٹل عہد میں بھی دیوبند میں کتابوں کا کلچر کسی قدر بحال ہے اور پندرہ بیس سال قبل تو یہ روایت بہت مستحکم تھی، طلبہ کے مختلف پروگرام منعقد ہوتے اور طلبہ کو انعامات سے نوازا جاتا اور بیشتر کتابوں ہی کی صورت میں انعامات دیے جانے کا رواج تھا اور آج بھی ہے۔ اساتذہ کی طرف سے بھی ایسی کتابوں کے مطالعے کی تلقین کی جاتی جن سے طلبہ کو وقت کی اہمیت کا احساس ہو، اور آگے بڑھنے اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ ملے، ساتھ ہی زبان و بیان بھی پختہ ہو اور اسلوب و انداز بھی درست وشگفتہ ہو۔ اس سلسلے میں راقم نے غالباً سب سے پہلے مولانا علی میاں کی 'پاجا سراغ زندگی' خریدی، اس کے نام ہی میں دلکشی محسوس ہوئی لیکن مطالعے کے بعد اس نے مزید سحر زدہ کیا اور اس نکتے کی طرف رہنمائی کی کہ ایک طالب علم کیسے منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے اور عملی زندگی میں کیوں کر انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس کتاب سے کئی اہم کتابیں پڑھنے کی تحریک ملی۔ تحصیل علم میں اسلاف کی قربانیاں، وقت کی اہمیت اور نقوش اقبال نے کتابوں کا ایسا دیوانہ بنایا کہ اپنی درسی مصروفیات کے علاوہ ہمہ وقت کوئی نہ کوئی کتاب میرے ہاتھوں میں ہوتی، چائے پیتے، کھانا کھاتے، قیلولہ کرتے ہوئے اور ٹرین وبس میں سفر کرتے ہوئے مطالعہ جاری رہتا؛ آج بھی خالی بیٹھنا میرے لیے بہت دشوار ہوتا ہے۔

وہ جو شاعری کا سبب ہوا، بھی بڑی البیلی کتاب ہے، ویسے تو کلیم عاجز مرحوم نے اس کتاب میں اپنے، گھر، خاندان اور پورے گاؤں کی شکست وریخت کی خونی داستان رقم کی ہے اور اپنے گاؤں کی شکی مسجد کی زبانی اپنی آپ بیتی ہمیں سنائی ہے۔ کوئی بھی اس داستان کو پڑھ کر چھلک اٹھتا ہے اور بمشکل ہی اپنے آنسو روک پاتا ہے لیکن شاعر غمزدہ کے لہجے میں بجائے شکوہ شکایت اور نفرت و عداوت کے لفظ لفظ میں محبت کی خوشبو، حرف حرف میں صبر وشکیبائی اور نقطہ نقطہ میں ہمت وحوصلے کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ عاجز مرحوم کی یہ کتاب کٹھن وقتوں میں ہمیں جینے کا حوصلہ بخشتی ہے۔

شورش کی 'شب جائے کہ من بودم' اور دریابادی کی آپ بیتی نے اردو ادب سے مصافحہ و معانقہ کرایا۔ اول الذکر نے اردو زبان کی بلندی وبرتری کو سمجھایا، اس

کی وسعت وندرت کو بتایا اور محبت کی اس زبان کی عظمت ووقعت دل میں بٹھائی۔ اردو نثر میں پختگی پیدا کرنے کے لیے یہ کتاب تعویذ بنائے جانے کی مستحق ہے۔ دریابادی کی آپ بیتی نے ذوق مطالعہ کی طرح ڈالی اور انگلی پکڑ کر مضمون نگاری کی راہ دکھائی۔ اس کتاب نے یہ بھی بتایا کہ ایک مبتدی مضمون نگار کو کن پگڈنڈیوں سے گزرنا پڑتا ہے، کیوں کر ایک کامیاب مضمون نگار اور جاندار مصنف بنا جاسکتا ہے؟ دریابادی نے اپنی اس کتاب میں یہ گر بھی سکھایا کہ کیسے تھوڑے وقت میں زیادہ کام کیا جاسکتا اور کم لفظوں میں زیادہ معانی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ نوواردان قلم کے لیے اس آپ بیتی کا مطالعہ میل کا پتھر ثابت ہوسکتا ہے۔

نثری ادب میں مجھے خودنوشت سوانح، خاکے اور سفرنامے بہت پسند ہیں بطور خاص حج کے سفرنامے۔ اس سلسلے کی بھی درجنوں کتابیں پڑھیں لیکن آپ بیتی میں دریابادی کی 'آپ بیتی'، ڈاکٹر کلیم عاجز کی 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا'، علامہ سید مناظر احسن گیلانی کی 'احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن' مولانا جعفر تھانیسری کی 'کالا پانی' اور شورش کاشمیری کی 'بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل' کے مطالعے نے دل میں عجیب بھونچال پیدا کیا تھا اور ذہن درد وکرب اور غم ومسرت کی مختلف کیفیات سے دوچار ہوا۔ اول الذکر دو کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔ علامہ گیلانی کی یہ آپ بیتی مکمل تو نہیں کہی جاسکتی لیکن دیوبند میں رہتے ہوئے کچھ اپنی اور کچھ دیگر طلبہ کی مصروفیات، ان کے مشغلے اور دارالعلوم دیوبند کے علمی جاہ وجلال، دینی شوکت اور ادبی شان کی ایسی تصویرکشی کی گئی ہے کہ قاری تھوڑی دیر کے لیے یا تو خود اسی فضا میں گم ہوجاتا ہے یا پھر وہ ان مناظر کو دیکھنے کی تمنا کرنے لگتا ہے۔ کتاب زبان وبیان کے لحاظ سے بھی اور اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی لائق مطالعہ ہے۔ کالا پانی ایک مجاہد آزادی کی دردناک داستان ہے، کچے ذہن کو اس کے مطالعے سے بچنے ہی میں عافیت ہے تاہم کتاب اپنے اندر بے پناہ دلکشی رکھتی ہے اور ساتھ ہی وطن پر جان نچھاور کرنے والے متوالوں کی لازوال قربانیوں کے بہت سے اسرار سے بھی آگاہی بخشتی ہے۔ شورش کی آپ بیتی محض آپ بیتی نہیں تحریک آزادی ہند کی تاریخ کا ایک اہم باب بھی ہے۔ اس میں ہندو مسلم کی قربانیوں، باہمی رویوں، فرقہ وارانہ فساد کی جڑوں اور سفید پوشی میں کالے دلوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ شورش کا تعلق احرار سے تھا اور وہ خود ایک پریکٹیکل مسلم تھے تاہم؛ جانبداری، تعصب اور ناانصافی سے کوسوں دور تھے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی کتاب پڑھ کر نہیں زندگی کا مطالعہ کرکے لکھی تھی۔ تحریک آزادی ہند پر یہ کتاب ایک قیمتی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا امتیاز غیر جانبدارانہ اسلوب ہے۔ انداز نگارش انتہائی البیلا اور اچھوتا ہے اور معلومات سے بھرپور اس کتاب کا مطالعہ ہر ہندوستانی کو کرنا چاہیے۔

اردو خاکوں میں منٹو کے خاکوں نے بہت متاثر کیا اور حال کے خاکوں میں پروفیسر غضنفر کے خاکے مجھے بے حد پسند ہیں کہ معلومات کی فراوانیوں کے باوجود افسانوی طرز میں یہ خاکے ڈھلے ہوئے ہیں۔ ان میں اسراف کے بجائے کفایت الفاظ کی رعایت ملتی ہے۔ منٹو کی کتاب 'گنجے فرشتے' اور 'لاؤڈ اسپیکر' 1937 سے 1948 تک کی فلمی دنیا کا خوبصورت تاریخی البم ہیں۔ ان میں چراغ حسن حسرت، ستارہ اور رفیق غزنوی کے خاکے کم از کم اس درجے کے تو ضرور ہیں کہ ان پر مقدمے قائم ہوتے لیکن پتہ نہیں کیوں قائم نہیں ہوئے، ممکن ہے یار لوگوں کے تحت الشعور میں یہ بات ہو کہ ان کے اس اقدام سے منٹو کا قد کہیں ایک مشت اور نہ بڑھ جائے۔ یہ خاکے خاکہ نگاروں کے لیے ایک رہنما کا درجہ رکھتے ہیں۔ ایسے ہی غضنفر کے خاکوں کے مجموعے 'سرخ رو' اور 'روئے خوش رنگ' بھی تخلیقیت اور زبان وبیان کی چاشنی سے بھرپور ہیں۔ انھیں معلومات کے لیے کم اور فن خاکہ نگاری سے واقفیت کے لیے زیادہ پڑھنا چاہیے۔

سفرنامے بھی درجنوں پڑھے، ان میں مفتی تقی عثمانی کی 'جہان دیدہ'، شبلی کی 'سفرنامہ روم ومصر وشام' اور مولانا منت اللہ رحمانی کی 'سفر مصر وحجاز' ایسی کتابیں ہیں جو ذہن کو وسعت اور نظر کو کشادگی عطا کرتی ہیں۔ جہان دیدہ اسم بامسمیٰ کتاب ہے، شاید اردو کا یہ پہلا سفرنامہ ہے جو بیس ملکوں کے اسفار پر محیط ہے اور وہاں کے جغرافیائی، تاریخی، دینی، علمی اور تہذیبی احوال کا ایسا مرقع پیش کرتا ہے کہ قاری تھوڑی دیر کے لیے خود کو ان ممالک کی سیر کرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ ویزا پاسپورٹ کی جھنجھٹ کے بغیر اگر کوئی بیس ملکوں کی سیر کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شبلی اور رحمانی کے سفر کے بیچ (1894-1964) ستر برسوں کا وقفہ ہے تاہم دونوں کے سفرناموں میں نقطۂ مشترک یہ ہے کہ دونوں میں متعلقہ ممالک کا تعلیمی سروے پیش کیا گیا ہے۔ ایک میں بطور خاص قدیم ترکی کا اور دوسرے میں مصر کا۔ اس وقت یہ کتابیں تعلیمی صورت حال کا نمونہ تھیں اس وقت یہ کتابیں ان ملکوں کی تعلیمی تاریخ کا درجہ رکھتی ہیں۔ شبلی کا سفر بحری اور طویل تھا اس لیے دوران سفر کئی واقعات پیش آئے جنھیں بڑے پرلطف انداز میں سفرنامہ نگار نے بیان کیا ہے اور رحمانی کا سفر ہوائی اور مختصر تھا اس لیے سفرنامہ بھی مختصر ہی ہے تاہم دونوں سفرناموں میں زبان وبیان کی لطافت اور اسلوب وانداز کی شائستگی وبرجستگی ہر جگہ برقرار ہے، شبلی کی نثر تو جادو اثر ہے ہی لیکن رحمانی کی نثر بھی آبشاری ہے اور قاری کو قابو میں رکھنے کا ہنر رکھتی ہے۔

اس کورونائی عہد اور لوک ڈاؤن کے زمانے میں بھی کئی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ہاتھ آیا۔ 'سفر مصر وحجاز' اور 'بوئے گل' کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ ایک اور کتاب 'کتابیں ہیں چمن اپنا' کے مطالعے سے بھی ذہن آسودہ ہوا۔ یہ کتاب عبدالمجید قریشی کی ہے جو علی گڑھ کے فاضل اور ملتان کے رہنے والے ہیں۔ کتابوں سے ان کا عشق، ان کا لگاؤ اور ان کی دیوانگی قابل دید وداد ہے۔ ان کے ان ہی جذبات واحساسات کا ایک خوب صورت البم یہ کتاب ہے۔

جناب اسے کتاب کیا کتابی کائنات کہیے۔ بیک وقت یہ کتاب دنیا بھر میں بسے اپنے خاندان کی مختلف شاخوں سے باتیں کراتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ آپ بغیر کسی زحمت کے بیٹھے بٹھائے دنیا کی کئی اہم لائبریریوں کی سیر کرلیتے ہیں اور سینکڑوں ادبا وشعرا اور اہل قلم سے آپ کی بات وملاقات ہوجاتی ہے۔ بھئی کتابوں کا عاشق ہو تو عبدالمجید قریشی جیسا؛ بلکہ عاشق زار کہہ لیجیے! کتابوں کو ماں جیسا پیار دینے والے اس دیوانے کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کتاب بدصورت ہو، کمزور ہو، اسے ٹھوکر لگ جائے، اس پر دھول جم جائے، اس کا ورق مڑ جائے، کتاب پر کوئی کچھ لکھ دے؛ یہاں تک کہ ڈاک سے آئی کتاب پر بندھی رسی کا داغ بھی اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

کتاب کی تمام رنگا رنگی کے ساتھ مصنف کی علیگیریت، سرسیدی اسلوب اور مجازی شعریت، لکھنؤ کے ٹونڈے کباب، دہلی کی نہاری اور حیدرآبادی بریانی کو بھی پیچھے چھوڑتی محسوس ہوتی ہے۔ اس البیلی کتاب کے مطالعے سے جہاں کتابوں سے عشق اور مطالعے کا ذوق بیدار ہوتا ہے وہیں وہ آج کے ایام نظربندی کی وحشت کو مانوسیت سے بدلتی ہے اور اس کی تنہائی سے دوستانہ بھی قائم کردیتی ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ مصنف نے اپنے اس کتابی انسائیکلوپیڈیا کو کائنات کی تمام کتابوں کی ماں قرآن مجید سے منسوب کیا ہے۔

■

Dr. Farooque Azam Qasmi
Dept of Urdu, Ram Lakhan Sing Yadav College
Betia - 845438

جہانگیر احساس

نظامیہ طبی کالج کا تعارف اور کتب خانہ

سرزمین دکن کو یہ امتیاز و اختصاص ازل ہی سے حاصل رہا ہے کہ یہاں سے جس فن اور تخلیق کی داغ بیل ڈالی گئی اس نے چہار دانگ عالم میں اپنی اہمیت کو منوا کر اپنی مسلمہ حیثیت کو آج بھی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ چاہے وہ نظم و نثر کی بات ہو یا صاحبِ دیوان شاعر کی بات ہو یا پھر تعلیم وصحت کے شعبہ جات میں ترقی ہو۔ یہاں کے قطب شاہیہ سلاطین سے لے کر آصف جاہی حکمرانوں نے ہر دور میں رعایا پرور ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ جب ہم دکن کے دورِ جدید کا تذکرہ کریں گے تو اس کے آخری دو حکمرانوں میر محبوب علی خان بادشاہ اور آصفِ سابع نواب میر عثمان علی خان صدیقی بہادر کی دوررس نگاہیں اور ان کی جانب سے انجام دیے گئے علمی، ادبی و تعمیری کارناموں کو دادِ تحسین سے نوازے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔

ارضِ دکن تا ابد اپنے ان رعایا پرور بادشاہوں پر نازاں ہے گی کہ ان کی جانب سے قائم کیے گئے تعلیمی اداروں اور مختلف پراجکٹس سے آج بھی یہاں کی عوام مستفید ہو رہی ہے۔

میر عثمان علی خان کے عہد حکومت میں ریاست حیدر آباد کی جس تیز گام انداز میں ترقی ہوئی شاید اس کی نظیر ہندوستان کی کوئی ریاست پیش کر سکے۔ آصفِ سابع نے جہاں یہاں کی عوام کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جامعہ نظامیہ، جامعہ عثمانیہ و دیگر کلیۂ اناث و ذکور کا قیام عمل میں لایا وہیں انہوں نے دکن کے عوام کی صحت سے متعلق ضروریات و نگہداشت کو سرانجام دینے کے لیے جہاں "نظامیہ صدر شفا خانہ" قائم کیا وہیں فنِ طب بالخصوص یونانی طریقۂ علاج کو فروغ دینے کے لیے 'نظامیہ طبی کالج' کی سنگ بنیاد رکھی۔

ابتدا میں اس کالج کا نام 'مدرسۂ طبیہ سرکار عالی' رکھا گیا تھا۔ شروعاتی دنوں میں یہ کالج صرف ایک استاذ کے زیر نگرانی کارکرد تھا اور اس وقت 'سر رشتہ طبابت و یونانی' کے سالانہ مصارف پندرہ، بیس ہزار سے زائد نہ تھے جب کہ 'مدرسۂ طبیہ' کے سالانہ اخراجات کا تخمینہ چودہ یا پندرہ سو ہوا کرتا تھا۔ ایک عرصہ تک مذکورہ کالج میں طب کی تعلیم اور اشاعتِ فن کا سلسلہ سبک خرامی کے ساتھ چلتا رہا نہ اس کے عملہ میں کوئی اضافہ ہوا نہ مصارف میں...!!

نظامیہ طبی کالج کے دورِ زریں کا آغاز آصفِ سابع کی تخت نشینی کے ساتھ ہی شروع ہوا۔ انھوں نے علوم مشرقیہ اور مغربیہ کی ترقی واشاعت کے ساتھ طبِ یونانی کے جسد نیم جاں میں از سر نو حیات بخش تازگی کی لہر دوڑا دی۔ اس طرح طبِ یونانی کے فروغ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اور اساتذہ کی ایک بڑی تعداد کے تقررات اس ضمن میں کیے گئے ایک طرح سے یہ دور طب یونانی کے نشاۃ ثانیہ کا دورِ زرین کہلانے کا مستحق ہے۔ مذکورہ سرگرمیوں کو انجام دینے کے لیے جہاں یہ کالج کارگر ثابت ہوا وہیں اس کے مبسوط نصاب تعلیم اور منظم طریقۂ تدریس کو فروغ دینے کے لیے اعلیٰ حضرت کو توجہ دلائی گئی تو انہوں نے اس سلسلہ میں سنہ 1336 ف میں پہلا 'فرمان مبارک' جاری کیا جو کچھ اس طرح تھا:

"حکماء کے فرائض کی تنقیح اور طریقۂ سربراہیٔ ادویہ کی اصلاح اور مدرسۂ طبیہ کے تعلیمی نصاب کی ترمیم وغیرہ کے متعلق مکمل اسکیم مرتب کرکے باب حکومت کی رائے کے ساتھ گزرانی جائے۔ حکم مناسب صادر ہوگا۔"

(دستور العمل، نظامیہ کالج، سرکار عالی، ص نمبر: 2)

اس کے بعد 'صدر شفا خانہ نظامیہ' کی عمارت کی تعمیر اور علاج بالتدبیر کے ضمن میں 27/ جمادی الثانی سنہ 1344 ھ کو دوسرا 'فرمان مبارک' صادر ہوا جس میں بہ طورِ خاص عثمانیہ دواخانہ کا ذکر کرتے ہوئے اس نہج پر مذکورہ شفا خانہ کی تعمیر و ترقی کے لیے حکم دیا گیا۔

چنانچہ اس ضمن میں چار مینار سے متصل ایک وسیع خطۂ اراضی کو تین لاکھ روپئے کے عوض حاصل کیا گیا اور تقریباً دس لاکھ کی لاگت میں موجودہ عمارت کو تعمیر کیا گیا۔ جس کا سنگِ بنیاد حضور نظام نے 14/ ربیع الثانی سنہ 1345 ھ کو نصب فرمایا۔ مذکورہ دو منزلہ عمارت میں کالج، 'صدر شفا خانہ' مخزن الادویہ کے لیے علاحدہ علاحدہ جگہ کو مختص کیا گیا اس طرح 7/ شوال المکرم سنہ 1358 ھ کو یہ عالیشان عمارت پایۂ تکمیل کو پہونچی جس کا افتتاح خود سلطان العلوم اعلیٰ حضرت نے انجام دیا۔ جس سے آج تک بلا تخصیص مذہب و ملت لوگ استفادہ کر رہے ہیں۔

صدر شفا خانۂ نظامیہ کے باضابطہ آغاز کے ساتھ ہی یہاں 'نظامیہ طبی کالج' کے لیے کئی اساتذہ کے تقررات عمل میں لائے گئے یہاں چند ایک اساتذہ کا ذکر موقع و محل کی مناسبت سے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس وقت کے اساتذہ اور متعلقہ مضامین کچھ اس طرح تھے۔ مولوی حکیم محمد مقصود علی خان، صدر کالج تھے جب کہ پروفیسر مولوی حکیم محمد کبیر الدین، نائب صدر کالج کے علاوہ ان کے ذمہ تحقیق و تطبیق وکلیاتِ ادویہ کی تدریس تھی تو پروفیسر مولوی حکیم فضل الرحمٰن خان کو مرضیات، سریریات اور منافع الاعضاء کا شعبہ تفویض کیا گیا۔ اس طرح مولوی حکیم سید علی صاحب آشفتہ کو معالجات، سریریات و ادویہ، مولوی حکیم محمد ابراہیم کو کلیات، مبادی (منطق و فلسفہ) جب کہ مولوی حکیم سید حیدر حسینی کو معالجات، ڈاکٹر مرزا حمید اللہ بیگ کو جراحیات، علم الجراثیم جیسے شعبہ میں درس و تدریس کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس کے علاوہ نظامیہ طبی کالج سرکار عالی کے لیے ایک مجلس تعلیمی بھی تشکیل دی گئی جس کے صدر کالج کے پرنسپل مولوی حکیم محمد مقصود علی خان تھے۔ یہ مجلس 6 ارکانِ عاملہ اور ایک معتمد پر مشتمل تھی۔ جس کے ذمہ وقتاً فوقتاً کالج کے قواعد و نصاب میں رد و بدل کے ساتھ نصابی کتابوں کی ضرورت کی مناسبت سے تیاری، طلبہ کے داخلے اور امتحانات کا انتظام، کالج کا نظم و ضبط، طلبہ کے اخراج و تادیبی سزا کی سفارش، کالج کے غیر سندی امتحانات کا انتظام، ممتحنوں کا تقرر، نظام الاوقات مرتب کرنا، اساتذہ کے متعلقہ مضامین کا تعین، کتابوں کی خریدی، انفراسٹرکچر کی کمی کو دور کرنا، خالی جائیدادوں پر تقررات، جیسے ذمہ داریاں عاید تھیں۔ دوسرے نظامیہ طبی کالج کی خصوصیات یہ رہیں کہ اسے شاہی سرپرستی ابتداء سے حاصل رہی جس کے بدولت

نظامیہ طبی کالج اور صدر شفاء خانہ کے سالانہ مصارف کے لیے اس وقت تقریباً دو لاکھ پچیس ہزار روپے منظور کیے گئے۔ جہاں پر کیا امیر، کیا غریب ہر ایک کی طبی نگہداشت اعلی پیمانہ پر کی جانے لگی تمام مقیم و غیر مقیم مریضوں پر یکساں توجہ دی جاتی رہی۔

نظامیہ طبی کالج کا اختصاص یہ بھی رہا ہے کہ یہاں داخلہ پانے والے طلبہ سے داخلہ فیس لی جاتی تھی نہ تعلیمی فیس...!! جب کہ قابل اور امتیازی نشانات پانے والے طلبہ کو ماہانہ 20 تا 30 روپے تک وظائف مقرر کیے گئے تھے۔ کالج میں قابل اساتذہ کا تقرر اس وقت کے مروجہ اصول وضوابط کے تحت کیا جانے لگا۔ یہاں کے فارغین کو بغیر کسی مشکلات کے سرکاری نوکریاں ملنے لگیں۔ اس وقت ریاست حیدرآباد میں کل 87 یونانی دواخانے موجود تھے۔

کالج کے اغراض ومقاصد میں طبِ قدیم کی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنا، قابل اطبا کے ساتھ یونانی طریقۂ علاج کو بڑے پیمانے پر فروغ دینا تھا۔ اسی طرح قدیم طبی اصول کو برقرار رکھتے ہوئے جدید علوم کو اس حد تک نصابِ تعلیم میں شامل کیا گیا کہ طبِ قدیم کی اصلی حالت برقرار رہے۔ ان تمام خصوصیات کے باعث مذکورہ کالج کی دھوم پورے ہندوستان میں مچ گئی۔ اس کے علاوہ اصولِ تعلیم کی تقسیم اور اسناد، مدتِ تعلیم، زبانِ تعلیم، مضامینِ تعلیم کے علاوہ طبعیات، کیمیا، صرف ونحو (عربی)، منطق، فلسفہ، منافع الاعضاء، تشریح علمی و عملی، کلیات، علم ادویہ مع دواسازی، قدیم وجدید پیتھالوجی مع علم الجراثیم، طب قانونی، حفظانِ صحت، معالجات، علم الجراحت، تشخیص عملی، مطب ونسخہ نویسی، تاریخ وسیاسیات طب اور تحقیق وتطبیق کے مسائل کی تعلیم دی جاتی تھی۔ شرائط داخلہ میں ہر امیدوار کا جامعہ عثمانیہ یا کسی مسلمہ یونی ورسٹی سے میٹرک کامیاب ہونا یا مولوی، منشی، عالم پاس ہونا لازمی تھا۔

اسی طرح ایسے طلبہ جو کسی تعلیمی سند کے حامل نہیں تھے ان کے لیے مولوی یا میٹرک کے مساوی امتحان کی شرط رکھی گئی تھی۔ عمر، صداقت نامہ صحت، سیرت و اخلاق کا صداقت نامہ داخل کرنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔ جب کہ نظام تعلیم میں سندی اور غیر سندی طریقہ کو رواج دیا گیا۔ نظامیہ طبی کالج میں کتب خانہ، بزم طلبہ، امتحاناتِ خانگی، دار الاقامہ، کتب ونصابِ تعلیم کے لائحۂ عمل کو مدون کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں مدرسۂ نظامیہ سرکار عالی، حیدرآباد، دکن، مدرسۂ دیوبند، مدرسۂ عالیہ کلکتہ، مدرسۂ مظاہر العلوم سہارنپور و دیگر مدارس سے فارغ طلبہ کو مذکورہ کالج میں داخلہ کی سہولت دی گئی۔ چارسالہ نظامیہ طبی کالج کے کورس میں ابتدائی طبی امداد سے لے کر فنِ ولادت جیسے علوم کے علاوہ طبیب ماہر کے تحت دیگر طبی علوم کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا تھا۔

میں نے جب نظامیہ طبی کالج کے لائبریری کا دورہ کیا تو یہاں کی لائبریرین محترمہ رانی رماتی نے بتایا کہ کالجِ ہذا کے کتب خانے میں فنِ طب، تاریخ، تصوف، شعرو شاعری وغیرہ موضوعات پر عربی، فارسی، اردو و انگریزی زبانوں میں سیکڑوں کتابیں موجود ہیں اسی طرح مشہور ومعروف اطبا کے قلمی نسخے اور مخطوطات بھی مذکورہ کتب خانے کی زینت میں اضافہ کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرسری طور پر یہاں موجود چند معروف کتابوں، نسخوں اور مخطوطوں کا ذکر کیا جائے تاکہ اس کتب خانے کی اہمیت وافادیت سے اطباء، حکماء، طلبہ، اہلِ علم ودانش بھی واقف ہوسکیں۔

جواہرِ خمسہ، محمد بن خطیر الدین، قانونِ شیخ مکمل عربی از: شیخ الرئیس بوعلی سینا، الصحاح فی اللغۃ از: ابونصر اسمٰعیل فارابی، حدود الامراض از: محمد اکبر محمد ارزانی، رسالہ خواصِ ادویہ از: ڈاکٹر محمد قاسم، مفرداتِ مسیحائی از: حکیم سید محمد خان مسیح الدولہ، تاریخ حکماء یونان از: مولانا شمس الدین محمد، رسالہ اکمل واجمل از: محمد باقر بن محمود، رسالۂ ہیئت المعروف رسالہ قوشجی از: ملاعلی قوشجی، مجمع الفوائد از: حکیم احمد حسین، تراکیب عطریات از: محمد حسین بن السعید، قرابادین قلانسی از: حکیم غلام مصطفی خان، میزان الاطباء از: تقی الدین محمد بن صدر الدین، قوت لایموت از: سید فضل علی، طبِ احمدی از: خواجہ احمد علی خان، بیاض نسخہ جاتِ فارسی از: میر عابد علی، خلاصۃ الحکمۃ فارسی از: محمد حسین بن محمد ہادی، جراحی فطری اردو از: سید محمد قاسم، شرح شفاء عربی از: ملاعلی قاری، رسالہ ہیضہ فارسی از: ابو القاسم اصفہانی، شرح قانون سوم عربی از: بوعلی سینا، ریاض الفوائد فارسی از: محمد امان بن محمد افضل، بیاض نسخہ جات فارسی واردو از: حکیم احمد سعید خان، دیوان حافظ فارسی از: حافظ شیرازی، نسخہ جاتِ ویدک اردو، مفتاح الخزائن فارسی، تحقیق الصلوۃ فارسی جیسی کتابوں کے علاوہ قلمی بیاضوں میں طب شہابی فارسی، قانون شیخ معالجات عربی، مختصر المعانی عربی، خواص الادویہ، میزان طب فارسی، خلاصۃ الماکولات والمشروبات عربی، شرح کافیہ (حاشیہ شرح جامی) شرح تذکرہ میر سید شریف عربی، بیاض کیمیاء، فارسی، میزان المزاج، تذکرہ داؤد انطاکی وغیرہ سے ہٹ کر غیر طبی قلمی نسخہ جات میں وسیلۃ الشفاء از: محمد باقر محمد صالح، شرح اشارات عربی، طلسم اعجاز، طبی خزانہ شاہی، (بیجاپور)، کفایہ منصوری، مفتاح الفرس، بیاض عملیات، رسائل فی الطب والاوفاق، طبِ دار اشکوہی اول، دوم فارسی، تالیف شریف از: محمد شریف خان، یادگار دکن اردو از: سید محمد قاسم، بیاض کشتہ جات اردو، طبِ یوسفی فارسی، مسائل حکمت و اخلاق فارسی، مختصر الایکام فارسی، از: محمد غیاث الدین، طبِ فرشتہ فارسی از: محمد قاسم کامل التعبیر فارسی، طب فریدی فارسی، قرابادین شفائی از: مظفر بن محمد الحسنی، رسالہ ترکیب طعام اردو، طب اعظم فارسی از: سید محمد بن سید شاہ اعظم، رسالہ نجوم فارسی، شرح اسباب عربی از: نفیس بن عوض، رسالۂ اسراج استخراج فارسی، الفاظ الادویہ فارسی از: نور الدین محمد عبداللہ، موجز عربی، تاریخ خلفاء فارسی، طب اورنگ شاہی فارسی از: درویش محمد حکیم امین آبادی، طب اغراض الطبیہ فارسی از: اسمٰعیل جرجانی، مفتاح الاظفار اردو از: احمد علی بن محمد علی، تحفۃ المجربات فارسی، قاموس عربی، مفید الاجسام اردو، رسالہ نجوم وجفر فارسی، بیاض اعمال کیمیاء فارسی، مجموعہ خانی فارسی از: بہرام خان، مجمع البحرین فارسی، رسالہ فی الادب منظوم فارسی، منتخب براکلوس فارسی، اسماء ادویہ اردو از: سید محمد قاسم، دستور العلاج فارسی، شرح تشریح الافلاک عربی از: ملاعصمۃ اللہ، رسالہ فی الطب اردو از: ڈاکٹر فلیمنگ، اوراق شرح اسباب عربی، رسالہ نبض اردو، مخزن الادویہ فارسی، رسالہ چوب چینی فارسی، رسالہ فی الطبخ فارسی، اصولِ طب اردو، مرأۃ الحکماء فارسی، ریاض مناظر فارسی، کتاب فی الشعر فارسی، کتاب تذکرہ شیخ داؤدی عربی، کتاب فی فن العروض فارسی، مخزن العلوم فارسی، لذت النساء اردو، تنزلات ستہ فارسی از: عبدالعلی معدن الشفاء سکندر شاہی فارسی، مفرح القلوب فارسی، نسخہ جات طب قدیم فارسی، بیاض نسخہ جات فتق وکھانسی فارسی، مشکوٰۃ المصابیح عربی، رسالہ فی الفقہ عربی، کتاب فی التفسیر عربی، اوراق کلیہ ادویہ اردو جیسے علمی خزینہ موجود ہیں اس کے علاوہ دواخانہ کے باب الداخلہ کے اندرونی دیواروں کے جانب اعلی حضرت میر عثمان علی خان کی فنِ طب سے متعلق کارآمد باتیں، ہدایات اور سبق آموز نصائح اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ خسرو دکن کو طب یونانی اور فنِ یونانی قدیم وجدید سے کتنی دلچسپی تھی۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ "نظامیہ صدر شفاء خانہ" کے تحفظ کے ساتھ نظامیہ طبی کالج اور کتب خانے میں موجود قدیم کتابوں، قلمی نسخوں اور مخطوطات کی مناسب نگہداشت کی جائے ورنہ آنے والے وقتوں میں یہ دیمک اور دیگر حشرات الارض کی غذا بن کر ماضی کا حصہ بن جائیں گے۔

■

Dr. Jahangeer Ehsas
Plot No:120, Phase 2nd, Shastri Puram
Hyderabad-500 052 (Telangana)
Mob.: 8790687051

نوشین حسن

اردو تحقیق اور مولانا امتیاز علی عرشی

دارالسرور رامپور میں جہاں شعرا ادبا کی ایک کہکشاں آباد رہی ہے، وہیں تحقیق کی دنیا میں امتیاز علی عرشی کا مقام صف اول میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اردو تحقیق کو ایک نئی سمت و رفتار عطا کی۔ عرشی نے تحقیق کے ان نئے گوشوں کو تلاش کیا جو ان سے پیشتر پوشیدہ تھے۔ ان کے علمی ادبی کارناموں میں ادبیات، تاریخ وتفسیر، تحقیق وتنقید اور تدوین متن خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی ادب کے لیے وقف کردی اور ہمیشہ نادرو نایاب کتابوں کی تلاش و تحقیق میں منہمک رہے۔ ان کی اردو کی مطبوعہ کتابوں میں مکاتیب غالب، دیوان غالب (نسخۂ عرشی)، انتخاب غالب، اردو میں پشتو کا حصہ، کہانی رانی کیتکی کی، مجالس رنگین از انشا، نظام نامہ، رویداد افتتاح، نادرات شاہی از عالم شاہ ثانی، سلک گوہر از انشا، محاورات بیگمات از رنگین، مقالات عرشی، وغیرہ ہیں، ساتھ ہی ان کی غیر مطبوعہ کتابوں میں اشاریہ اودھ کیٹلاگ، خطاطی کی تاریخ، دیوان مومن، فہرست مخطوطات اردو کتب خانہ رضائیہ رامپور وغیرہ ہیں نیز مولانا عرشی کو تدوین متن سے خاص شغف تھا اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے کلاسکی تدوین متن کو اپنی تحقیق کا معیار بنایا حالانکہ یہ تحقیق کا سب سے مشکل اور پیچیدہ مرحلہ ہوتا ہے، جس میں ذرا سی کوتاہی سے ساری تحقیق رائگاں ہوسکتی ہے۔ نیز عرشی نے مذکورہ سبھی دریافتوں کو یکجا کیا اور صحیح معلومات کو مقدموں، اختلاف نسخ اور اشاریوں میں مندرج کیا اور جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے حاشیہ نگاری میں اپنی فنی اور فکری اور محققانہ قابلیت کا ثبوت دیا۔ مولانا عرشی کی ان سبھی کاوشوں کا مختصر اتعارف پیش ہے:

انتخاب غالب: اس کتاب کی اشاعت 1943 مطبع قیمہ بمبئی سے ہوئی۔ یہ غالب کے اردو فارسی کلام کا وہ انتخاب ہے جو انھوں نے 1866 میں نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر ان کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس میں سے فارسی کلام کو تو دواوین میں شامل کر دیا گیا باقی اردو کلام کو ناقابل التفات سمجھتے ہوئے کتاب خانے کی ردی گھر میں ڈال دیا گیا تھا۔ مدت دراز تک گوشہ گمنامی میں پڑے رہنے کے بعد مولانا امتیاز علی عرشی نے اس اردو کلام کو رامپور رضا لائبریری سے دریافت کیا جو اس وقت بہت بوسیدہ حالت میں تھا۔ اس کے چند الفاظ ساقط ہو چکے تھے۔ نیز عرشی نے اس کتاب کی تصحیح کے لیے 'مکاتیب غالب' کو اپنا ماخذ بنایا اور غالب کے دوسرے نسخوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد اپنی وسعت معلومات، دقت نظری اور تحقیق کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچے کہ اس نسخے میں بہت سی غلطیاں راہ پا گئیں ہیں اور غالب کی تصحیح کے بعد بھی اغلاط سے پُر ہیں۔ مولانا عرشی نے 16 صفحات پر مشتمل پر مغز اور معلومات سے پر مقدمہ پیش کیا۔ اس کے آغاز میں وہ فارسی اور اردو زبانوں کے عروج اور زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے غالب کی فارسی دانی پر ناز، ان کے ابتدائی اردو انتخاب اور آخری انتخاب کا جامع مختصر انداز میں معلومات فراہم کی ہیں۔ علاوہ ازیں غالب کے اردو انتخاب کے صفحات، تحریر کا انچ، سطروں کی تعداد، کاغذ کی ساخت، متن کی روشنائی کے استعمال پر بڑی باریک بینی سے تفصیلات درج کی ہیں اس کے علاوہ غالب کی فارسی اور اردو شاعری پر روشنی ڈالی ہے کہ غالب کو اپنی فارسی دانی پر کس قدر ناز تھا۔ وہ اردو شاعری کو ننگ خیال کرتے تھے لیکن زمانہ بڑا کارساز ہے یہ کروٹیں بدلتا رہتا ہے۔ اردو نے فارسی کو دھکیلا اور اس کی جگہ پر قبضہ کیا۔ ہر بڑے استاد نے اردو میں طبع آزمائی شروع کی۔ غالب کے یہاں بھی طرز بیدل کا خاتمہ ہوا۔ تو ان کا کلام اور بھی نکھر گیا۔ نیز انھیں اردو سخن گوئی میں وہ ناموری حاصل ہوئی جس کے وہ حق دار تھے۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ غالب کے دیگر دواوین کو سامنے رکھ کر مولانا عرشی نے اس انتخاب کی تصحیح کی۔

انھوں نے کلام غالب کا انتخاب کرتے ہوئے غالب کے سبھی فارسی اور اردو اشعار جن میں ضرورت سے زیادہ تخیل، بے لطف تشبیہوں اور استعاروں اور یہاں تک کہ ان غزلوں کو بھی جو دوسرے اشعار کے مقابلے میں پست تھیں۔اس انتخاب سے خارج کر دیا ہے۔ مولانا عرشی نے اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔صفحہ ا سے 182 تک غالب کا فارسی کلام جس میں غزلیات، رباعیات شامل ہیں۔ دوسرا حصہ صفحہ 177 سے 182 تک انتخاب غالب اردو ہے جس میں غزلیات، قصائد، مثنوی، رباعیات کو تصحیح کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔اس کتاب کے آخر میں شرح غالب، اختلاف نسخ فارسی، اردو فہرستیں اور اشاریے کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنی تدوین متن، ترتیب و تصحیح کے لحاظ سے بلند و اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

اردو میں پشتو کا حصہ:اس کتاب کی اشاعت 1960 شاہین برقی پریس پشاور پاکستان سے ہوئی۔ ضخامت کے اعتبار سے 178 صفحات پر مبنی اس کتاب کی طباعت لیتھو ہے۔ دراصل یہ کتاب لسانیات کے موضوع سے متعلق بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ مقالہ 'اردو پر پشتو کا اثر' مولانا عرشی نے 1946 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جشن سیمیں کے موقع پر پڑھا تھا۔ اس کتاب میں مولانا عرشی نے اپنی تمام تحقیقی وتنقیدی، فکری وفنی خوبیوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔اس میں انھوں نے اردو میں موجود، اُن تمام پشتو الفاظ پر رسائی کی ہے جس کا اردو کی تشکیل میں حصہ عربی اور فارسی سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے نیز عرشی نے اپنی اس رائے کی تائید میں مستند ماخذوں، اور حوالوں کے ساتھ اپنے دو ٹوک نظریات پیش کیے ہیں مثلاً ہندوستان اور افغانستان کا رشتہ زمانہ قدیم سے ایک دوسرے سے مضبوط رہا ہے۔ وہاں کے باشندے مختلف ٹولیوں اور گروہوں میں یہاں آتے رہے ہیں۔ جنھوں نے یہاں سے دوبارہ جانے کا نام نہ لیا اور یہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ ان میں وہ درویش اور صوفیا بھی تھے جنھوں نے اپنے روحانی طرز عمل سے اس مٹی کو سیراب کیا اور تقریباً پورے ہندوستان میں دارالعلوم قائم کیے۔ ان میں مدت دراز تک عربی اور فارسی کی درس وتدریس کی خدمات انجام دی جاتی رہیں۔ یہاں تک کہ ان تمام علوم سے بہرہ ور ہونے کے لیے افغانی طالب علم بھی یہاں آتے رہے ہیں۔ نیز ان افغانی طالب علموں نے فراغت کے بعد یہیں ذریعہ معاش تلاش کیا اور آباد ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر افغانیوں نے اپنی جائے پناہ خطۂ روہیل کھنڈ (مشرقی یوپی) میں تلاش کی اور اپنی خود مختار ریاست بھی قائم کی۔ ان کی بود و باش، رہن سہن، رسم ورواج، بول چال پر براہ راست، اس زبان کا اثر پڑا جو آج بھی اپنی خاص وضع وقطع کی بنا پر جانی اور پہچانی جاتی ہے۔ مولانا عرشی نے اردو زبان میں شامل 152 پشتو الفاظ کی پہچان کی جو ابھی تک روہیل کھنڈ میں بولے اور سمجھے جاتے ہیں۔

یہاں پر مولانا عرشی نے ان نکات کی طرف متوجہ کیا ہے کہ جب ڈیڑھ سو سالہ حکومت (مشرقی یوپی) میں پشتو کے اثرات اتنے زبردست پیمانے پر پڑ سکتے ہیں تو دوسرے صوبوں میں برسہا برس سے رہنے والے افغانیوں کے توسط سے اردو زبان پر پشتو اثرات اور بھی کثیر تعداد میں پڑے ہوں گے۔ اپنی اس رائے کی تائید میں پشتو کے ایک انگریز عالم راورٹی کا بیان درج کرتے ہیں۔

''یہ حقیقت ہے کہ پشتو زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اردو میں بھی نظر آتے ہیں۔ میں خالص پشتو اصطلاحیں سمجھنے کی طرف مائل ہوں جو بالکل اسی طرح ریختہ میں شامل ہو کر گھل مل گئے ہیں۔ جیسے سنسکرت، عربی، فارسی وغیرہ بلکہ پرتگالی اور ملیالم کے لفظ۔''

عرشی اس حقیقت کو بھی واضح کرتے ہیں کہ ہمارے ماہرین لسانیات اور لغت نویس صرف عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت کو ہی اردو زبان کا پیش خیمہ بتاتے ہیں لیکن پشتو کی طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی۔اس کی اصل وجہ پشتو زبان سے ناواقفیت ہے۔ علاوہ ازیں عربی اور فارسی میں موجود 253 پشتو الفاظ کی طرف بھی نشاندہی کرتے ہیں جو آج بھی بگڑی ہوئی شکل میں موجود ہیں ساتھ ہی ساتھ ان پشتو کہاوتوں تذکیر و تانیث، عربی مذکر جمعوں، عربی مصادر، قدیم اردو پر پشتو کے اثر پر استدلالی انداز سے بحث کرتے ہیں۔ بلا شبہ یہ کتاب اپنی لسانیاتی صفات کی بنا پر اردو ادب کی تاریخ، مستند اور اعلیٰ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

روداد افتتاح: یہ کتاب 1941 میں ناظم پرنٹنگ پریس رامپور لطیفی پریس سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب 48 صفحات پر مبنی ہے۔ اس کتاب کی پتھر کی چھپائی کی گئی ہے۔ دراصل یہ ایک روداد ہے۔ رامپور کی گذشتہ علمی و ادبی سرگرمیوں کو برقرار رکھنے کے لیے چند اہل ارباب قلم اور سید شبیر حسین زیدی کی رہنمائی اور اعلیٰ حضرت نواب رضا علی خاں کے توسط سے 'رضا اکادمی' کے نام سے ایک ادارہ تشکیل میں لایا گیا۔ اس ادارے کا مقصد نہ صرف تعلیم کو مخصوص علمی اداروں کے ساتھ منسلک کرنا تھا بلکہ جدید علوم وفنون کے ذریعے نوجوانوں کو ہر قسم کی تعلیم سے بہرہ ور کرنے کے ساتھ، ان کے لیے علمی وتحقیقی راستوں کو ہموار بھی کرنا تھا۔

چنانچہ اس ادارے کو قائم کرنے کے لیے جوبلی پارک کے پُر فضا ماحول میں عمارت تعمیر کروائی گئی۔ اس کے افتتاح کے لیے ایک مجلس منعقد کی گئی۔ اس مجلس میں رامپور شہر کے ذی علم اصحاب کے علاوہ بیرون شہر کے ذی علم اساتذہ تشریف لائے۔ جن میں مولوی عبدالحق، مولانا سید سلیمان ندوی، ڈاکٹر اظہر علی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر مسعود الحسن نے اکادمی کی اہمیت وضرورت کو واضح کرتے ہوئے موثر انداز میں تقریر فرمائی۔

دیوان غالب: (نسخہ عرشی) : اس نسخے کی اشاعت 1958 ہندوستان پرنٹنگ ورکس رامپور سے ہوئی۔ 502 صفحات پر مشتمل یہ دیوان نسخ ٹائپ ہے۔ یہ نسخہ اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے یکتا ہے۔ مولانا عرشی نے اس نسخے میں غالب کے تمام مروجہ اردو کلام کو تاریخی ترتیب کے ساتھ اہل ذوق کے سامنے پیش کیا جسے بہت سراہا گیا۔ دراصل اس نسخے کی بنیاد 1857 کے اُس نسخے پر رکھی گئی ہے جو غالب نے اپنے ہاتھ سے ترتیب دے کر اپنے شاگرد رامپور کے نواب یوسف علی خاں ناظم کی فرمائش پر ارسال کیا تھا۔ یہ نسخہ مولانا عرشی کو رامپور رضا لائبریری میں محفوظ ملا۔ انھوں نے سب سے پہلے غالب کے تمام مطبوعہ وغیر مطبوعہ کلام کو یکجا کیا اور ایک دوسرے کا مقابلہ کرنے کے بعد مختلف مصادر سے استخراج کیا۔ نیز اس نسخے کو تدوین متن، ترتیب و تصحیح کے ساتھ مرتب کیا اور غالب سے متعلق تمام معلومات کو جو وہ اپنے کلام میں وقتاً فوقتاً کرتے رہے تھے۔ مولانا عرشی نے ان سبھی معلومات کو حواشی اور دیباچوں میں شامل کیا۔ دراصل نسخہ عرشی ایک حوالے کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز مولانا عرشی کی اس بہترین کارکردگی اور جی توڑ محنت کو دیکھتے ہوئے 1961 میں انھیں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

مولانا عرشی نے اس نسخے میں بڑی تفصیل کے ساتھ غالب کی تمام اصلاحوں سے روشناس کروایا ہے کہ کس طرح غالب نے تراش وخراش سے اپنی تخلیق کو زیادہ سے زیادہ پر اثر انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ نیز عرشی نے غالب کے اُن تمام نظریات کو جو انھوں نے شعر وسخن کے متعلق دیے تھے ایک ایک کر کے نمایاں کیا۔ نیز نسخہ عرشی کو اولیت اس لیے بھی حاصل ہے کیونکہ اس میں غالب کا سارا اردو کلام مدون ہو گیا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بھی جو نسخہ حمیدیہ میں شامل تھا۔ اس طرح غالب کا وہ تمام کلام بھی جو مختلف بیاضوں، رسائل واخبارات کے فائلوں اور غیر معروف ماخذوں میں جمع تھا اُسے چن کر، اس نسخے

میں شامل کردیا گیا ہے۔

ترجمہ۔ مجالس رنگین : یہ کتاب مشہور ریختی گوشاعر سعادت یار خاں رنگیں دہلوی 1251ھ/ 1835 کی فارسی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ 1942 رامپور کے اخبار 'ناظم' میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ 62 مجالس پر مشتمل اس کتاب کو مولانا عرشی نے مقدمہ اور حواشی کے ساتھ ترتیب دیا اور ان تمام تفصیلات کو بھی درج کیا ہے جو اس کتاب کے وجود میں آنے کا سبب بنیں مثلاً۔اس کتاب کا نام ترجمہ مجالس رنگین اس لیے پڑا کیوں کہ رنگین ایک ذہین انسان تھے۔ ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا۔ شعر و شاعری میں اچھی خاصی دسترس رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ اساتذہ کے کلام کی کمیوں پر گرفت کر لیتے۔ایک بار رنگین اپنے چند احباب کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ان میں میر انشاء اللہ خاں انشا بھی تھے کہ تبھی رنگین نے اپنی پرانی صحبتیں مزہ لے کر سنانا شروع کردیں۔سب ان سے بہت متاثر ہوئے۔لہٰذا ان کے احباب مرزا نعیم اللہ بیگ اور میر انشاء اللہ خاں انشا کی فرمائش پر رنگین نے ان تمام صحبتوں کو نظم و نثر میں تحریر کیا اور اس کتاب کا نام 'مجالس رنگین' رکھا۔

نادرات شاہی:از شاہ عالم ثانی : یہ فارسی، اردو، ہندی زبانوں پر مشتمل ایک دیوان ہے۔اس دیوان کی اشاعت 1944 میں ہندوستان پرنٹنگ ورکس رامپور سے ہوئی۔ یہ دیوان 328 صفحات پر مبنی نسخ ٹائپ ہے جو دو رسم الخط میں تحریر کیا گیا ہے۔اس کتاب میں دیوناگری رسم الخط اوپری سطر پر اور نستعلیق نیچے کی سطر پر درج ہے۔ نیز اس کتاب میں ہندی اور اردو کا حسین ترین امتزاج پایا جاتا ہے۔اس دیوان کو نواب کلب علی خاں نے 1866 میں مرزا داغ کے توسط سے رامپور رضا لائبریری کے لیے خریدا تھا۔دراصل اس دیوان کے مصنف نادر شاہ عالم ہیں۔ان کی ولادت (1140ھ۔ 1728) میں ہوئی۔ بچپن سے ہی نہایت ذہین، فیاض اور سخی انسان تھے۔ان کی تعلیم و تربیت مشرقی نہج پر ہوئی تھی۔ وہ عربی، فارسی، اردو، ہندی، سنسکرت زبانوں سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔فن انشاء پردازی پر انھیں قدرت حاصل تھی۔ نیز وہ خط نستعلیق اور نسخ کے ماہر اور موسیقی کے بھی حد درجہ شوقین تھے۔شاہ عالم کا پورا بچپن قید و نظر بند میں گذرا۔ جب 28 برس کو پہنچے تو عماد الملک کے توسط سے عالمگیر ثانی کے لقب سے تخت نشیں ہوئے۔ چوں کہ ان کے مزاج میں بانکپن زیادہ تھا، جسے دیکھ کر بادشاہ نے عماد الملک کے ڈر سے انھیں شہر بدر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ دوران شہر بدر شاہ عالم نے مختلف تاریخی معرکے انجام دیے، جس میں کامیابی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔لہٰذا یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا اور اردو زبان ترقی کے مدارج طے کررہی تھی۔اس زبان میں بڑے بڑے اساتذہ پیدا ہورہے تھے۔شاہ عالم نے اپنی دل بستگی کا سامان سخن گوئی میں تلاش کیا۔اب رات دن شعر و شاعری کی نشستیں ہونے لگیں۔شاہ عالم اپنے اشعار اہل سخن کو سناتے اور ان پر رائے بھی لیتے۔انھوں نے اپنی اس اتار چڑھاؤ کی زندگی میں کئی کتابیں تصنیف کیں۔ان کتابوں میں فارسی دیوان، دیوان اردو، منظوم اقدس، قصہ شاہ شجاع الشمس اور نادرات شاہی خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

مولانا عرشی نے 62 صفحات کے ایک طویل مقدمے کا آغاز، شاہ عالم کے حالات زندگی، حسب و نسب، تعلیم و تربیت، عادات و اخلاق، ولی عہدی، تاریخی معرکہ آرائیاں، سخن گوئی، اردو کی ترقی، نسخے کی کیفیت اور شاہ عالم کی تصنیفات کو مختلف مصادر کی روشنی میں استخراج کیا۔ نیز عرشی نے دلیلوں اور حوالوں کے ساتھ تمام تفصیلات کو جامع و موثر انداز سے حواشی میں مندرج کیا۔ بہر حال یہ دیوان اپنی تدوین و تصحیح اور تاریخی لحاظ سے مستند و اعلیٰ مقام رکھتا ہے۔

سلک گوہر : از انشا: اس کتاب کی اشاعت 1948 اسٹیٹ پریس رامپور سے ہوئی۔ ضخامت کے اعتبار سے 40 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی طباعت نسخ ٹائپ ہے جو اردو کے مشہور و معروف مصنف، ریختہ گو شاعر میر انشاء اللہ خاں انشاء (1233-1818) کی تالیف ہے۔ وہ نہایت ذہین انسان اور بے پناہ خوبیوں کے مالک تھے اور بہت سی زبانوں پر قدرت رکھتے تھے ان میں عربی، فارسی، اردو اور ہندی خاص تھیں۔ نیز وہ خوش خصال، خوش اطوار، خوش بیان تھے۔نت نئے مضامین کو پیدا کرنے کی صلاحیت جوان میں تھی وہ کسی اور کو نصیب نہیں تھی۔ نثر ہو یا نظم وہ اپنی مثال آپ تھے۔ 'دریائے لطافت'، 'کہانی رانی کیتکی کی' ان کی بہترین کارکردگی کا بین ثبوت ہیں۔

مولانا عرشی نے سلک گوہر کو رامپور رضا لائبریری سے دریافت کیا۔ اس کتاب کی طرز تحریر صنعت مہملہ (غیر منقوطہ) ہے۔ 8 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مقدمہ میں مولانا عرشی نے انشا کی دوسری بے نقط تصنیفات کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک بے نقط قصیدہ، بے نقط دیوان اور فارسی مثنوی 'طور الاسرار' کے نام سے (1214-1799) میں تالیف ہوئی۔ انھوں نے جہاں اس کتاب کے لطفی سبب کا تعارف کروایا ہے وہیں بے لطفی کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ نیز اس موقع سے متعلق دیگر مخطوطات کا جائزہ لیتے ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انشا نے ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی کے بے نقط الفاظ سے زیادہ سے زیادہ مدد لی ہے اور مطالب و معانی سے جدت پیدا کی ہے اور املا میں توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ یہ کتاب غیر منقوطہ وصف کی وجہ سے آج بھی ادب میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ نیز مولانا عرشی نے فہرست مضامین کے ساتھ حواشی کو مندرج کیا ہے اور ترتیب و تصحیح کے ساتھ ایڈٹ کیا ہے۔

محاورات بیگمات: از رنگین: یہ کتاب مشمولہ اردو ادب، علی گڑھ، اشاعت جولائی / دسمبر 1952 میں نامی پریس لکھنؤ سے ہوئی۔ 32 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں سعادت یار خاں رنگین کے دیوان ریختی کے آخر میں عورتوں کے مخصوص محاوروں اور الفاظ کی فہرست شامل ہے۔ دراصل دیوان ریختہ کے نادر الفاظ کو خان آرزو نے کتابی شکل میں مرتب کیا۔اس کا ایک نسخہ رامپور رضا لائبریری میں موجود تھا۔ مولانا عرشی نے اس نسخہ کو دستیاب کیا، جس میں دس پانچ الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ رنگین کی فہرست کے سارے الفاظ موجود تھے۔ لہٰذا انھوں نے نادر الفاظ اور دیوان ریختی دونوں کی تشریحات کو سامنے رکھ کر مزید تحقیقی حواشی اور اختلاف نسخ کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا۔

کہانی رانی کیتکی کی از انشا: اس کتاب کی اشاعت 1955 میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے ہوئی۔ یہ کتاب نسخ ٹائپ ہے اور صفحات کی تعداد 65 ہے۔ یہ میر انشاء اللہ خاں انشاء کی تصنیف ہے جن کا شمار ریختی گو شاعر کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ وہ نہایت ہی ذہین، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں اپنا خاص مقام رکھتے تھے۔ وہ فارسی زبان کے ماہر اور ہندی کے سبک شیریں الفاظ کا استعمال بخوبی جانتے تھے۔ فارسی کے دیوان کے علاوہ دریائے لطافت، لطائف السعادت، سلک گوہر اور کہانی رانی کیتکی کا شمار ان کی اہم تصانیف میں ہوتا ہے۔ مولانا عرشی کو اس کتاب کا ایک نسخہ رامپور رضا لائبریری میں دستیاب ہوا جس کو انھوں نے دوسرے خطی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا۔

مکاتیب غالب: یہ غالب کے اردو اور فارسی خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی اولین اشاعت 1937 مطبع قیمہ بمبئی سے ہوئی۔ اس کے سات ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جن کے حواشی اور مقدمے میں ترمیم و اضافے کیے گئے ہیں۔ دراصل غالب کے یہ خطوط نجی کوائف پر مبنی

ہیں۔ یہ تمام خطوط غالب کے شاگرد رامپور کے نواب یوسف علی خاں اور ان کے صاحب زادے نواب کلب علی خاں اور ان کے متعلقین کے نام سے منسوب ہیں۔ غالب کے مراسلات کا سلسلہ 1857 سے 1869 کے عرصے تک رامپور کے دربار سے وابستہ رہا۔ غالب کو دربار رامپور سے جولائی 1959 سے سو روپے ماہوار وظیفہ ملنا شروع ہوا جو انھیں ان کی زندگی کے آخری دنوں تک ملتا رہا۔ نیز ان خطوط کا ایک بڑا ذخیرہ رامپور رضا لائبریری میں محفوظ تھا۔ 1936 میں ریاست رامپور کے چیف منسٹر کرنل بشیر حسین زیدی کی اس پر نظر پڑی تو انھوں نے ان خطوط کو مرتب کروانے کا قصد کیا اور اس کام کے لیے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا انتخاب کیا اور یہ ذمے داری ان کے سپرد کی گئی۔ مولانا عرشی نے ان تمام خطوط کو رضا لائبریری سے دستیاب کیا اور غالب کے دوسرے مستند ماخذوں سے مقابلہ کرتے ہوئے، تصحیح متن کے ساتھ ان خطوط کی تمام غیر ضروری باتوں کو حذف کرنے کے بعد اس کو مرتب کیا۔ مولانا عرشی نے مکاتیب غالب میں 183 صفحات پر مشتمل مقدمہ تحریر کیا۔ یہ مقدمہ اتنا پرمغز ہے کہ اس پر ایک کتاب تیار کی جاسکتی ہے۔ اس مقدمے میں دس اہم عناوین قائم کیے گئے اور ہر ایک عنوان میں غالب سے متعلق اہم تفصیلات درج کی گئی ہیں۔ مقدمے کا پہلے عنوان 'سرگذشت غالب' ہے جس میں غالب کی حیات و خدمات، سوانحی کوائف، پیدائش، وفات اور مرض کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا عنوان 'تصانیف' ہے۔ اس میں غالب کی فارسی اردو کتابیں مہر نیمروز، دستنبو، نامۂ غالب، دیوان اردو، کلیات فارسی، انتخاب دیوان اردو، انتخاب دیوان فارسی کے علاوہ 15 نادر و نایاب کتابوں کی عمیق تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ تیسرا عنوان 'تلامذہ' ہے۔ اس میں غالب کے ان تمام شاگردوں کا تذکرہ ملتا ہے جن کے نام یہ خطوط منسوب ہیں۔ مولانا عرشی 'انشائے فن' کے تحت انشا پردازی پر نظر ڈالتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ غالب کو فارسی زبان و بیان کے ساتھ اردو پر بھی قدرت حاصل تھی۔ وہ انشا پردازی میں یکتا مقام رکھتے ہیں۔ ان کے خطوط میں نظم کا سا مزہ ملتا ہے۔ غالب اپنے خاص طرز تحریر کے ذریعے مکتوب الیہ کا دل جیت لیتے ہیں۔ ان کے یہاں القاب و آداب کے ساتھ شکر و شکایت کے تمام اظہار کے مطالب بڑے ہی خوبصورت انداز میں ملتے ہیں۔ غالب اپنے خطوط میں تاریخ ایک انداز سے نہیں تحریر کرتے بلکہ خط کی ابتدا اور اختتام پر یا درمیان میں جہاں مرضی ہوتی تحریر کر دیا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مولانا عرشی نے دیگر عناوین کے تحت مثلاً لوازمات امارت، انگریزی تعلقات بہادر شاہ ظفر سے تعلقات، تعلقات رامپور، متعلقات انشا، طباعت خطوط وغیرہ پر تنقید کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔

نظام نامہ: یہ ایک کتابچہ ہے۔ اس کی اشاعت 1940 میں لطیفی پریس دہلی سے ہوئی۔ 14 صفحات پر مبنی یہ کتابچہ نسخ ٹائپ ہے۔ دراصل رامپور کا شمار علمی و ادبی حیثیت سے ملک میں ہی نہیں بلکہ بیرون ملک میں بھی کیا جاتا تھا۔ اس لیے یہاں ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی جس میں قدیم طرز کی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ ان ہی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس ادارے کے لیے اغراض و مقاصد، مبنی فیسٹو تیار کیا گیا۔ ادارے کا نام 'رضویہ اکادمی' یا 'ادارۂ رضویہ' طے پایا گیا جس میں خالص علمی جماعت، بلند پایہ مصنفین، اہل قلم کو یکجا کیے جانے کا منصوبہ بنایا گیا اور ادارے کے ماتحت ایک ایسا شعبہ بھی قائم کرنے کا ارادہ کیا گیا جس میں تصنیفی و تالیفی اور اشاعتی پروگرام کیے جاسکیں۔ علاوہ ازیں کتابخانہ اور اس میں موجود تمام کتب کی ترتیب و تنظیم و حفاظت کے لیے نگہداشت کا تعین بھی کیا گیا ساتھ میں یہ بھی طے کیا گیا کہ تمام ادبا و شعرا کی تصنیفات صرف ادارے کی ملکیت رہیں گی۔ بغیر اجازت یہ تحریریں ادارے سے باہر نہیں جاسکتیں۔ چنانچہ رضا لائبریری میں موجود اس مینی فیسٹو کو مولانا عرشی نے بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ ترتیب دے کر شائع کروایا۔

مقالات عرشی: یہ کتاب 1971 ریڈنگ پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ 371 صفحات پر مشتمل یہ کتاب نسخ ٹائپ ہے۔ اس کتاب کو مولانا امتیاز علی عرشی نے مرتب کیا۔ انھوں نے اس کتاب کے لیے 14 مضامین و مقالات کا انتخاب کیا جو اپنی اہمیت و افادیت کے لحاظ سے ادب میں یکتا مقام رکھتے ہیں۔ ان مضامین میں امام سفیان ثوری کے سوانح حیات اور ان کی تصانیف، صحیح مسلم کا ایک قدیم نسخہ ہندوستان میں نہج البلاغہ کا استناد، امام ابن حزم ظاہری اور ان کی کتاب 'الانساب'، رباعیات عمر خیام کا ایک نادر نسخہ، تاریخ محمدی اور اس کے مولف کے احوال و آثار، مولانا آصفی اور ان کی شاعری وغیرہ شامل ہیں۔ یہ تمام مضامین مولانا عرشی کی تحقیق و تنقید، ترتیب و تصحیح کے متعلق گراں مایہ سرمایہ ہیں۔

مندرجہ بالا یہ وہ کتابیں ہیں جو شائع ہو کر عرشی صاحب کی حیات میں ہی منظر عام پر آچکی تھیں۔ ان سبھی تحریروں کی کافی پذیرائی بھی ہوئی جس سے مولانا عرشی نے ادب کی دنیا میں بہت مقبولیت حاصل کی۔ نیز مولانا عرشی کی چند ایسی بھی غیر مطبوعہ تحریریں ہیں جو ان کی وفات کے سبب منظر عام پر نہیں آسکیں۔ ان غیر مطبوعہ کتابوں کا مختصر اتعارف مندرجہ ذیل ہے:

اشاریہ اودھ کیٹلاگ : یہ کیٹلاگ ڈاکٹر الواس اشپرنگر کی مرتب کردہ کتابوں اور اشخاص کی فہرست ہے۔ اس فہرست میں اسما کتب تک کام کیا گیا ہے یہ مولانا عرشی کی مستقل علالت کے باعث مکمل نہیں ہو سکی۔

انتخاب ناظم: یہ انتخاب رامپور کے نواب یوسف علی خاں ناظم کی اردو شعر و شاعری پر مبنی ہے۔ اس دیوان کی نوعیت 1865 کے کلام پر رکھی گئی ہے۔ مولانا عرشی نے اس کے مبسوط مقدمے میں نواب یوسف علی خاں کے حالات زندگی، نام و نسب اور فن شاعری پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

خطاطی کی تاریخ: مولانا عرشی کی یہ کاوش بھی ادھوری رہ گئی۔

دیوان مومن: اردو کے مشہور و معروف شاعر حکیم مومن خاں مومن (1800-1850) کا اردو کلام ہے۔ دراصل مولانا عرشی کو یہ کلام رامپور رضا لائبریری سے دستیاب ہوا جس کے کچھ الفاظ ساقط ہو گئے تھے۔ اب یہ طے کرنا مشکل تھا کہ یہ دیوان کن صاحب کا مرتب کردہ ہے۔ کیونکہ مومن کی تخلیق کی کل کائنات صرف دو دیوان تک محدود ہے۔ پہلا ایڈیشن شیفتہ کا اور دوسرا ایڈیشن عزیز الدین عبدالرحمن آسی کا تھا۔ مولانا عرشی نے ان دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا اور تحقیق کے ذریعے پتا لگایا کہ شیفتہ ہی اس دیوان کے مالک ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں لہٰذا اس دیوان کی ترتیب و تدوین اس نہج پر کی گئی کہ یہ دیوان شیفتہ کا تصنیف کردہ ہے۔

مختصراً اس امر سے سبھی واقف ہیں کہ تحقیق و تنقید ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ نہایت دقت اور صبر طلب فن ہے جس میں ذرا سی کوتاہی محقق کی ساری محنت کو رائگاں کر سکتی ہے۔ مولانا عرشی تحقیق کے ان چار ستون میں سے ایک ہیں جنھوں نے اس فن کو نہ صرف عروج بخشا بلکہ اس میں وسعت پیدا کی اور اپنی رائے کی تائید میں مستند ماخذوں، دلیلوں اور حوالوں کے ساتھ اپنے دونوک نظریات سے متعارف کیا۔ نیز مولانا عرشی کا تحریر کردہ ہر لفظ قابل ستائش ہے جس کی اپنی ہی نظیر ہے۔

■

Dr. Nausheen Hassan
Dept of Urdu,
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

اردو رسم الخط

ریاض احمد

اردو ایک جدید ہند آریائی زبان ہے۔ اس کو ہندوستانی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ یہ اسی ملک میں پیدا ہوئی اور یہیں پھلی پھولی ہے۔ لفظ 'اردو' ترکی زبان کا الفظ ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔ اس کا ڈھانچہ تیار کرنے میں کھڑی بولی نے سب سے اہم رول ادا کیا ہے۔ اُردو کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے عربی فارسی حروف کا استعمال کیا جاتا ہے۔ اُردو کا رسمِ خط عربی اور فارسی ہے بلکہ عربی فارسی کی توسیع شدہ شکل ہے۔ اردو جنوبی ایشیا کی وہ زبان ہے جسے لکھنے پڑھنے کے لیے عربی نظام ہجا استعمال میں لایا جاتا ہے۔ جو خط نسخ اور تعلیق سے وجود پذیر ہوا ہے۔ خط تعلیق کا جہاں تک سوال ہے اس کو حسن بن حسین علی فارسی نے فروغ دیا۔ اس نے خط رقاع اور خط توقیع سے ایک نیا خط بنایا۔ یہ سرکاری مراسلت کے لیے استعمال ہونے لگا۔ خط تعلیق اور خط نسخ کے ملاپ سے ایک تیسرا رنگ ابھر آیا جسے نستعلیق کہا گیا۔ اس نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ خواجہ ابوالعالی بیگ نے خط تعلیق میں انقلابی اصلاحات کی۔ انھوں نے فارسی کی مخصوص آواز (پ، چ، گ) کے لیے حروف ایجاد کیے اور اس مقصد کے لیے تین تین نقطے وضع کیے۔ ابتدا میں گ پر بھی دو لکیروں کے بجائے تین نقطے لگائے جاتے تھے۔ لیکن لسانی اور جمالیاتی ذوق سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث اسے ترک کر دیا گیا اور اس کی جگہ دو لکیروں کا استعمال شروع ہوا۔ حافظ یوسف سدیدی نے یاقوت (پورا نام یاقوت بن عبداللہ الرومی المعتصمی) کو خط تعلیق کا موجد قرار دیا، محمد سجاد مرزا نے خط تعلیق کا اجرا چوتھی صدی ہجری (1000) اور پروفیسر شیخ عنایت اللہ نے ایم ایس ڈیمنڈ کے حوالے سے تیرہویں صدی عیسوی قرار دیا ہے۔ محتاط تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اجرا پانچویں صدی ہجری (1107) میں ہوا۔

خط نستعلیق نے امیر تیمور کے دور میں ترقی کی۔ مشہور خطاط سید میر علی تبریزی نے خط نسخ اور تعلیق کی آمیزش سے خط نستعلیق ایجاد کیا۔ اس خط کے اساتذہ میں میر فریدالدین، جعفر تبریزی، سلطان علی مشہدی، میر علی ہروی، میر عماد الحسنی، حافظ نورانہ، صوفی خورشید عالم اقبال، ابن پروین اور میر پنجہ کش رقم مشہور ہیں۔ شیخ ممتاز حسین جونپوری، ڈاکٹر شیرین بیانی کے نزدیک نستعلیق کے رواج پانے کا زمانہ ساتویں صدی ہجری ہے۔ محمد سجاد مرزا کے نزدیک اس کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری کا ابتدائی دور ہے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی اور محمد اسحق صدیقی نے آٹھویں صدی، قیصرانی نے تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی اور پروفیسر شیخ عنایت اللہ نے پندرھویں صدی عیسوی کو ابتدائی دور قرار دیا ہے۔ خط نستعلیق میں حروف کے دائرے گول ہوتے ہیں۔ جس سے تحریر میں حسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ بارھویں صدی کے اوائل میں مرتضیٰ خان شاملو نے خط نستعلیق سے ایک اور خط اخذ کیا جسے خط شکستہ کا نام دیا گیا۔

اردو میں فارسی، عربی، ہندی، ترکی اور دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ فارسی حروف میں ٹ، ڈ، اور ڑ کے اضافے سے یہ تعداد 36 بن گئی ہے۔ ہمزہ کو شامل کرنے سے 37 ہو جاتی ہے۔ انشاء اللہ خان نے اُردو حروفِ تہجی کی تعداد 85 بتائی ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی

کے نزدیک حروفِ تہجی کی تعداد 47 ہے۔ مولوی عبدالحق نے قواعد اُردو میں حروف کی تعداد 36 کے بجائے 50 بتائی ہے کیونکہ انھوں نے ہکاری آوازوں کو بھی حروف گردانا ہے۔ ان میں ث، ح، ص، ط، ظ، ع، ق عربی زبان کے حروف ہیں۔ خ، ذ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اردو میں نسخ اور نستعلیق میں مقامی مزاج داخل ہونے کی وجہ سے ان کا اسلوب فارسی سے مختلف ہوگیا۔ درحقیقت یہی وہ اسلوب ہے جسے ہم اردو رسم الخط کہتے ہیں۔ اردو کے املا کے مسائل میں اہم مسئلہ یہ گردانا جاتا ہے کہ دس مصوتوں کے لیے صرف تین علامتیں یعنی الف'، 'واو' اور 'ی' ہے۔ جو کہ اس طرح سے ہیں: اَ، اِ، اُ، آ، اے، اِی، ا، و، او، اَے، اَو۔ مصلحین زبان اس بارے میں کہتے ہیں کہ زیر، زبر، پیش چونکہ عملاً استعمال نہیں کیے جاتے ہیں، اس لیے زبان سیکھنے والے نئے قارئین کے لیے وقت کھڑی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حروف کے اوپر نیچے لگنے والی علامتوں کو ختم کر کے ہر مصوتے کو ایک الگ حرف کی شکل دے دی جائے جیسا کہ انگریزی یا رومن حروف میں لکھی جانے والی دیگر زبانوں میں ہوتا ہے۔ اس پر اب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اردو کے حروف کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ کبھی پورا یا آدھا حرف لکھا جاتا ہے تو کبھی اس کا چہرہ۔ اس طرح الفاظ کی لکھائی سیکھنا، سکھانا مشکل ہے۔ اس مسئلے پر اگر غور کیا جائے تو یہ بذاتِ خود ایک علمی غلطی ہے جو کہ زبان کا نہیں بلکہ قاری کا معاملہ ہے۔ اردو کا دائیں سے بائیں لکھنا بھی کچھ لوگوں کو ہضم نہیں ہوتا ہے یعنی کہ وہ دیوناگری رسم الخط کی وکالت کرتے رہتے ہیں جو کہ اردو کی شبیہ بگاڑنے کے لیے ایک سازش سے کم نہیں۔ بعض حلقوں کی جانب سے مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ 'مہینہ' یا 'تھانہ' جیسے الفاظ کے آخر میں 'ہ' نہیں بلکہ 'الف' آنا چاہیے کیونکہ یہ ہندی میں الف سے لکھے جاتے ہیں۔ یہ اعتراض نیا نہیں ہے بلکہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ مغل شہنشاہ جہانگیر نے بھی اس پر اعتراض جتایا تھا لیکن کسی نے کان نہ دھرا اور وہ الفاظ صدیوں سے ویسے ہی لکھے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے یہ بات اہمیت کی حامل ہے کہ ہر زندہ زبان روایت، چلن اور رواج پر چلا کرتی ہے، نہ کہ چند افراد کے ایک کمرے میں بیٹھ کر احکامات صادر کرنے سے۔

جب مسلمانوں کی آمد ہندوستان میں ہوئی تو وہ اپنے ساتھ فارسی لائے۔ ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی ہوگئی۔ ہندی کی مخصوص آوازیں مثلاً (ٹ، ڈ، ڑ، بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، کھ، گھ وغیرہ) کو ادا کرنے کے لیے حروف موجود نہیں تھے۔ اردو چونکہ ان تینوں زبانوں کے مرکب سے پیدا ہوئی لہٰذا ضروری تھا کہ ان تینوں زبانوں کی آوازیں ادا کرنے کے لیے علامتیں موجود ہوں۔ فارسی حروف میں شکلوں کی قبیلہ وار تقسیم سے فائدہ اٹھا کر دو نئے نشانات وضع کیے گئے جن کے ذریعے ہندی مخصوص آوازوں کے ادا کرنے کے لیے نئے حرف بنانا ممکن ہو گیا۔ 1857 تک کی تحریروں میں (ٹ) اور (ڈ) اس طرح لکھتے تھے کہ ان کے اوپر چار نقطے ڈال دیتے تھے۔ بعد میں (ط) کی علامت کو بطور نقطہ استعمال کرنے لگے۔ ھ کی علامت سے بھ، پھ، تھ، ٹھ، جھ، چھ، دھ، ڈھ، ڑھ، کھ، گھ، لھ بنا لیے گئے۔ فارسی، اردو، پنجابی، بلوچی، سرائیکی اور براہوی نے نستعلیق اپنایا۔ کمپیوٹر کی ایجاد نے اس کو چار چاند لگائے۔ جب کہ نستعلیق میں پنجابی، بلوچی، سرائیکی، بروہی اور اردو لکھی جاتی ہے۔

ہائیہ آوازوں والی تحریری شکلوں مثلاً پھ، بھ، تھ، دھ، کھ، گھ وغیرہ کو مفرد حروف کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ یہ حروف کی تعریف پر پوری نہیں اترتیں۔ لسانیات کی رو سے "حرف" سب سے چھوٹی تحریری اکائی ہوتی ہے جس کے مزید ٹکڑے نہیں کیے جا سکتے۔ اب اس تحریری اکائی کو لسانیاتی اصطلاح میں 'ترسیمہ' کہتے ہیں۔ مثلاً ب ت پ ج گ وغیرہ۔ مخلوط حروف مثلاً پھ، بھ، تھ، چھ، دھ، کھ وغیرہ کو حروف یا سب سے چھوٹی تحریری اکائی ترسیمہ کا درجہ اس لیے نہیں دیا جا سکتا کہ ان کی تشکیل دو تحریری عناصر پ + ھ = پھ یا۔ د+ھ=دھ کی ترکیب سے عمل میں آتی ہے، اس لیے انھیں حروفِ تہجی میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمزہ بھی اُردو میں حروفِ تہجی نہیں ہے بلکہ محض ایک تحریری علامت ہے جس کا استعمال مصوتی تسلسل کے لیے کیا جاتا ہے باستثنائے ہمزہ اُردو حروف تہجی کی کل تعداد 36 ہے بعض لوگوں نے ہمزہ کو بھی حرف جانا ہے۔ ان کے نزدیک 37 حروف تہجی ہیں۔ عربی حروف تہجی کی کل تعداد 28 ہے۔ اُردو کے حروف تہجی میں 28 عربی کے، چار فارسی کے اور چار نئے حروف جو خود اُردو میں وضع کیے گئے ہیں یعنی کل 36 حروف وضع کیے گئے ہیں۔ اُردو میں جو چار حروف وضع کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں: ٹ، ڈ، ڑ، ے۔ اُردو رسم الخط نے اعراب وعلامات جیسے زیر، زبر، پیش، مد، اُلٹا پیش، ہمزہ، تشدید اور جزم وغیرہ عربی و فارسی سے مستعار لیے ہیں۔ اور تحریری نظام میں تنوین جیسے مثلاً، فوراً اور الف مقصورہ جیسے عیسیٰ الف وصل جیسے دارالحکومت، کسرۂ اضافت مثلاً محفلِ اور واوِ معدولہ جیسے خوش وغیرہ عربی فارسی رسم الخط سے مستعار لے گئے ہیں۔ اُردو کا طرزِ تحریر اور اندازِ کتابت نستعلیق کہلاتا ہے۔ اس خطِ نستعلیق کا ارتقا ایران میں ہوا تھا۔ خواجہ میر علی تبریزی نے ایران میں عربی کے دو رسوم خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا رسم خط ایجاد کیا جو نستعلیق کہلایا۔ اُردو کے لیے آج یہی رسم خط مشہور ہے اور آج یہ اُردو کا اپنا رسم خط بن گیا ہے۔ اُردو کا صوتی نظام مختلف زبانوں سے آئی ہوئی آوازوں کا مجموعہ ہے۔ اُردو ایک ہند آریائی زبان ہے اسی وجہ سے اس میں صرف ہندی نژاد آوازوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مثلاً ٹ، ڈ، ڑ، بھ، تھ، دھ وغیرہ۔ اُردو میں خالص ہند آریائی یا ہندی الاصل آوازیں خالص عربی آوازیں خالص فارسی آوازیں اور دو یا تین زبانوں کی مشترک آوازیں موجود ہیں۔ اُردو میں ہندی نژاد آوازوں کے علاوہ عربی و فارسی کی چھ آوازیں بھی ہیں جو یہ ہیں ف، ز، ژ، خ، غ، ق۔ اُردو رسم الخط میں ذ، ض، ظ کے لیے ز اور ث، ص کے لیے س اور ح کے لیے ہ اور ط کے لیے ت کی آوازیں مقرر کی گئی ہیں۔

مسعود حسین خان ز، ض، ظ، ث، ص، ح اور ط کو زائد حروف کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ صوتی نقطۂ نظر سے یہ سب مردہ لاشیں ہیں جن کو اُردو رسم الخط نے اُٹھا رکھا

اُردو کا طرزِ تحریر اور انداز کتابت نستعلیق کہلاتا ہے۔ اس خط نستعلیق کا ارتقا ایران میں ہوا تھا۔ خواجہ میر علی تبریزی نے ایران میں عربی کے دو رسومِ خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا رسمِ خط ایجاد کیا جو نستعلیق کہلایا۔ اُردو کے لیے آج یہی رسم خط مشہور ہے اور آج یہ اُردو کا اپنا رسمِ خط بن گیا ہے۔ اُردو کا صوتی نظام مختلف زبانوں سے آئی ہوئی آوازوں کا مجموعہ ہے۔ اُردو ایک ہند آریائی زبان ہے اسی وجہ سے اس میں صرف ہندی نژاد آوازوں کی تعداد زیادہ ہے۔ مثلاً ٹ، ڈ، ڑ، بھ، تھ، دھ وغیرہ۔ اُردو میں خالص ہند آریائی یا ہندی الاصل آوازیں خالص عربی آوازیں خالص فارسی آوازیں اور دو یا تین زبانوں کی مشترک آوازیں موجود ہیں۔

ہے۔ ان کو اُٹھانے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلق عربی و فارسی سے ثابت رہے۔ اُردو میں عربی الفاظ براہِ راست عربی زبان سے داخل نہیں ہوئے بلکہ فارسی کے ذریعے اُردو میں آئے ہیں۔ اُردو نے ان کو اپنے صوتی آہنگ کے مطابق استعمال کیا ہے۔ اردو میں استعمال ہونے والی تمام ضمیریں سنسکرت اور پراکرت سے لی گئی ہیں۔ اُردو کے تمام افعال بھی ہندی الاصل ہیں ضمائر کی طرح۔ اُردو کے بنیادی حروف کی تعداد ایک جگہ 18 قرار دی گئی ہے۔ اُردو رسم خط میں ایک حرف جب دوسرے حرف کے ساتھ جوڑ کر لکھا جاتا ہے، تو اس کی شکل قدرے تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس حرف کی اس تبدیل شدہ شکل کو ترکیبی شکل کہتے ہیں۔ لسانیاتی اصطلاح میں حروف کی تبدیل ہوئی شکل کو 'ذیلی ترسیمہ' کہا جاتا ہے۔ اُردو کے تقریباً سارے حروف ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر لکھے جاتے ہیں اور اپنی ترکیبی شکلیں یعنی بدلی ہوئی شکلیں وضع کر سکتے ہیں۔ لیکن صرف 9 حروف ایسے ہیں جو اپنے بعد کسی دوسرے کے ساتھ ملا کر لکھے نہیں جاتے۔ وہ 9 حروف یہ ہیں ا د ڈ ذ ر ڑ ز ژ و۔ اُردو رسم الخط میں اعراب و علامات کی حیثیت ثانوی ہے۔ اعراب و علامات ایک قسم کے مختصر تحریری نشانات ہوتے ہیں۔ اُردو رسم الخط میں اعراب و علامات مصوتی، مصمتی، غنائی اور قواعدی کردار ادا کرتے ہیں اور اعراب و علامات کی گروہ بندی 1 مصوتی 2 مصمتی 3 غنائی اور 4 اضافی علامات کے طور پر کی گئی ہے۔ اُردو رسم الخط میں بنیادی حیثیت حروف اور ان کی ترکیبی شکلوں یا ذیلی حروف کو حاصل ہے۔

الف: مصوتی علامات: مصوتی علامات مصوتی خصوصیات کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کا استعمال مصوتوں اور مصمتوں کی نمائندگی کرنے والے حروف کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مصوتی علامات کی تعداد 9 ہے 1 زیر 2 زبر 3 پیش 4 مد 5 کھڑا زیر 6 اُلٹا پیش 7 کھڑا زبر 8 اُلٹا جزم اور 9 ہمزہ۔

ب: مصمتی علامات: مصمتی علامات مصمتی خصوصیات کی نمائندگی کرتی ہیں جن کا استعمال مصمتوں کی نمائندگی کرنے والے حروف کے ساتھ ہوتا ہے۔ مصمتی علامات چار ہوتے ہیں۔ 1 تشدید 2 دو چشمی 3 جزم 4 تنوین۔

ج: غنائی علامات: غنائی علامات وہ علامات ہیں جو غنہ کو ظاہر کرتی ہیں۔ اُردو رسم الخط میں غنہ کو ظاہر کرنے کے لیے دو علامتیں رائج ہیں: 1۔ نون غنہ 2۔ اُلٹا قوس۔

د: اضافی علامات: اضافی علامات سے کا، کی، کے کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اضافی علامات تین ہیں:

1 زیر 2 ہمزہ 3 بڑی ے (یائے مجہول)

مولانا سید احمد دہلوی کے مطابق اُردو کے ساڑھے پانچ لاکھ الفاظ میں تین چوتھائی الفاظ سنسکرت الاصل ہیں۔ دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنانے کی وجہ سے اُردو کے تلفظ اور املا میں کچھ مسائل بھی ضرور پیدا ہوئے ہیں جن کی بنا پر بعض دانشوروں نے اُردو کے رومن یا دیوناگری رسم الخط میں منتقل کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ راہی معصوم رضا نے بہت پہلے کہا تھا کہ " اُردو آئندہ پچاس برسوں کی مہمان ہے لہٰذا اُردو والوں کو چاہیے کہ جتنی جلد ممکن ہو وہ اُردو کے سرمائے کو دیوناگری رسم الخط میں منتقل کردیں۔" علی سردار جعفری اور عصمت چغتائی نے بھی اُردو کے لیے دیوناگری رسم الخط کا مشورہ دیا ہے۔ ان دانشوروں نے کہا کہ اس رسم الخط کو اپنانا چاہیے جس سے روزی روٹی کا مسئلہ بھی حل ہو سکے۔ حاصل کلام یہ کہ اُردو زبان میں کچھ کمیاں ضرور ہو سکتی ہیں لیکن ان کی وجہ سے اُردو سرمائے رومن یا دیوناگری رسم الخط میں منتقل کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو کی بھی ایک تاریخ ہے۔ اپنا لسانی عمل ہے، اپنے ارتقائی مدارج ہیں اور اپنے قواعد اور اپنا رسم الخط بھی ہے، لغت ہے، صوتی نظام ہے۔ ہیئت و تشکیل کے اپنے اصول ہیں۔ یہ ایسے حقائق ہیں جنھوں نے مل کر اُردو کی انفرادیت کو سنوارا اور نکھارا ہے۔ ق ف ز خ غ حروف صحیح اُردو کے علاوہ کسی دوسری زبان میں بنیادی حیثیت نہیں رکھتے۔ حاضر ضمیر کی واحد شکل میں اُردو میں تین ذیلی ضمیریں استعمال ہوتی ہیں جو دوسری کسی زبان میں نہیں ہیں۔ اُردو رسم الخط میں لفظوں کے انتخاب میں بڑی گنجائش ہے مثلاً مہر، مہتاب، قمر، چاند، بازار، دولت، روپیہ، پیسہ وغیرہ۔ اردو رسم الخط یا اُردو زبان میں (ات) کا لاحقہ بھی استعمال ہوتا ہے جس کا رواج کسی دوسری زبان یا رسم الخط میں نہیں ملتا۔ مثلاً جذبہ سے جذبات، مشکل سے مشکلات وغیرہ۔ اُردو رسم الخط اور اُردو زبان میں ایسے محاوروں کی تعداد بکثرت ہے جو صفت کو ملا کر بنائے گئے ہیں۔ مثلاً منہ بنانا، منہ مارنا وغیرہ۔ اُردو رسم الخط میں نسبت کا لاحقہ (ای) ہے۔ اگر لفظ حروف علت پر ختم ہوتا ہو تو (ای) کے بجائے (وی) لاحقہ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً لکھنؤ سے لکھنوی، دہلی سے دہلوی وغیرہ۔ اُردو رسم الخط نے فرہنگ کی سطح پر عربی و فارسی سے جتنا استفادہ کیا ہے، اتنا اور کسی نے نہیں کیا۔ ایک اندازے کے مطابق 35 فیصد الفاظ اُردو رسم الخط میں عربی فارسی انگریزی و پشتو زبانوں کے ہیں۔ دوسری زبانوں کے مقابلے میں یہ ایک ریکارڈ بھی ہے۔ اُردو اپنے اسالیب، لب و لہجہ، انتخاب الفاظ اور مختلف لسانی و ادبی اقدار کے لحاظ سے تین رجحان میں بٹی ہوئی ہے۔ پہلے رجحان میں عربی و فارسی الفاظ اور تراکیب و تلمیحات میں آتی ہیں۔ دوسرے رجحان میں دیسی سادگی اور سلاست ہے۔ تیسرے رجحان کو انگریزی رجحان کہا جا سکتا ہے۔ جہاں حقیقت پسندی ہے۔

اُردو زبان کی موجودہ خامیوں کے باوجود اُردو رسم الخط کے بدلنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ رسم خط کے بدلنے کے معنی ہیں اپنے ماضی اور اس کی روایتوں سے بے تعلق ہوجانا۔ رسم خط زبان کا نہ صرف خوبصورت لباس ہے بلکہ یہ زبان کی روح بھی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے مطابق کوئی زبان بغیر رسم خط کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُردو بھی اُس وقت تک زندہ رہے گی جب تک اُس کا رسم خط زندہ رہے گا۔ تمدن کی تاریخ دنیا کے ہر رسم الخط کے پیچھے ہوتی ہے۔ یا اس طرح کہیں کہ ہر رسم الخط کے پیچھے اُس کے تمدن کی تاریخ ہوتی ہے۔

■

Reyaz Ahmad
Research Scholar, Dept of Urdu
O.P.J.S University
Churu - 331303 (Rajasthan)

ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح اُردو کی بھی ایک تاریخ ہے۔ اپنا لسانی عمل ہے، اپنے ارتقائی مدارج ہیں اور اپنے قواعد اور اپنا رسم الخط بھی ہے، لغت ہے، صوتی نظام ہے۔ ہیئت و تشکیل کے اپنے اصول ہیں۔ یہ ایسے حقائق ہیں جنھوں نے مل کر اُردو کی انفرادیت کو سنوارا اور نکھارا ہے۔

اُردو زبان کی موجودہ خامیوں کے باوجود اُردو رسم الخط کے بدلنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ کیونکہ رسم خط کے بدلنے کے معنی ہیں اپنے ماضی اور اس کی روایتوں سے بے تعلق ہوجانا۔ رسم خط زبان کا نہ صرف خوبصورت لباس ہے بلکہ یہ زبان کی روح بھی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے مطابق کوئی زبان بغیر رسم خط کے زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُردو بھی اُس وقت تک زندہ رہے گی جب تک اس کا رسم خط زندہ رہے گا۔

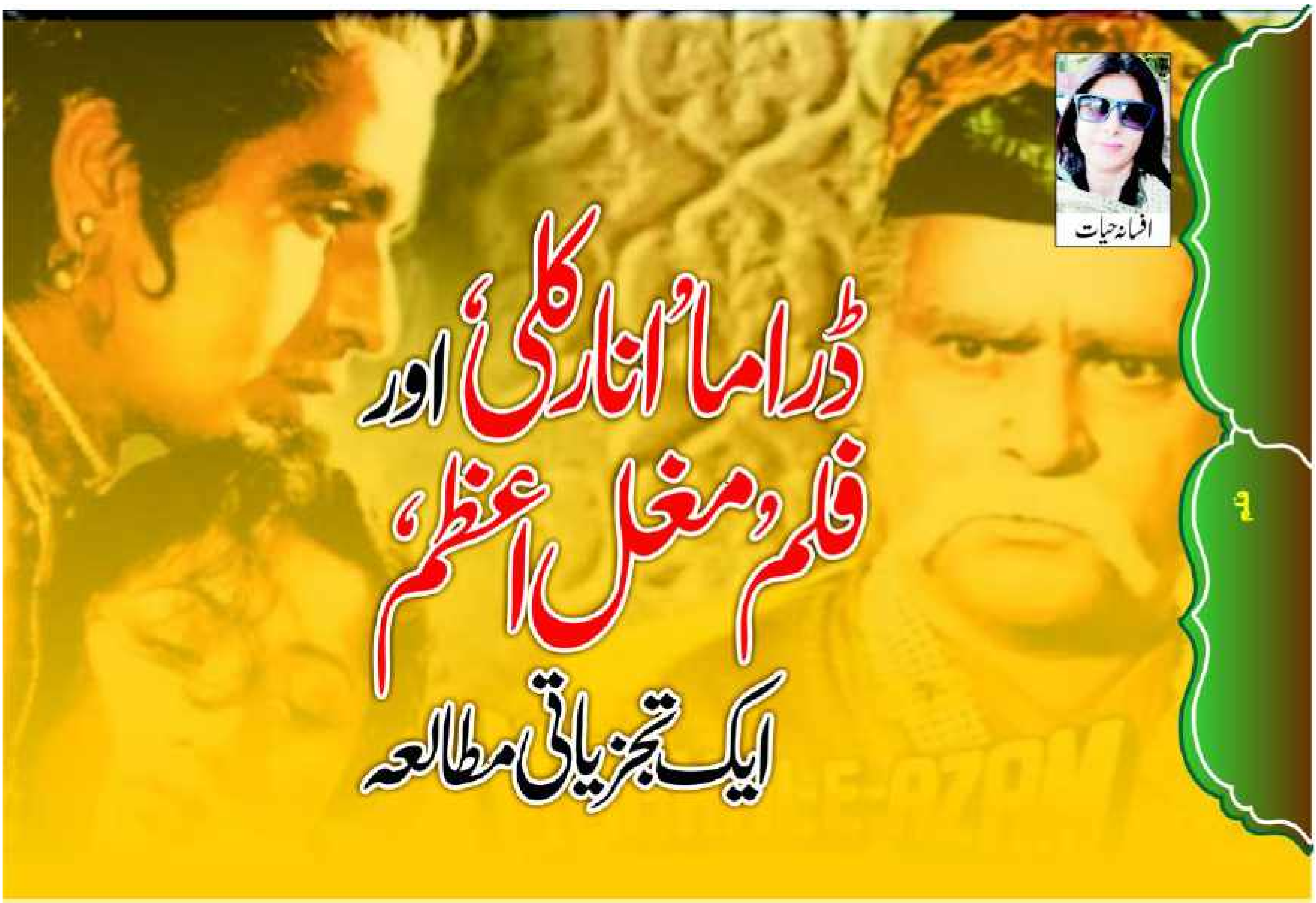

افسانہ حیات

ڈراما ’انارکلی‘ اور فلم ’مغل اعظم‘
ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈراما انارکلی اور فلم مغلِ اعظم دونوں کا تانا بانا عشق کے روایتی قصے پر بنا گیا ہے، جس میں ایک ادب کی آغوش میں پناہ گزیں ہے تو دوسرا ہندی سیمیں پردے پر جلوہ افروز۔ فلم مغلِ اعظم ’مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے دورِ حکومت 1556 تا 1606 میں مغلیہ سلطنت کے جاہ و جلال اور شاہی محل سرا کی ایک کمسن خوبصورت کنیز ’انارکلی‘ اور شہزادہ سلیم کے عشق کی داستان ہے۔ اس کا ماخذ امتیاز علی تاج کا ڈراما ’انارکلی‘ ہے۔ امتیاز علی تاج نے ڈراما ’انارکلی‘ 1922 میں تصنیف کیا تھا مگر کتابی شکل میں پہلی بار 1932 میں شائع ہوا۔ ڈراما انارکلی کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ یہ ایک روایتی قصہ ہے، امتیاز علی تاج نے خود بھی اس بات کا اعتراف کیا ہے:

’’میرے ڈراما کا تعلق ایک روایت سے ہے۔ انار کلی کی فرضی کہانی سنتے رہنے سے حسن و عشق اور ناکامی و نامرادی کا جو ڈراما میرے تخیل نے مغلیہ حرم کی شوکت و تجمل میں دیکھا اس کا اظہار ہے‘‘

(امتیاز علی تاج، دیباچہ ڈراما انارکلی، ص 7، 1913)

ڈراما انارکلی اردو ڈرامے کا شاہکار ہے۔ ’انارکلی‘ کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ فلموں کے خاموش دور سے موجودہ عہد تک اس قصے نے بڑے نامور فلم سازوں کو متاثر کیا ہے جس کے نتیجے میں اس قصے پر کئی فلمیں بنیں اور کچھ بے حد مقبول بھی ہوئیں۔ ان فلموں سے انارکلی کے قصے کو عوام و خواص میں بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی مگر تمام شہرت و مقبولیت کے باوجود اس ڈرامے کی ڈرامائیت اور اسٹیج کے حوالے سے عام خیال یہ ہے کہ ڈراما ’انارکلی‘ کو آج تک کامیابی کے ساتھ اسٹیج نہیں کیا جاسکا جس کے لیے بعض نقادوں نے اس کی ادبیت، مناظر، مکالموں، طوالت وغیرہ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ڈراما کے معتبر نقاد عشرت رحمانی ڈراما ’انارکلی‘ کی ادبی شان اور اسٹیج کی معنویت کو ثابت کرتے ہوئے ان اعتراضات کو قابلِ قبول نہیں گردانتے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ:

’’بعض ناقدین نے غور و فکر کے بغیر ’انارکلی‘ کے بارے میں رائے زنی کی ہے کہ وہ مرجہ اسٹیج پر اس لیے نہیں کھیلا جاسکا کہ اس کی غیر معمولی طوالت اور ادبی شان اسٹیج کے لیے ناقابلِ قبول تھی حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ مدّت یا دوران کے اعتبار سے ان تمام مرجہ ڈراموں سے تقریباً نصف ہے۔ جو اس دور میں اسٹیج پر کھیلے جاتے تھے۔ مکمل ڈراما نہایت اطمینان سے تین گھنٹے کی مدّت میں کھیلا جاسکتا ہے‘‘

(عشرت رحمانی، اردو ڈراما کا ارتقا، ص 345)

ان اعتراضات سے قطع نظر عشرت رحمانی ڈراما ’انارکلی‘ کو دورِ جدید کا نقشِ اول قرار دیتے ہوئے ڈرامے کو ادبیت، زبان کی خوبی، مکالموں کی چستی اور ڈرامائیت کے لحاظ سے لاجواب ڈراما مانتے ہیں وہ ’انارکلی‘ کے اسٹیج کیے جانے کے حوالے سے ڈراما کمپنیوں کی مصلحتوں کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں:

’’تاج نے 1922 میں اپنا وہ شاہکار لکھا جو اردو ڈراما نگاری کے دورِ جدید کا نقشِ اول اور سنگِ میل تصور کیا جاتا ہے۔ یہ ڈراما پہلی بار 1932 میں دارالاشاعت پنجاب لاہور کے اہتمام سے شائع ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ ’انارکلی‘ فنی عروج اور دلکش ادبیت کے لحاظ سے بے مثال کارنامہ ہے۔ زبان کی خوبی، مکالموں کی چستی اور برجستگی اور ڈرامائی تدبیر گری کی نادرہ کاری لاجواب ہے۔ ڈراما کئی باوقار ناٹک کمپنیوں نے کھیلنے کا ارادہ کیا خصوصاً بالکل بھارت کمپنی کے ذی ہوش اصحاب قیام لاہور کے دوران میں اسے تمثیل کرنے کے بڑے خواہش مند تھے لیکن ان

میں سے اکثر اپنی محدود ضروریات کے پیشِ نظر اصل ڈراما میں چند تبدیلیوں کے طالب تھے۔ تاج صاحب نے نام نہاد مصلحتوں پر اپنے فنی شاہکار کو قربان کر دینا ہرگز گوارہ نہ کیا'' (عشرت رحمانی اردو ڈراما کا ارتقا، ص 345)

امتیاز علی تاج خود بھی اس بات کی وضاحت کرتے ہیں:

''میں نے انارکلی 22 عیسوی میں لکھا تھا۔ اس کی موجودہ صورت میں تھیٹروں نے اسے قبول نہ کیا۔ جو مشورے ترمیم کے لیے پیش کیے انھیں قبول کرنا مجھے گوارہ نہ ہوا''

(سید امتیاز علی تاج، ڈراما انارکلی، دیباچہ، ص 5 ہمالہ بک ہاؤس پہاڑی بھوجلہ دہلی 6)

ڈراما 'انارکلی' کو بھلے ہی اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ نہ کھیلا گیا ہو لیکن ادب کی آغوش اور فلم کے سنہرے پردے پر اس قصّے نے بڑی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ عوام کے دلوں پر حکومت کی ہے۔ فلموں کے خاموش دور سے موجودہ عہد تک 'انارکلی' کے اس رومانی قصے نے بڑے نامور فلم سازوں کو متاثر کیا ہے۔

1912 سے 1930 تک خاموش فلموں کا دور رہا ہے۔ 1927 میں گریٹ ایسٹرن کارپوریشن پنجاب (لاہور) نے ڈراما 'انارکلی' کی بنیاد پر (Love of a great Mughal Prince) کے عنوان سے خاموش فلم بنائی۔ مگر اردشیر ایرانی نے بہت کم وقت میں 'انارکلی' کے عنوان سے ایک فلم بنا کر نمائش کے لیے پیش کر دی، اس وقت تک فلم انڈسٹری کاپی رائٹ ایکٹ سے ناآشنا تھی۔ اس فلم کو زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ چند ماہ بعد جب (Love of a great Mughal Prince) ریلیز ہوئی تو عوام نے اسے 'انارکلی' کا چربہ مان کر ٹھکرا دیا۔ یہ دونوں فلمیں خاموش تھیں۔ 1931 میں اردشیر شیرانی نے پہلی ناطق فلم 'عالم آرا' بنائی تو 1934 میں 'انارکلی' کو بھی زبان عطا کی۔ یہ فلم بے حد کامیاب رہی۔ اس فلم کی اسکرپٹ اور مکالمے امتیاز علی تاج نے لکھے۔ 1953 میں نند لال جسونت لال کی ہدایت میں 'انارکلی' کے عنوان سے ایک اور کامیاب فلم بنی جس میں مرکزی کردار پردیپ کمار اور بینا رائے نے ادا کیے۔ اس طرح انارکلی کے اس قصے پر وقت وقت پر فلمیں بنتی رہیں۔

سب سے اہم اور کامیاب فلم 1960 میں ہدایت کار کمال الدین آصف کی ہدایت میں بنی فلم 'مغلِ اعظم' ہے۔ کے آصف پہلی مرتبہ 'مغلِ اعظم' میں نرگس (انارکلی) چندر موہن (اکبر) اور شہزادہ سلیم آصف جینت (امجد خان) کو لے کر فلم بنا رہے تھے، فلم کی کافی شوٹنگ بھی ہو چکی تھی مگر اچانک چندر موہن بیمار ہوئے اور اس دنیا کو الوداع کہہ دیا اور اس طرح یہ فلم مکمل نہ ہو سکی۔ 1946 میں کے آصف نے 'مغلِ اعظم' دوبارہ شروع کی تو پورا سیٹ اپ بدلا گیا۔ کے آصف نے اس فلم کو بنانے میں جی جان لگا دی۔ اس فلم کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اردشیر ایرانی (خاموش اور ناطق) انارکلی کے خالق کے بیٹے شاپور جی نے اس فلم کو فائنانس کیا۔ اس کی نوک پلک سنوارنے میں کے آصف نے 14 سال کا طویل عرصہ اور تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی رقم صرف کی، جبکہ اس دور میں دس لاکھ میں فلمیں بن جایا کرتی تھیں۔ کے آصف نے فلم میں چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس پر وقت، پیسہ اور پوری توجہ صرف کی۔ اس فلم 'مغلِ اعظم' میں دلیپ کمار، مدھو بالا، پرتھوی راج کپور، درگا کھوٹے، اجیت، جانی واکر جیسے ستاروں نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ فلم کی اسکرپٹ امان اللہ خان، مکالمے احسن رضوی، کمال امروہی، وجاہت مرزا نے لکھے۔ موسیقی نوشاد اور گیت شکیل بدایونی نے تخلیق کیے۔ اس فلم کے گیت بہت مشہور و مقبول ہوئے خاص طور پر مدھو بالا 'انارکلی' پر فلمایا ہوا گیت 'جب پیار کیا تو ڈرنا کیا' بہت زیادہ مشہور ہوا۔ اس فلم میں بات اداکاری کی ہو، اسکرپٹ کی ہو، مکالموں کی یا پھر گیت اور سنگیت کے تمام فن کار اعلیٰ درجے صلاحیت کے مالک تھے۔ کے آصف نے اس فلم میں فلمی دنیا کے درخشاں ستارے چن چن کر انارکلی کے آنچل میں ٹانک دیے تھے۔

امتیاز علی تاج نے 'ڈراما انارکلی' 1922 میں تخلیق کیا۔ 1960 میں کے آصف نے اس ڈرامے کو فلمی پردے پر پیش کر کے لافانی بنا دیا۔ فلم مغلِ اعظم کو پلاٹ، مکالمہ نگاری، کردار نگاری، موسیقی، رقص، کاسٹیوم وغیرہ ہر لحاظ سے کامیاب فلم کہا جا سکتا ہے۔ مغلِ اعظم کا پلاٹ عشق کی بے لوث داستان اور مغلیہ سلطنت کے جاہ و جلال کے ارد گرد بنا گیا ہے۔ جس میں عشق پابندِ وفا اور سلطان پابندِ اصول ہے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ثابت قدم ہیں نہ عشق بے وفائی کرتا ہے نہ فرض اپنے اصولوں سے منہ پھیرتا ہے۔ کسی بھی ڈراما یا فلم کا بنیادی جز اس کی کہانی اور اس میں پیوست اس کے کردار ہوتے ہیں جو اسے مشہور و مقبول اور لازوال بناتے ہیں۔ امتیاز علی تاج کا ڈراما انارکلی اور کے آصف کی ہدایت کاری میں بنی فلم مغلِ اعظم کا قصہ اور کردار ایک دوسرے سے بڑی خوبصورتی کے ساتھ مربوط و منسوب نظر آتے ہیں۔

فلم 'مغلِ اعظم' اور ڈراما 'انارکلی' دونوں ایک ہی

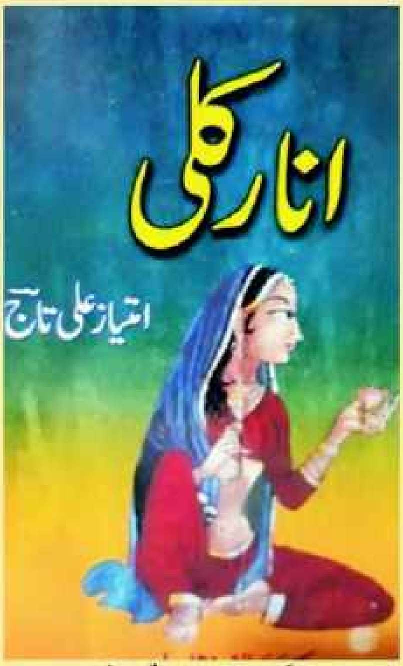

قصے پر بنی ہیں۔ مگر کے آصف نے فلم میں کئی مقامات پر حذف و اضافے سے کام لیا ہے۔ دونوں کی کہانی بادشاہ اکبر، شہزادہ سلیم اور کنیز انارکلی کے ارد گرد گھومتی نظر آتی ہے۔ یہ ایک عشقیہ داستان ہے جس میں ہندوستان کے ہونے والا ولی عہد شہزادہ سلیم محل کی ایک کنیز کے عشق میں اس درجہ گرفتار ہو جاتا ہے کہ مغلیہ سلطنت اور بادشاہ جلال الدین اکبر کے جاہ و جلال سے بے خوف بغاوت کا علم بلند کر دیتا ہے۔ سلیم کی شخصیت میں شاعرانہ اور عاشقانہ خمیر گھلا ہے۔ یہ باغیانہ مزاج اور عاشقانہ خمار مغلیہ سلطنت میں ایک ایسا زلزلہ بن کر ابھرتا ہے جو بادشاہِ وقت اکبر اور ہندوستان کے ولی عہد شہزادہ سلیم کو میدانِ جنگ میں ایک دوسرے کے روبرو لا کھڑا کرتا ہے۔ جہاں ایک طرف ہندوستان کا جلیل القدر بادشاہ اکبرِ اعظم ہے تو دوسری جانب ایک کنیز کے عشق کے نشے میں مدہوش باغی شہزادہ۔ جس کی سلطنت اور زندگی کا مقصد عشق کے علاوہ دوسرا کچھ نہیں۔

ڈراما انارکلی اور فلم مغلِ اعظم کے قصے میں جو بنیادی جز ہے وہ عشق کی فتح ہے جو بظاہر محبت کی ہار مگر اصل میں سچی محبت کی جیت ہے۔ ڈراما انارکلی اور فلم مغلِ اعظم کی پیش کش، کہانی کردار، واقعات وغیرہ میں کئی مقامات پر فرق واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اگر ڈراما انارکلی اور فلم مغلِ اعظم کے قصے کے حوالے ہی سے گفتگو کریں تو جس طرح ڈرامے میں کہانی کی ابتدا میں محل کا شاہانہ ماحول، تہذیب کنیزوں کی ہنسی ٹھٹھولی، چھیڑ چھاڑ کی خوشگوار فضا کو پیش کیا گیا ہے۔ فلم مغلِ اعظم میں کہانی کی ابتدا اکبرِ اعظم کے

محل سے نہیں بلکہ تپتے صحرا میں اکبر کے اس سفر سے ہوتی ہے جس میں لاولد بادشاہ اکبر اپنے ایک بڑے لشکر کے ساتھ مزار پر اولاد کے لیے منّت مانگنے جاتا ہے دعا قبول ہوتی ہے محل میں ڈھول تاشے بجتے ہیں اور بلائیں لی جاتی ہیں۔ اسی خوشی میں اکبر سلیم کی ولادت کی خبر دینے والی محل کی ایک کنیز کو کچھ مانگ لینے کی بات کرتا ہے یہ کنیز دراصل انارکلی کی ماں تھی جو بعد میں اس وعدے کے بدلے میں انارکلی کی زندگی بخشوا لیتی ہے۔ مگر امتیاز علی تاج کے ڈرامے میں اس واقعہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ اسی طرح فلم میں اکبر اور سلیم کے درمیان جنگ کے میدان کے واقعات کو جس طرح کے آصف نے فلم کے پردے پر اتارا ہے تاج کے ڈراما میں ان واقعات کی وضاحت نہیں ملتی۔ ان واقعات کے علاوہ بہت سے واقعات ہیں جنھیں کے آصف نے فلم کے پیرائے میں خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مگر کچھ اہم واقعات کا تذکرہ کے آصف نہیں کرتے جس میں انارکلی کے زندہ دیوار میں چنوانے کے بعد اکبر کی پشیمانی اور مجبور باپ کی شفقت اور لاچاری کا منظر بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس طرح کے اہم اور چھوٹے چھوٹے واقعات فلم کے قصے کو ڈراما کے قصے سے ذرا مختلف کر کے پیش کرتے ہیں۔ جن کی مختلف وجوہات ہیں۔ اس سے فلم کی دلکشی، دلچسپی اور کامیابی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔

فلم مغلِ اعظم اور ڈراما انارکلی کے کرداروں کے حوالے سے گفتگو کریں تو جس طرح امتیاز علی تاج نے اپنے ڈراما میں اکبر، سلیم اور انارکلی کے مرکزی کرداروں کے ساتھ رقابت کے جذبے سے بھرپور دلآرام کا کردار بہت جاندار ہے۔ ساتھ ہی انارکلی کی بہن ثریا، سلیم کا دوست بختیار، اور ماں جودھا بائی کے کرداروں کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ کنیزوں میں عنبر، زعفران، ستارہ وغیرہ کے کردار بھی کہانی میں حرکت و دلچسپی برقرار رکھنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ فلم اور ڈراما انارکلی کے کرداروں میں سب سے زیادہ متحرک اور متصادم اکبر، سلیم اور انارکلی کے کردار نظر آتے ہیں۔ ڈراما انارکلی کا سلیم ایک شہزادہ، ایک خودسر بیٹا، ایک کنیز کے عشق میں دیوانہ باغی عاشق ہے جو محبت کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہے۔ فلم مغلِ اعظم کا سلیم بھی انھیں خصوصیات کا حامل ہے۔ مگر اس میں فرق یہ ہے کہ جہاں امتیاز علی تاج کا سلیم ماں باپ سے محبت کے جذبات سے عاری نہیں، جبکہ مغلِ اعظم کا سلیم ان جذبات و احساسات سے ایک دم عاری نظر آتا ہے۔ اس پر ماں باپ کی محبت کا کوئی دلی احساس نہیں ہوتا اگر اس کو کسی سے محبت ہے تو وہ صرف انارکلی سے جس کے لیے وہ مغلیہ سلطنت اور بادشاہ اکبر سے ہی نہیں بلکہ اپنے باپ سے کھلی بغاوت کر بیٹھتا ہے۔ حالانکہ اس کے برعکس اکبر کا کردار فلم اور ڈراما دونوں میں ایک فرض شناس بادشاہ کے علاوہ باپ کی شفقت اور محبت کے جذبات سے عاری نہیں بلکہ وہ اپنے فرض کے تئیں مجبور ہے۔ جس میں اس کی مجبوری اور لاچاری کا احساس اس وقت بہت گہرا ہو جاتا ہے جب وہ انارکلی کو دیوار میں چنوا کر اپنے بیٹے شیخو کے سامنے بے قابو ہو کر رو پڑتا ہے۔ یہ اکبر کے کردار کا روشن پہلو بھی ہے اور فطری جذبہ بھی۔ اسی طرح ڈراما اور فلم دونوں میں انارکلی کا کردار ایک خوبصورت اور وفا کا مجسمہ ہے جو اپنی خوبصورتی، وفاداری، قربانی اور مظلومیت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتی ہے۔

کسی بھی فلم یا ڈراما میں قصے اور کرداروں کے علاوہ اسے لازوال بنانے میں اس کے مکالمے بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں، مکالمے اگر بے جان غیر مربوط ہوں تو فلم یا ڈراما اپنا اصل تاثر ناظرین پر نہیں چھوڑ پاتے۔ اس لحاظ سے امتیاز علی تاج کا ڈراما انارکلی اور کے آصف کی فلم مغلِ اعظم بھرپور ہے۔ ڈراما 'انارکلی' اور فلم 'مغلِ اعظم' کے چند مکالمے ملاحظہ ہوں۔

ڈراما: اکبر بادشاہ۔ مجھے چھو مت، ایک دفعہ باپ کہہ دے۔ صرف ابا کہہ کر پکار لے میں تجھے خنجر تک لا دوں گا۔ خنجر اس کے سینے میں بھونک دینا۔ پھر تو دیکھے گا اور دنیا بھی دیکھے گی کہ اکبر باہر سے کیا ہے اور اندر سے کیا ہے، اکبر کا ستم اور اکبر کا ظلم کیوں ہے۔ اس کے خون میں بادشاہ کا ایک قطرہ نہیں ایک بوند نہیں وہ سب کا سب شیخو کا باپ۔ صرف باپ۔ وہ باشاہ ہے تو تیرے لیے۔ وہ تیرا غلام ہے اور میرے جگر کے گوشے غلاموں سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں۔

> **"مغل اعظم کی مقبولیت کا عوام پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اب خاص و عام ان مکالموں کو اپنی گفتگو میں استعمال کرنے لگے۔ جہاں پناہ، ظل الٰہی، مہابلی، شہزادے، کنیز، تخلیہ، اقبال بلند وغیرہ جملے خاص و عام کی زبان پر رواں ہو گئے۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ڈراما انار کلی کا موضوع، اس کے بے مثال کرداروں اور طویل مگر جاندار مکالموں کی وجہ سے ادب اور ہندوستان کے پردہ سیمیں پر لازوال ہے۔"**

فلم۔ بادشاہ اکبر: بخدا ہم محبت کے دشمن نہیں، اپنے اصولوں کے غلام ہیں۔

فلم۔ مان سنگھ: جنگ کے میدان میں تلوار سپاہی کے ہاتھ میں دی جاتی ہے، مایوس عاشق کے ہاتھ میں نہیں۔

فلم۔ شہزادہ سلیم: میرا دل آپ کا ہندوستان نہیں جس پر آپ کی حکومت چلے۔

ڈراما۔ بادشاہ اکبر: اس بے باک عورت کو لے جاؤ۔ اور زنداں میں ڈال دو۔

فلم۔ انارکلی: انارکلی جلال الدین محمد اکبر کو اپنا خون معاف کرتی ہے۔

فلم 'مغلِ اعظم' میں کے آصف نے زبان و بیان اور ادبیت کا خاص خیال رکھا ہے ساتھ ہی کردار نگاری، مکالمے اور مقامات کے ساتھ مناظر، کاسٹیوم، زیورات وغیرہ پر خاصی توجہ صرف کی ہے۔

سید اخلاق اثر امتیاز علی تاج کے ڈراما 'انارکلی' کی اہمیت اور فلم 'مغلِ اعظم' کی شہرت و مقبولیت اور اس کی کامیابی کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"امتیاز علی تاج نے ڈراما لکھ کر انارکلی کو حیات جاوداں عطا کر دی۔ ان کے ڈرامے سے متاثر فلم مغلِ اعظم کو امرتسر سے ٹیلی کاسٹ کیا گیا تو امتیاز اور انارکلی کے شہر کی سڑکیں اور گلیاں سنسان ہو گئیں اور ٹیلی ویژن سیٹوں پر آبادیاں سمٹ گئیں"

(سید حیدر عباس رضوی، اردو ڈراما اور انارکلی، دیباچہ سید اخلاق اثر ص 1976)

یہ بات درست ہے کہ کے آصف نے فلم 'مغلِ اعظم' بنا کر اس قصے کو ہی نہیں بلکہ مغلوں کی شان و شوکت، جاہ و جلال، تہذیب و تمدن کو ہر خاص و عام سے روبرو کرا دیا۔ اس فلم کی مقبولیت کا عوام پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اب خاص و عام ان مکالموں کو اپنی گفتگو میں استعمال کرنے لگے۔ جہاں پناہ، ظلِ الٰہی، مہابلی، شہزادے، کنیز، تخلیہ، اقبال بلند وغیرہ جملے خاص و عام کی زبان پر رواں ہو گئے۔ لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح ڈراما انارکلی کا موضوع، اس کے بے مثال کرداروں اور طویل مگر جاندار مکالموں کی وجہ سے ادب اور ہندوستان کے پردہ سیمیں پر لازوال ہے۔ امتیاز علی تاج نے ادب کے شیدائیوں کو ڈراما 'انارکلی' لکھ کر اور کے آصف نے فلم 'مغلِ اعظم' بنا کر ناظرین کو حسین تحفے دیے ہیں۔

■

Dr. Afsana Hayat
B-2,506, SRS Residency, Sector 88
Faridabad - 121001 (Haryana)
Email: afsanahayaat@gmail.com

ورک شیٹ کو ازسرنو ترتیب دینا
(Rearranging Worksheet)

آپ کسی بھی کام کو چاہے جتنی احتیاط سے اور پہلے سے منصوبہ بنا کر شروع کیجیے، بیچ بیچ میں اس میں اصلاح کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایکسل کی ورک شیٹوں میں بھی ہمیں کسی قسم کی اصلاح کرنی پڑتی ہے، جیسے بیچ میں اضافی کالم یا قطاریں جوڑنا، سیلوں کو اِدھر اُدھر لے جانا، ان کی نقل کرنا یا ہٹا دینا وغیرہ۔ یہ کام آپ ونڈوز اور ایم ایس- ورڈ کے رائج طریقوں سے ہی آسانی سے کر سکتے ہیں۔ عام طور پر اس میں 'کاٹو اور چپکاؤ' (Cut-and-paste) اور 'کھینچو- اور چھوڑو' (Drag-and-drop) تکنیکوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

کالموں، قطاروں یا سیلوں کو ہٹانے، جوڑنے، سرکانے وغیرہ کا اثر ورک شیٹوں میں بھرے ہوئے فارمولوں پر پڑ سکتا ہے۔ اس لیے اس میں تھوڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں ہم آگے بتائیں گے۔ یہاں ہم کچھ اہم کاموں کا طریقہ بتا رہے ہیں۔

سیلوں کو سرکانا (Moving Cells)

سیلوں کو سرکانے کا مطلب ہے- انھیں چن کر Home ٹیب کے Clipboard حصہ کی 'Cut' ہدایت سے کاٹنا اور کسی دوسری جگہ اسی حصہ کو 'Paste' ہدایت سے چپکانا۔

ایسا کرنے سے نئی جگہ پر پہلے سے جو مواد (ڈاٹا یا فارمولہ) ہوگا، وہ ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ نیا مواد آ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی پرانی جگہ کے سیل خالی ہو جائیں گے۔ 'Cut' اور 'Paste' ہدایتوں کے لیے آپ شارٹ کٹ کنجیوں بالترتیب Ctrl+X اور Ctrl+V کا بھی استعمال کر سکتے ہیں یا چنے ہوئے سیلوں پر ماؤس کا دایاں بٹن کلک کر کے Cut اور Paste ہدایت دے سکتے ہیں۔

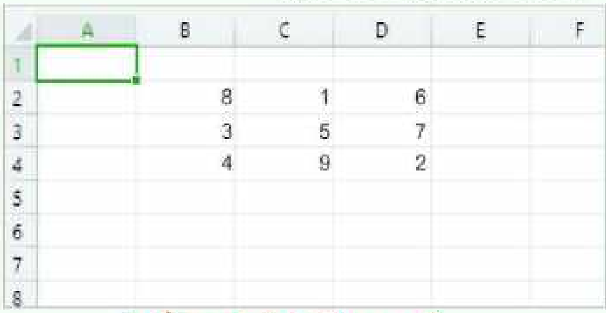

	A	B	C	D	E	F
1						
2		8	1	6		
3		3	5	7		
4		4	9	2		
5						
6						
7						
8						

تصویرE-3.1: ورک شیٹ میں بھرا ہوا جادوئی مربع

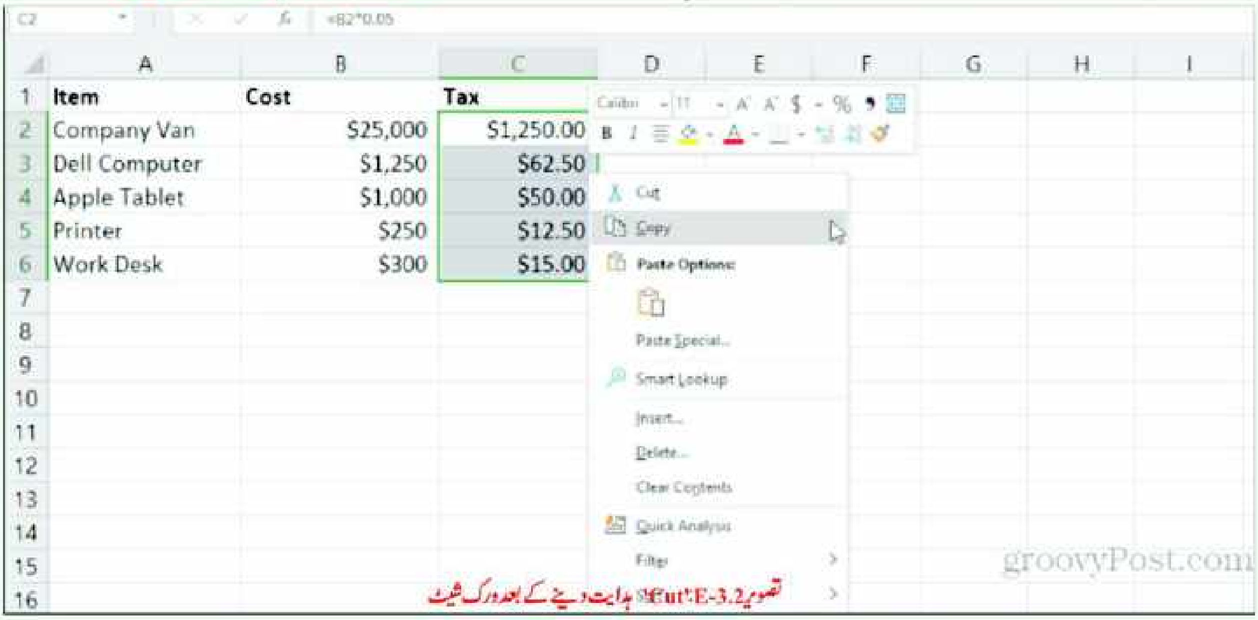

تصویرE-3.2: 'Cut' ہدایت دینے کے بعد ورک شیٹ

مشق کے لیے،ایک خالی ورک شیٹ میں تصویر E-3.1 کی طرح جادوئی مربع (Magic Square) رینج B3:D5 میں بھر لیجیے۔اب مان لیجیے کہ آپ اس جادوئی مربع کو رینج B3:D5 سے ہٹا کر رینج C7:E9 میں لے جانا چاہتے ہیں۔اس کے لیے درج ذیل کام کیجیے:

1. سیل B3 میں کلک کرکے ماؤس بٹن کو دبا لیجیے اور اسے دبائے رکھ کر کھینچتے ہوئے سیل D5 تک لے جا کر چھوڑ دیجیے۔اس سے رینج B3:D5 چن لی جائے گی اور بدلے ہوئے رنگ میں دکھائی دے گی۔
2. اب یا تو Home ٹیب کے Clipboard حصہ کا 'Cut' بٹن، جس پر قینچی کی تصویر چھپی ہے، کو کلک کیجیے یا چنے ہوئے سیلوں پر ماؤس کا دایاں بٹن کلک کرکے Cut ہدایت دیجیے (تصویر E-3.2) یا کنٹرول کے ساتھ X دبایئے۔اس سے مربع کے چاروں طرف ٹوٹی ہوئی لائنوں کا گھیرا بن جائے گا۔
3. ماؤس پوائنٹر کو سیل C7 میں لے جا کر کلک کیجیے،جس سے وہ ایکٹو ہو جائے گا۔
4. کاٹے ہوئے مواد کو ایکٹو سیل میں چپکانے کے لیے یا Home ٹیب کے Clipboard حصہ کا 'Paste' بٹن، جس پر گوند کا ڈبہ چھپا ہوا ہے، کلک کیجیے یا ایکٹو سیل (C7) میں ماؤس کا دایاں بٹن کلک کرکے Paste ہدایت دیجیے یا کنٹرول کے ساتھ V دبایئے۔ایسا کرتے ہی آپ دیکھیں گے کہ چنی ہوئی رینج کا مواد اپنی جگہ سے غائب ہو گیا ہے اور رینج C7:E9 میں دکھائی دے رہا ہے، جیسا کہ تصویر E-3.3 میں دکھایا گیا ہے۔

مواد پہلے سے بھرا ہوگا، تو ایکسل آپ کو تصویر E-3.4 کی طرح وارننگ (Warning) بھی دے اور آپ کے ذریعے 'OK' کرنے پر ہی سیل سرکائے جائیں گے۔

سیلوں کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ آنے سے ان کے ڈاٹا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اگر ان سیلوں میں فارمولے بھرے ہوئے ہیں، تو بھی ان کے نتائج پر عموماً کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اگر ایسے سیلوں کو سرکایا جاتا ہے، جن کا حوالہ دوسری جگہ دیا ہوا ہے، تو اس حوالے کو نئی جگہ کے مطابق اس طرح بدل دیا جاتا ہے کہ نتیجہ وہی رہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سیلوں کو سرکانے سے ورک شیٹ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ پھر بھی اپنی ورک شیٹ کی اچھی طرح جانچ کر لینی چاہیے۔ کوئی غلطی ہو جانے پر آپ ایم ایس-ورڈ کی طرح Undo ہدایت کے ذریعے اس کام کو الٹ سکتے ہیں۔

سیلوں کی نقل کرنا (Copying Cells)

سیلوں کو دوسری جگہ پر نقل کرنے کے لیے انھیں چن کر Home ٹیب کے Clipboard حصہ کی 'Copy' ہدایت سے نقل کیجیے اور نئی جگہ پر اسی حصہ کی 'Paste' ہدایت کے ذریعے چپکا دیجیے۔ ایسا کرنے پر چنی ہوئی رینج کے سبھی فارمولے اور ڈاٹا جگہ پر نقل کر دیے جائیں گے۔ اگر اس جگہ پر پہلے سے کچھ بھرا ہوگا، تو وہ گم ہو جائے گا۔ 'Copy' اور 'Paste' ہدایتوں کی جگہ آپ کی بورڈ سے بالترتیب Ctrl+C اور Ctrl+V ہدایت بھی دے سکتے ہیں یا چنے ہوئے سیلوں پر ماؤس کا دایاں بٹن کلک کرکے Copy اور Paste ہدایت دے سکتے ہیں۔

مشق کے لیے، مان لیجیے کہ آپ تصویر E-3.1 کی ورک شیٹ میں دکھائی گئی رینج

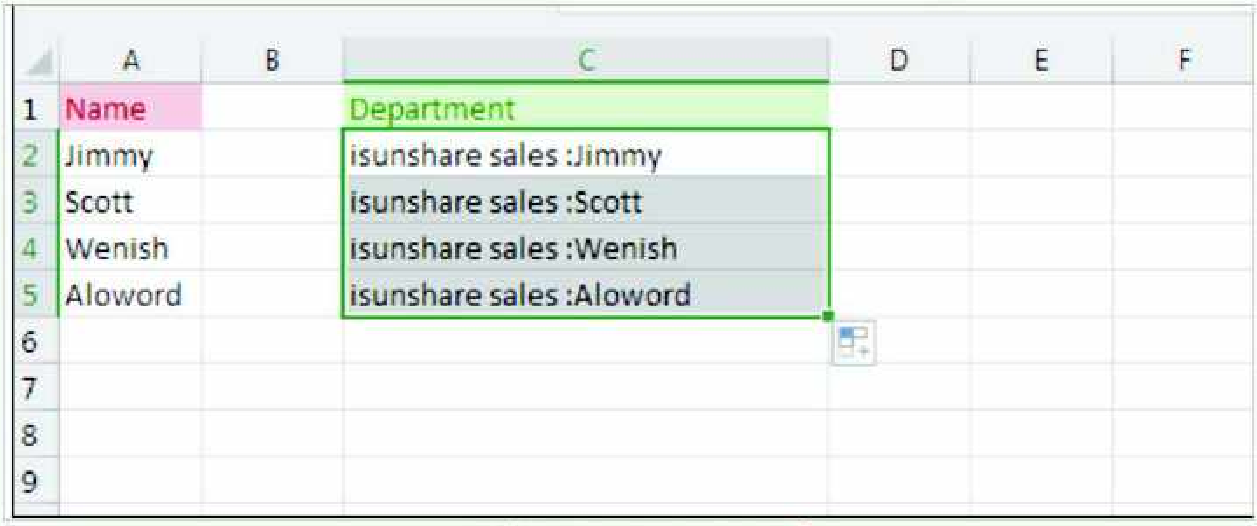

تصویر E-3.3: 'Paste' ہدایت دینے کے بعد ورک شیٹ

سیلوں کو سرکانے کے لیے آپ ماؤس پوائنٹر کے ذریعے کھینچنے کے عمل کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے پہلے سرکائے جانے والے سیلوں (یا رینج) کو چن لیجیے۔ اب اس ماؤس پوائنٹر کو اس رینج کی کسی بارڈر لائن پر لے جایئے، جہاں اس کی شکل بدل کر ترچھے تیر (⇖) جیسی ہو جائے گی۔ اسی وقت ماؤس بٹن کو پکڑ کر دبا لیجیے اور ماؤس کو سرکایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ساتھ ساتھ پوری چنی ہوئی رینج بھی سرک رہی ہے۔ اسے نئی جگہ تک کھینچ لے جا کر ماؤس بٹن کو چھوڑ دیجیے۔ اس طریقے سے سرکانے پر اگر نئی جگہ پر کوئی

تصویر E-3.4: وارننگ کا ڈائیلاگ باکس

B3:D5 کے جادوئی مربع کو رینج A7:C9 میں نقل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے درج

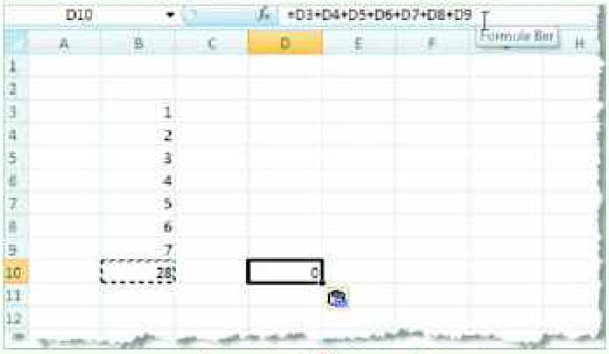

تصویر E-3.5: نقل کرنے کے بعد ورک شیٹ

ذیل کام کیجیے:

1. اوپر بتائے جا چکے طریقے سے رینج B3:D5 کو چن لیجیے۔
2. اس رینج کی نقل بنانے کے لیے یا تو Home ٹیب کے Clipboard حصہ کے 'Copy' بٹن کو کلک کیجیے یا چنے ہوئے سیلوں پر ماؤس دایاں بٹن کلک کر کے 'Copy' ہدایت دیجیے یا کنٹرول کے ساتھ C دبایئے۔ ایسا کرنے پر اس رینج کے چاروں طرف چینٹیوں کی قطار بن جائے گی۔
3. ماؤس پوائنٹر کو سیل A7 میں لے جا کر کلک کیجیے، جس سے وہ ایکٹو ہو جائے گا۔
4. نقل کیے ہوئے مواد کو ایکٹو سیل میں چپکانے کے لیے یا تو Home ٹیب کے Clipboard حصہ کا 'Paste' بٹن کلک کیجیے یا ایکٹو سیل (A7) میں ماؤس کا دایاں بٹن کلک کر کے Paste ہدایت دیجیے یا کنٹرول کے ساتھ V دبایئے۔ ایسا کرتے ہی آپ دیکھیں گے کہ جادوئی مربع رینج A7:C9 میں بھی دکھائی دے رہی ہے، جیسا کہ تصویر E-3.5 میں دکھایا گیا ہے۔

سیلوں کی نقل ماؤس کے ذریعے کھینچنے کے عمل سے بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ سیل سرکانے کی طرح ہی ہے، لیکن ساتھ میں کنٹرول کنجی کو بھی دبائے رکھا جاتا ہے، جس سے ماؤس پوائنٹر میں ایک چھوٹا جمع کا نشان (+) جڑ جاتا ہے۔ جس رینج کی نقل آپ کرنا چاہتے ہیں، پہلے اسے چن لیجیے۔ اب کنٹرول کنجی کو دبا کر اس رینج کے کسی کنارے پر ماؤس پوائنٹر لے جا کر ماؤس بٹن کو دبا کر اسے پکڑ لیجیے۔ اب کنٹرول کنجی اور ماؤس بٹن دونوں کو دبائے رکھ کر سیلوں کو نئی جگہ پر کھینچ لے جائیے اور پہلے ماؤس بٹن کو، پھر کنٹرول کنجی کو چھوڑ دیجیے۔ اس سے نئی جگہ پر سیل نقل کر دیے جائیں گے۔

سیلوں کی نقل کرتے وقت اگر ان میں کوئی حوالہ دیا ہوتا ہے، تو اسے نئی جگہ کے مطابق درست کر دیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر سیل C8 میں فارمولہ '=SUM (B3:D5)' بھرا ہوا ہے اور آپ اس سیل کو سیل D8 میں نقل کرتے ہیں، تو یہ فارمولہ بدل کر '=SUM (C3:E5)' ہو جائے گا۔ سیل D10 میں نقل کرنے پر یہی فارمولہ '=SUM (C5:E7)' بن جائے گا۔ فارمولوں کی یہ منتقلی صرف نسبتی سیل حوالوں (Relative Cell Reference) میں ہوتی ہے۔ اگر فارمولہ میں کوئی مطلق سیل حوالہ (Absolute Cell Reference) ہے، تو اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ملے جلے (Mixed) حوالوں میں بھی صرف نسبتی حصہ بدلا جاتا ہے۔ ان تینوں قسم کے سیل حوالوں کے بارے میں آپ کے پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں۔

سیلوں میں بھرے ڈاٹا کو چھانٹنا (Sorting Cell Data)

کئی بار ہمیں سیلوں کے کسی گروپ کو اس میں بھرے کسی مواد کے مطابق بڑھتی ہوئی (Ascending) یا گھٹتی ہوئی (Descending) ترتیب میں چھانٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایکسل میں یہ کام آسانی سے کیا جا سکتا ہے اور آپ اس میں زیادہ سے زیادہ تین چھانٹنے کی کنجیاں (Sort keys) دے سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر، مان لیجیے کہ آپ کی ورک شیٹ میں تصویر E-3.6 کی طرح ایک جدول (Table) میں کچھ لوگوں کے نام، منصب کے نام (Designation)، اسکیل اور پی ایف نمبر بھرے ہوئے ہیں اور آپ اس مواد کو ناموں کے حروف والی ترتیب (Alphabetical Order) میں چھانٹنا چاہتے ہیں۔ یہ چھنٹائی اس طرح ہونی چاہیے کہ 'S.No.' کالم میں بھرے ہوئے نمبر شمار گڑبڑ نہ ہوں۔

چھانٹے جانے والے مواد کی پہلی قطار میں اس کالم کی سرخی (Header) یا تعارف دینا اچھا رہتا ہے، حالانکہ یہ ضروری نہیں۔ چھانٹنے کے لیے مواد کا انتخاب کرتے وقت سرخی قطار (Header row) کا بھی انتخاب کیا جاتا ہے، لیکن اسے چھانٹا نہیں جاتا۔

	A	B	C	D	F	F	G	H	I	J
1	Emp ID	Last Name	First Name	Dept	E-mail	Phone Ext	Location	Hire Date	Pay Rate	
2	1054	Smith	Howard	AT	howards	148	Building 1	4/16/1991	$ 11.25	
3	1056	Gonzales	Joe	AT	joeg	121	Building 1	10/25/1979	$ 12.25	
4	1067	Scote	Gail	AT	gails	123	Building 1	9/20/1987	$ 14.55	
5	1075	Kane	Sheryl	AD	sherylk	126	Building 2	8/7/1992	$ 11.25	
6	1078	Hapsbuch	Kendrick	AC	kendrickh	101	Building 2	4/1/1986	$ 10.20	
7	1152	Henders	Mark	AD	markh	118	Building 2	1/21/1990	$ 12.25	
8	1196	Atherton	Katie	HR	katiea	289	Building 3	4/1/1998	$ 9.95	
9	1284	Bellwood	Frank	MK	frankb	124	Building 1	1/4/1985	$ 12.30	
10	1290	Cooper	Linda	AD	lindac	113	Building 2	1/3/1985	$ 13.25	
11	1293	Cronwith	Brent	HR	brentc	205	Building 3	9/14/1984	$ 10.20	
12	1299	Simpson	Sandrae	MF	sandraes	127	Building 1	12/21/1989	$ 12.20	
13	1302	Sindole	Randy	MK	randys	139	Building 1	8/6/1984	$ 14.25	
14	1310	Smith	Ellen	MF	ellens	137	Building 1	10/4/1986	$ 11.50	

تصویر E-3.6: ورک شیٹ میں بھرا ہوا بنیادی ڈاٹا

تصویر E-3.7: ڈاٹا مینو

تصویر E-3.6 کی ورک شیٹ کو ناموں کی بڑھتی ہوئی (یعنی حروف کی) ترتیب میں چھانٹنے کے لیے ماؤس پوائنٹر سے رینج B1:E16 کو چن لیجیے۔ اس میں نمبر شمار (S.No.) کے کالم کو نہیں چنا گیا ہے، کیونکہ ان کا کسی شخص سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ دوسری طرف اگر آپ ایک شخص کا پورا مواد نہیں چنیں گے، تو ایکسل آپ کو وارننگ (Sort Warning) کا باکس دے کر پوچھے گا کہ سارا مواد شامل کرنا ہے کہ نہیں۔ صحیح مواد چن کر Home ٹیب کے Editing حصہ میں Sort & Filter بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر تصویر E-3.7 کی طرح پل-ڈاؤن مینو کھلے گا۔ اس میں Custom Sort آپشن پر کلک کیجیے۔ اس سے آپ کی اسکرین پر تصویر E-3.8 کی طرح 'Sort' کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔

اس ڈائیلاگ باکس میں چھانٹنے کی کنجیاں (Sort Keys) بتائی جاتی ہیں۔ آپ

زیادہ سے زیادہ تین کنجیاں بتا سکتے ہیں۔ ڈائیلاگ باکس کے دائیں کونے میں ایک چیک باکس ہوتا ہے، جس سے یہ بتایا جاتا ہے کہ آپ کی چنی ہوئی فہرست یا مواد میں سرخی قطار ہے یا نہیں۔ اگر آپ پہلے چیک- باکس 'My data has headers' کو سیٹ کرتے ہیں، تو چنی ہوئی پہلی قطار کو سرخی قطار مانا جاتا ہے اور اس میں بھرے ہوئے ڈاٹا کا استعمال سرخیوں کے طور پر کیا جاتا ہے، اس قطار کو چھانٹا نہیں جاتا۔ اس کے برعکس اگر آپ اسے چیک نہیں کرتے ہیں، تو پورے مواد کو چھانٹا جاتا ہے اور کنجیوں کی پہچان کے لیے کالم ناموں کا استعمال کیا جاتا ہے۔

یہاں ہم نے سرخی قطار دی ہے، اس لیے چیک- باکس کو سیٹ کیجیے۔ اس سے سرخی قطار میں بھرے نام با اثر ہو جائیں گے۔

چھانٹنے کی کنجی بتانے کے لیے 'Sort by' ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس کو کھولیے۔ اس لسٹ میں سبھی کالموں کی سرخیاں دی ہوتی ہیں۔ ہم فہرست کے ناموں کی حرفی ترتیب میں چھانٹنا چاہتے ہیں، اس لیے اس فہرست میں سے 'Name' کو کلک کیجیے۔ 'Sort on' ڈراپ ڈاؤن لسٹ باکس میں 'Values' اور 'Order' میں 'A to Z' کلک کیجیے۔

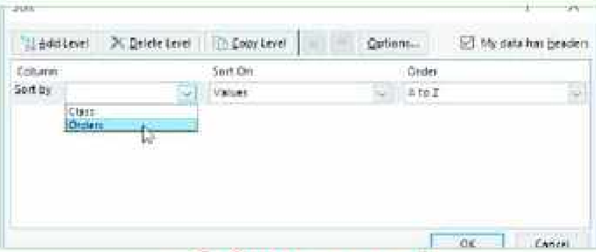

تصویر E-3.8: سارٹ کا ڈائیلاگ باکس

اس طرح چھانٹنے کی کنجی بتانے کے بعد 'OK' بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے وہ ڈائیلاگ باکس غائب ہو جائے گا اور پلک جھپکتے ہی پورا مواد ناموں کی ترتیب میں چھانٹ دیا جائے گا، جو کہ تصویر E-3.9 کی طرح نظر آئے گا۔

	A	B	C	D	E
1	Online Enrollment				
2	Program	Month Start	Name	Age	Student ID
3	Arts	January	Graham S.	18	ST348-250
4	Nursing	February	James M.	23	ST348-248
5	Arts	March	Nash S.	22	ST348-252
6	Drafting	April	Wilson J.	21	ST348-245
7	Business	May	Smith F.	26	ST348-251
8	Nursing	June	Russell W.	20	ST348-253
9	Drafting	August	Robitaille L.	19	ST348-254
10	Science	September	Wilson P.	19	ST348-246
11	Business	September	Thompson G.	26	ST348-247
12	Science	October	Peterson A.	37	ST348-249
13					
14					

Sheet1 Sheet2 Sheet3 Sheet4 Sheet5 Sheet6 Sheet7 Sheet8

تصویر E-3.9: ناموں کی حرفی ترتیب میں چھانٹنے کے بعد مواد

اب مان لیجیے کہ آپ مواد کو اسکیل کی گھٹتی ہوئی (Descending) اور پی ایف نمبر کی بڑھتی ہوئی (Ascending) ترتیب میں چھانٹنا چاہتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے پہلے اوپر بتائے گئے طریقے سے مواد کو چن لیجیے۔ پھر سارٹ کے ڈائیلاگ باکس (تصویر E-3.8) میں پہلی کنجی 'Sort by' کے لیے 'Scale' کو چن کر 'Order' کے Largest to Smallest آپشن کو چنیے۔ اب ڈائیلاگ باکس کے بائیں کونے میں دیے گئے Add Level بٹن کو کلک کیجیے۔ اس سے باکس میں ایک نیا لیول جڑ جائے گا۔ دوسرے لیول میں 'Then by' کے لیے P.F. No. کو چن کر 'Order' کے 'largest to Smallest' آپشن کو چنیے۔ ایسا کر کے 'OK' بٹن کلک کرتے ہی پورا مواد آپ کی بتائی ہوئی ترتیب میں چھانٹ دیا جائے گا اور آپ کی ورک شیٹ تصویر E-3.10 کی طرح دکھائی دے گی۔

	A	B	C	D
1	Last Name	First Name	House	Birthday Month
2	Malfoy	Abraxas	Slytherin	March
3	Pucey	Adrian	Slytherin	February
4	Spinnet	Alicia	Gryffindor	January
5	Kirke	Andrew	Gryffindor	July
6	Johnson	Angelina	Gryffindor	March
7	Goldstein	Anthony	Ravenclaw	November
8	Lestrange	Bellatrix	Slytherin	June
9	Zabini	Blaise	Slytherin	June
10	Diggory	Cedric	Hufflepuff	November
11	Chang	Cho	Ravenclaw	September
12	Creevey	Colin	Gryffindor	March
13	McLaggen	Cormac	Gryffindor	August
14	Thomas	Dean	Gryffindor	July
15	Robins	Demelza	Gryffindor	June
16	Creevey	Dennis	Gryffindor	July
17	Malfoy	Draco	Slytherin	June
18	Carmichael	Eddie	Ravenclaw	February
19	Branstone	Eleanor	Hufflepuff	May
20	Midgeon	Eloise	Hufflepuff	August
21	Macmillan	Ernie	Hufflepuff	July
22	Abercrombie	Euan	Gryffindor	August
23	Flitwick	Filius	Ravenclaw	August
24	Weasley	Fred	Gryffindor	September
25	Pritchard	Graham	Slytherin	May

تصویر E-3.10: اسکیل گھٹتی ہوئی اور پی ایف نمبر کی بڑھتی ہوئی ترتیب میں چھانٹا ہوا مواد

اگر کبھی بھی آپ چھانٹنے کے نتائج سے مطمئن نہ ہوں یا کنجی سیٹ کرنے میں کوئی غلط ہو جائے، تو اسی وقت 'Undo' ہدایت دے کر اپنی ورک شیٹ کو چھانٹنے سے پہلے کی حالت میں لا سکتے ہیں۔ غلط مواد چننے سے کبھی کبھی اطلاعات منتشر اور خراب ہو جاتی ہیں۔ اس لیے سب سے اچھا یہ ہے کہ 'Sort' ہدایت دینے سے قبل آپ ورک شیٹ کو محفوظ (Save) کر لیجیے۔ اس سے اگر کوئی غلطی ہوگئی، تو آپ بغیر 'Save' کیے ورک شیٹ کو بند کر سکتے ہیں اور دوبارہ کھول کر پورے ڈاٹا کو بنیادی شکل میں لا سکتے ہیں۔

بیچ میں قطار ڈالنا (Inserting Rows)

ورک شیٹ میں کہیں بھی نئی قطار ڈالنا بہت آسان ہے۔ جہاں آپ قطار ڈالنا چاہتے ہیں، پہلے اس کے نمبر شمار کو کلک کر کے اسے چن لیجیے۔ جیسے، اگر قطار 5 کی جگہ خالی قطار ڈالنی ہے، تو 5 کو کلک کیجیے۔ اب Home ٹیب کے Cells حصہ میں Insert بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے ایک پل- ڈاؤن مینو تصویر E-3.11 کی طرح کھلے گا۔ اس مینو میں Insert Sheet Rows ہدایت دیجیے۔ اس سے اس جگہ پر ایک خالی قطار جوڑ دی جائے گی اور اس نقطہ سے آگے کی سبھی قطاروں میں بھرے مواد کو ایک ایک قطار آگے (یعنی نیچے کی طرف) سرکا دیا جائے گا۔

مثال کے طور پر، اگر آپ نے تصویر E-3.10 کی ورک شیٹ میں قطار 5 کی جگہ پر ایک نئی قطار ڈالی ہے، تو قطار 5 کا ڈاٹا قطار 6 میں، قطار 6 کا ڈاٹا قطار 7 میں اور اسی طرح آگے کی قطاروں کا ڈاٹا بھی سرکا دیا جائے گا، جیسا کہ تصویر E-3.12 میں دکھایا گیا ہے۔ اس طرح سرکائی گئی قطاروں میں بھرے فارمولوں کو بھی نئی جگہ کے مطابق درست کر دیا جاتا ہے۔ پھر بھی آپ کو اپنے فارمولے کی جانچ کر لینی چاہیے۔

ایک ساتھ کئی قطاروں کو چن کر آپ ایک ساتھ کئی خالی قطاریں بھی بیچ میں ڈال سکتے ہیں۔

(جاری)

■

بہ شکریہ:
ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8/ آفس 2007)
سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ و تعارف

ارباب نثر اردو

مصنف: سید محمد، مرتب: رحیل صدیقی

صفحات: 247، قیمت: 135 روپے، دوسری طباعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: وسیم مینائی، تارین جلال نگر، شاہجہاں پور۔ 242001 (یوپی)

سید محمد کی تصنیف 'ارباب نثر اردو' فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نگاروں کا تحقیقی و تنقیدی تذکرہ ہے۔ یہ کتاب 1927 میں شائع ہوئی تھی۔ ایک دہائی کے وقفے سے دوسری بار یہ کتاب 1937 میں پھر طباعت کے مرحلے سے گزری۔ اس کتاب کے مرتب رحیل صدیقی کا دعویٰ ہے کہ جو کتاب مصنف کی نگرانی میں دوبارہ شائع ہوئی ہے وہ اغلاط سے قدرے پاک ہے جبکہ پہلے ایڈیشن میں بے شمار غلطیاں ہیں۔ غالباً عجلت سے منظر عام پر لانے کی وجہ سے ڈھیروں غلطیاں راہ پاگئیں۔ چنانچہ رحیل صدیقی نے 1937 کی اشاعت کو اصل مان کر 1950 اور 1977 کے دوسرے ایڈیشن کو سامنے رکھ کر تدوین متن اور دیگر تاریخی اغلاط کو دور کرکے 2011 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع کرایا۔ پھر جلد ہی دوسرا ایڈیشن 2019 میں اسی ادارہ کی سرپرستی میں شائع ہوا۔ اس وقت 2019 کی مطبوعہ 'ارباب نثر اردو' میرے سامنے ہے۔

فہرست عنوانات سے قبل شیخ عقیل احمد کا ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل پیش لفظ ہے جس میں آج کے ڈیجیٹل ٹکنالوجی کے عہد میں مطبوعہ کتابوں کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔ اردو زبان و ادب کی خدمات اور کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی ناقابل فراموش خدمات کا تذکرہ ہے۔ اس ادارہ کے ذریعہ ای لائبریری اور ای کتاب کی روش کو بڑے فخریہ انداز میں قلم بند کیا گیا ہے۔ مرتب کتاب رحیل صدیقی نے اپنا طویل مقدمہ لکھا ہے جس میں سید محمد حیدرآبادی (28 مارچ 1906 تا 30 اگست 1974) کے مذکورہ کارنامہ 'ارباب نثر اردو' پر خصوصی روشنی ڈالی ہے اور مصنف کتاب کے حالات زندگی اور دیگر مطبوعات کا بھی ذکر کیا ہے۔ رحیل صدیقی نے پچھلی اشاعتی اغلاط گنواتے ہوئے ان کی اصلاح کی اہمیت کو بیان کیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کی بنیاد گزاری اور انگریزوں کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان پر مختصر تاریخی تبصرہ کیا ہے۔ اس کالج میں باقاعدہ تقرریاں ہوئی تھیں اور ان کی تنخواہیں مقرر تھیں۔ کس کی کتنی تنخواہ اور کیا عہدہ تھا کئی صفحات میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف ان مصنفوں کا ذکر ہے جنھوں نے اس کتاب سے استفادہ کیا تھا تو دوسری جانب مرتب کتاب نے جن کتابوں کو ماخذ و منابع گردانا ہے ان کی فہرست ہے، سید عبداللطیف کا 1927 کا مرقومہ پیش نامہ بھی شامل کتاب ہے اور ان ہی مشمولات میں مصنف کتاب کا دیباچہ بھی ہے۔

فورٹ ولیم کالج سے پہلے اردو نثر کی صورت حال کیا تھی اسی موضوع کو سامنے رکھ کر کتاب کی شروعات کی گئی ہے حالانکہ یہ عنوان جس قدر تفصیل طلب تھا اتنی ہی تشنگی کا شکار رہا۔ مصنف نے اس پر خاص توجہ نہیں دی۔ شاید ان کا مقصد فورٹ ولیم کالج کے ان قلمکاروں کی سوانح حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالنا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں اردو کی جو حالت تھی اس پر بہت زیادہ اطلاعات فراہم نہیں ہوئیں ایسی صورت میں اہل قلم حضرات کو اطلاعات بہم پہنچانے کے لیے ٹھوس قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے سلسلے میں جو تاریخی دستاویزات پیش ہوئے ہیں وہ بھی ناکافی ہیں۔ غرض مذکورہ دونوں عنوانات پر سیر حاصل بیانات نہیں ہیں۔

لارڈ ویلزلی اور ڈاکٹر گلکرسٹ کے تدبر اور مصلحت شناسی کا نتیجہ تھا کہ اس کالج کا قیام عمل میں آیا، وہ دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ اردو ہی وہ زبان تھی جو ہندوستان کے بیشتر حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی، فارسی روبہ زوال تھی لہٰذا اردو کا سیکھنا حکومت اور تجارت دونوں کے لیے لازم تھا چنانچہ ہندوستان بھر سے نامور اہل قلم کی اس کالج میں تقرری کی گئی اور ان سے بڑا کام لیا گیا۔ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انگریزوں کی اس مہم سے اردو کی زبردست آبیاری ہوئی، یہ احسان اردو زبان و ادب پر ہمیشہ رہے گا۔ اردو ادب میں اس پہلے اتنی فراخ دلی اور خلوص سے کبھی کام نہیں ہوا تھا۔ داستان جیسی صنف ادب میں تو شاید بعد میں بھی اتنا عمدہ کام نہ ہوا۔ بہرکیف نثر اردو کے بلند حضرات نے اپنی فکری اور قلمی جادوگری کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

ڈاکٹر گلکرسٹ خود اردو کے ماہرین میں سے تھے ان کے ساتھ دیگر انگریز حاکموں اور منصب داروں نے اردو زبان کو اپنایا اور محض بول چال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اردو زبان میں اپنی صلاحیتوں کا نمونہ پیش کیا۔ کپتان ٹامس روبک اور جوزف ٹیلر کا نام بھی فورٹ ولیم کالج کے اہل قلم حضرات کی شکل میں اس کتاب میں محترم مانا گیا ہے۔ گلکرسٹ کے بعد کپتان ٹامس روبک کا نام اردو کی رہنمائی کے ضمن میں آتا ہے۔ مصنف کتاب رقمطراز ہیں:

''ڈاکٹر گلکرسٹ کے بعد کپتان ٹامس روبک نے اردو اہل قلم کی سب سے زیادہ سرپرستی کی...... ڈاکٹر گلکرسٹ کے فیض صحبت سے ان میں اردو کا بہت اعلیٰ ذوق پیدا

ہو گیا تھا وہ فورٹ ولیم کالج کے معتمد اور ممتحن مقرر ہوئے۔'' (ص 22)

اسی طرح کپتان ٹیلر بھی اردو کے زبردست دلدادہ تھے۔ ان دونوں انگریزوں کے نام اردو انگریزی لغات ہیں جبکہ ایک اردو لغت ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے بھی مرتب کی تھی۔ ان کے بعد میر امن، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، میر بہادر علی حسینی، نہال چند لاہوری، منشی بینی نارائن جہاں جیسے کم و بیش ڈیڑھ درجن نثر نگاروں کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف و تراجم کو اردو نثر کا ایک گرانقدر سرمایہ گردانتے ہوئے ناقدانہ روش کے سہارے مفصل بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح مصنف نے مغربی تنقید کی تقلید کرتے ہوئے ایک محترم کارنامہ انجام دیا ہے۔ واضح کردوں کہ اس کالج سے منسلک 100 سے زائد مؤلفین و مترجمین تھے۔ ظاہر ہے کہ سبھی پر تفصیل سے لکھنا ایک کتاب میں ممکن نہیں۔ لہٰذا معروف مؤلفین و مترجمین کا مفصل ذکر اور بقیہ کے اسمائے گرامی کتاب کے اخیر میں گنوائے ہیں۔

مصنف کتاب سید محمد نے پوری بحث جو فورٹ ولیم کالج کی خدمات، ارباب قلم کے حالات زندگی اور اردو کی پیش رفت کا خلاصہ اور نتیجہ اخذ کرتے ہوئے چند صفحات پر 'نظر بازگشت' کے عنوان سے پیش کی ہے۔ یقیناً اس حصہ میں فورٹ ولیم کالج کی ارزش و اہمیت کا صحیح معنوں میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے مذکورہ کالج کے مؤلفین اور ان کی تالیفات کو جداگانہ گنوایا ہے۔ حواشی کو سب سے اخیر میں جگہ دی ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ بعد کے محققین و ناقدین نے اس کتاب کو فورٹ ولیم کالج اور اس کی ادبی خدمات سے متعلق ماخذ مانا ہے اور اس سے حد درجہ استفادہ کیا ہے۔ استناد و اعتبار میں شبہات کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ زبان و بیان نہایت سادہ و سلیس ہے۔ پرتکلف اور گنجلک ترکیبات کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ یہ کتاب ہر اردو دوست کے لیے معاون ہے خاص طور پر ان طالبعلموں کو ضرور مطالعہ میں لانا چاہیے جن کے نصاب میں فورٹ ولیم کالج اور اس کی ادبی خدمات کا حصہ شامل ہو۔

کلیم عاجز (مونوگراف)

مصنف: جاوید عبدالعزیز

صفحات: 124، قیمت: 80 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عبدالباری قاسمی، بی۔ 145/1 گراؤنڈ فلور طیب لین شاہین باغ جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی۔ 110025

بیسویں صدی میں اردو غزل کو منفرد اسلوب اور آہنگ عطا کرنے والوں میں ایک اہم نام ڈاکٹر کلیم عاجز کا بھی ہے، کلیم عاجز بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی وجہ سے ہی انہوں نے برصغیر میں ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر اپنی شناخت قائم کی اور یورپی ممالک کا بھی سفر کیا، مگر انہوں نے اردو شاعری کے اکثر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے، خاص طور پر ان کی نظمیں بہت عمدہ ہیں، بیسویں صدی میں میر کے لب و لہجہ اور انداز بیان کو زندہ کیا اس وجہ سے ان کو میر ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ عاجز لفظیات کے انتخاب اور تشبیہات و استعارات کے استعمال میں ایسی مہارت رکھتے ہیں کہ ان کا اسلوب اور طرز بیان ایسا مختلف ہو جاتا ہے کہ اپنے تمام معاصرین میں سب سے ممتاز نظر آتے ہیں۔

اسی طرح نثر میں بھی ان کا جواب نہیں ہے سوانح نگاری، خاکہ نگاری، سفرنامہ نگاری اور مکتوب نگاری میں بھی انہوں نے الگ شناخت قائم کی اور ایسا اسلوب اختیار کیا ہے کہ اگر وہ شاعری نہیں بھی کرتے تو ادبی دنیا میں ان کا تعارف کرانے اور انہیں زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے ان کی نثر ہی کافی ہوتی۔

زیر تبصرہ مونوگراف کلیم عاجز جاوید عبدالعزیز نے تحریر کیا ہے، اس کی فہرست دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف کی نگاہ عاجز کی شخصیت اور فن کے ہر پہلو پر ہے اور بہت گہرائی سے کلیم عاجز کا مطالعہ کیا ہے، اس لیے اس مونوگراف میں کلیم عاجز کے فکر و فن کے تمام گوشوں کا مختصر انداز میں تعارف کرانے کی کوشش کی ہے اور اس انداز سے مواد کو سمیٹا ہے کہ بلا جھجک ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاوید عبدالعزیز دریا کو کوزے میں سمونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

مذکورہ مونوگراف تین حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ کا عنوان شخصیت اور سوانح ہے، اس میں خاندانی ماحول، پس منظر، تعلیم و تربیت اور حالات زندگی کو بیان کیا گیا ہے، دوسرا حصہ ادبی و تخلیقی سفر کے نام سے معنون ہے، اس میں ابتدا میں ان کا شعری اور تخلیقی پس منظر اور اسباب کو بیان کیا ہے اس کے بعد ان کی تصانیف اور شعری مجموعوں کا تعارف کرایا گیا ہے جن میں بطور خاص 'وہ جو شاعری کا سبب ہوا'، 'جب فصل بہاراں آئی تھی'، 'یہاں سے کعبہ اور کعبہ سے مدینہ (سفرنامہ حج)'، 'ایک دیس اک بدیسی'، 'جہاں خوشبو ہی خوشبو تھی'، 'ابھی سن لو مجھ سے'، 'دیوانے دو'، 'دفتر گم گشتہ'، 'کوچہ جاناں جاناں'، 'پہلو نہ دکھے گا'، 'میری زبان اور میرا قلم (جلد اول اور جلد دوم)'، 'پھر ایسا نظارہ نہیں ہوگا'، 'مجلس ادب' اور 'ہاں چھیڑو غزل عاجز' شامل ہیں۔

اس کے بعد اس حصہ کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے کلیم عاجز: بحیثیت شاعر اور کلیم عاجز: بحیثیت نثر نگار، پہلے زمرے میں عاجز کی شاعری کا تعارف، امتیازات، خصوصیات اور موضوعات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کے متعلق ان کے کیا خیالات ہیں اور دیگر ناقدین نے ان کے کلام پر کیا کیا تبصرے کیے ہیں مختصر انداز میں پیش کیا ہے جبکہ دوسرے میں نثر نگاری کا تعارف کراتے ہوئے سفرنامہ، خاکہ، مکتوب نگاری اور تنقید نگاری وغیرہ کو بیان کیا ہے اور نثری اسلوب کا تعارف کرایا ہے اور بطور مثال متعدد کتابوں سے چند اقتباسات پیش کیے ہیں جس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ کس کتاب میں کلیم عاجز نے کس طرح کا اسلوب اختیار کیا ہے اور ان کے موضوعات کیا ہیں۔ مونوگراف کے تیسرے حصہ میں کلیم عاجز کے منتخب کلام کو پیش کیا گیا ہے، اس میں کلیم عاجز کی منتخب غزلیں، نظمیں، نعت اور مرثیہ وغیرہ شامل ہیں۔

یہ مونوگراف کلیم عاجز کی شخصیت اور فن کو سمجھنے کے لیے بہت ہی اہم ہے، طباعت بھی بہت عمدہ ہے اور اس لحاظ سے قیمت بھی مناسب ہے، امید ہے کہ قارئین پسند کریں گے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی- 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

اوراق پارینہ

مصنف: محمد انوار الحق تبسم

صفحات: 228، قیمت: 126 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: محمد حسین، روم نمبر 312، کاویری ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

اوراق پارینہ، انوار الحق تبسم صاحب کے تحقیقی، علمی، ادبی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ انوار الحق تبسم کا تعلق بنیادی طور پر تاریخ سے ہے۔ پٹنہ یونی ورسٹی میں انھوں نے سید حسن عسکری جیسے عظیم تاریخ داں پروفیسر کی شاگردی میں تاریخ کا علم حاصل کیا۔ اب پٹنہ یونیورسٹی سے شعبہ تاریخ کے صدر کی حیثیت سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ علاقائی تاریخ، ادب، ثقافت، فن تعمیرات وغیرہ پر ان کی گہری نظر ہے اس لیے ان موضوعات پر ریسرچ کرتے رہتے ہیں اور انھیں ہسٹری کانگریس اور بہار آرکائیوز اور دیگر یونی ورسٹیوں کے سمینار وغیرہ میں پیش بھی کرتے رہے ہیں۔ انوار الحق تبسم تاریخ سے متعلق دستاویزی کاموں میں مصروف رہے ہیں۔ تاریخ سے متعلق ان کے تحقیقی مضامین گورنمنٹ آف بہار اور گورنمنٹ آف انڈیا کے متعدد دستاویزی پراجیکٹ میں شامل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب اوراق پارینہ 11 تحقیقی، علمی، ادبی مضامین پر مشتمل ہے۔ ہر مضمون اپنے قاری کو دعوت مطالعہ دیتا ہے۔ پہلا مضمون 'پورنیہ کی تاریخ وثقافت: صدیوں کے آئینے میں' ہے جو بے حد تحقیقی اور نادر کام ہے۔ کیونکہ مین اسٹریم کی تاریخ پر ہر زبان میں ایک سے ایک مضامین اور تحقیقی کتابیں دستیاب ہیں لیکن ہندوستان کے دور افتادہ خطوں کی تاریخ پر بہت کم تحقیقی مواد ملتا ہے۔ ایسے میں انوار الحق صاحب کا یہ مضمون تاریخ نویسوں کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرنے جیسا ہے۔ یہ مضمون دراصل بہار آرکائیوز میں دیے گئے ایک لیکچر کا اردو ترجمہ ہے۔ پورنیہ ہندوستان کے صوبہ بہار کے شمال مشرقی خطے میں واقع ہے۔ واضح رہے کہ پورنیہ اب محض ایک ضلع کو کہا جاتا ہے لیکن وسطی ہندوستان میں پورنیہ سرکار، کشن گنج، ارریہ، کٹیہار اور پورنیہ ضلع پر مشتمل تھا بلکہ قدیم عہد میں بنگال اور نیپال کے ترائی خطے بھی پورنیہ کے حصے تھے۔ اس مضمون میں پورنیہ کی وجہ تسمیہ سے لے کر عہد بہ عہد پورنیہ کی تاریخ پیش کی گئی ہے۔ پورنیہ کی وجہ تسمیہ کے بیان میں انھوں نے انکشاف کیا ہے کہ پورنیہ سنسکرت لفظ پورن +انیہ سے بنا ہے۔ لیکن انھوں نے اس کے معنی پر روشنی نہیں ڈالی۔ بس لفظ کے ماخذ اصلی سے بحث کی۔ مناسب ہوتا کہ سنسکرت کے جن الفاظ کی ترکیب سے پورنیہ بنا ہے ان کے معنی کی بھی وضاحت کر دیتے۔ بہرحال یہ بے حد تحقیقی مضمون ہے میرا خیال ہے کہ اردو میں شاید یہ پہلا ایسا تحقیقی کام ہوگا۔ انوار الحق صاحب سے قبل شاید ہی کسی مورخ نے اس مبسوط اور تفصیلی انداز میں تحقیق سے اس موضوع پر توجہ دی ہوگی۔ مصنف نے یہ بھی وضاحت کی ہے کہ انھوں نے پورنیہ کی تاریخ سے متعلق تقریباً 10 مضامین لکھے ہیں جو گورنمنٹ آف بہار کے مختلف ریسرچ جرنل میں شائع ہو چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان تمام مضامین کو یکجا کر دیا جائے تو پورنیہ کی تاریخ پر ایک بیش قیمت مستقل تاریخی کتاب منظر عام پر آجائے گی۔ البیرونی کی تحقیق ماللہند پر انھوں نے ایک تفصیلی تنقیدی مضمون لکھا ہے جو تقریباً 35 صفحات پر مشتمل ہے۔ تاریخ اور ثقافت سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیے۔ امیر خسرو: کثیر الجہت ہندوستانی ثقافت کا استعارہ' بھی بے حد اہم اور خاص مضمون ہے۔ جسے انوار الحق صاحب نے اردو کے کسی عام مضمون نگار کی طرح نہیں بلکہ مؤرخ کی طرح تحقیقی حوالہ جات کے ساتھ لکھا ہے۔ عہد وسطی کے ہندوستان کی تاریخ سے اگر آپ کا تعلق ہے تو فارسی زبان کے مخطوطے اور فن تعمیرات سے بھی واقفیت لازمی ہے۔ انوار الحق صاحب ان دونوں میدانوں میں بھی دسترس رکھتے ہیں اس لیے ان کے تحقیقی قلم سے 'عہد مغلیہ کی تعمیرات: ایک جائزہ' جیسا تحقیقی اور تاریخی مضمون بھی نکلتا ہے۔ امیر خسرو کی شخصیت کے علاوہ انھوں نے غالب کی اردو نثر پر بھی ایک پر مغز مضمون لکھا ہے۔ علاوہ ازیں ان کی زندگی پر اثر انداز ہونے والی چند نمایاں شخصیات پر بھی انھوں نے مضامین لکھے ہیں مثلاً اپنے استاد سید حسن عسکری، اپنے نگراں پروفیسر قیام الدین احمد اور یوگیندر مشرا پر بھی سوانحی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخصیات واقعی صوبہ بہار کے لیے ہی نہیں بلکہ وطن عزیز کے لیے سرمایہ افتخار تھیں۔ سید حسن عسکری اور قیام الدین صاحبان نے مل کر 'جامع تاریخ بہار' جلد دوم قرون وسطی بہار کو دو حصوں میں ترتیب دینے کا اہم کام کیا ہے۔ پروفیسر قیام الدین احمد کی اہم اور مشہور کتاب 'دی وہابی موومنٹ ان انڈیا' ہے۔ وہابی موومنٹ کے حوالے سے یہ کتاب سند کی حیثیت رکھتی ہے اس لیے انوار الحق صاحب کے بقول یہ کتاب دنیا کی 50 یونیورسٹیوں میں شامل نصاب ہے۔ ان مضامین کے علاوہ جدوجہد آزادی میں علمائے صادق پور کا کردار اور 1857 کی لڑائی میں پیر علی شہید کے کردار پر بھی بے حد اہم اور نادر مضمون شامل کتاب ہے۔ کتاب بے حد تحقیقی اور علمی ہے۔ اس طرح کے موضوعات پر اردو میں کتابیں کم ہی لکھی جاتی ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ تاریخ اور ثقافت پر تحقیقی کتابوں پر غیر ملکی زبانوں کا ہی کاپی رائٹ ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ایسے میں اردو میں اس طرح کے تاریخی تحقیق پر مبنی مضامین سے لیس کتابیں اردو زبان کے علمی سرمایے میں اضافے کا حق ادا کرتی ہیں۔ ورنہ خانہ پری کے لیے تو ہر دن نئی کتاب شائع ہوتی رہتی ہے۔ اردو میں ایسی کتابوں کا استقبال کیا جانا چاہیے۔

شعر کے پردے میں

مصنف: محمد دانش غنی

صفحات: 240، قیمت: 148 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: شعبۂ اردو، گوگٹے جوگلے کر کالج، رتنا گری

مبصر: ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، کل گاؤں، ایوت محل

'شعر کے پردے میں' محمد دانش کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس میں صوبہ مہاراشٹر کے اکثر اور ملکی سطح کے بعض شعرا کے کلام کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے قبل ان کی ایک کتاب 'رنگ و آہنگ' کے عنوان سے بھی منظر عام پر آچکی ہے۔ ان دونوں کتابوں میں شامل مضامین کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ دانش کا مطالعہ وسیع اور پڑھنے کا ذوق عمدہ ہے۔

زیر نظر کتاب 'شعر کے پردے میں' میں مختلف اوقات میں لکھے گئے اور مختلف مذاکروں کے لیے تیار کیے ہوئے ان کے مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں۔ ان تمام مشمولات کا موضوع 'شاعری' ہے اس لیے مصنف نے اس کا نام 'شعر کے پردے میں' رکھا ہے۔ کتاب کے مشمولات کی توضیح، کتاب کے عنوان سے کر دینا، براعت استہلال کی اچھی مثال ہے۔ دانش اپنے پیش رو ادبا و شعرا کے ساتھ اپنے معاصرین کی تخلیقات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے رفقا اور گذشتہ صدی کے آخری عشرے میں ابھرنے والے شعرا پر دل جمعی کے ساتھ لکھا ہے۔ سادہ اور عام فہم زبان میں وہ اپنی بات پیش کرتے ہیں اور گنجلک زبان اور پیچیدہ عبارت آرائی سے مجتنب رہتے ہیں۔ بشر نواز،

غنی اعجاز، ظفر کلیم، ساحر شیوی اور نذیر فتح پوری پر لکھے گئے ان کے مضامین اس ضمن میں بطور مثال پیش کیے جاسکتے ہیں۔

محمد دانش غنی بڑی متانت و سنجیدگی کے ساتھ اپنے ناقدانہ تاثرات پیش کرتے ہیں اور اپنے مضامین کے ذریعے تاثراتی تنقید سے اپنا قلمی رشتہ قائم کرلیتے ہیں۔ انکساری اور عجز کے سائے میں ان کا قلم سبک روی سے اپنا سفر طے کرتا ہے اور گرد راہ پر اپنے قدموں کے نشان ثبت کرتا چلا جاتا ہے۔ دانش میدانِ نقد و تحقیق میں نو وارد ہیں۔ عجلت پسندی سے اجتناب برتیں اور اپنی تخلیقات پر سخت تنقیدی نظر ڈالتے رہیں تو وہ مستقبل قریب کے اچھے ناقد اور محقق بن کر ابھر سکتے ہیں۔

میں نے پہلے ہی عرض کیا ہے کہ 'شعر کے پردے میں' کے تمام مضامین شاعری سے متعلق ہیں اس لیے یہاں محمد دانش غنی کا وطیرۂ نقد و نظر اس طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جس شاعر اور اس کے کلام کو موضوعِ نقد بناتے ہیں اس میں کوئی نہ کوئی امتیازی پہلو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اسے دوسرے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔ پھر وہ اس محورِ فکر اور مرکزِ نگاہ سے اپنے طائرِ خیال کو ادھر ادھر بھٹکنے کی آزادی عطا نہیں کرتے۔ اس طرح وہ اپنے ایک مخصوص دائرے کا تعین کرلیتے ہیں اور انتشار کی کیفیت سے اپنے تاثرات کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی وطیرۂ خاص کے تحت انھوں نے خضر ناگپوری، شکیب غوثی، شریف احمد شریف، حیدر بیابانی، سعید کنول وغیرہ کی فکری و فنی خصوصیات کو نمایاں اور ان کے امتیازات کو روشن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

دانش میں اتنی استعداد ہے کہ وہ خود اپنی آرا حتمی طور پر پیش کرسکتے ہیں۔ جگر اور حسرت کے مضامین میں ان کی یہ اہلیت نمایاں ہے۔ انھوں نے نہایت خلوص و انہماک کے ساتھ اپنے موضوعات کا مطالعہ کیا ہے اور تحفظات کی تنگنائے سے آزاد و بلند ہوکر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔

رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد دوم)

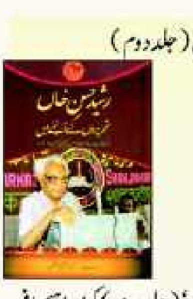

مرتب: ابراہیم افسر

قیمت: 315 روپے، صفحات: 606، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: کتابی دنیا، ترکمان گیٹ، دہلی، 110006

مبصر: ڈاکٹر ظفر عالم

الف 41، فلیٹ نمبر 202، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں' (جلد دوم) کو ابراہیم افسر نے عرق ریزی اور جاں فشانی کے ساتھ ترتیب دیا ہے۔ رشید حسن خاں جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کے ادبی کارنامے اتنے وقیع ہیں کہ ان پر لکھنا اپنے آپ میں بڑی بات ہے۔ اُردو ادب میں قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پروفیسر حنیف نقوی، گیان چند جین وغیرہ کے بعد ان کا نام ادب و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں ابراہیم افسر نے رشید حسن خاں کی تحقیقی، تدوینی اور تنقیدی کاوشوں کو منظرِ عام پر لانے کا بیڑا اُٹھایا ہوا ہے۔ ان کی انتھک کاوشوں کی وجہ سے رشید حسن خاں سے متعلق اصحابِ قلم کی نادر و نایاب تحریریں پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ ابراہیم افسر نے 'رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں (جلد اول)'، 'رشید حسن خاں کے انٹرویوز' اور 'نیر مسعود بہ نام رشید حسن خاں' میں بھی رشید حسن خاں سے متعلق تحقیقی و تنقیدی بحث کے نئے باب وا کیے ہیں۔

مذکورہ کتاب میں 54 مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ تحقیق اور دوسرا تدوین پر مبنی ہے۔ پہلے حصے (تحقیق) میں اکبر علی خاں، گیان چند جین، پروفیسر رفیع الدین ہاشمی، ارشد محمود ناشاد، پروفیسر شارب ردولوی، تنویر احمد علوی، پروفیسر مجاور حسین رضوی، انتظار حسین، پروفیسر حنیف نقوی، ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، فخر الاسلام اعظمی، محمد الیاس الاعظمی، سید منظور احمد، رفاقت علی شاہد، وقار ناصری، ڈاکٹر خالد حسین خاں، ڈاکٹر ظفر کمالی، انوار الحسن وسطوی، ، ڈاکٹر قمر صدیقی، ڈاکٹر محمد سعید، صائمہ سعید کے مضامین شامل ہیں۔

کتاب کی ابتدا میں ابراہیم افسر کا 47 صفحات پر مشتمل مربوط و مبسوط مقدمہ شامل ہے، جس میں موصوف نے رشید حسن خاں کی حیات و تخلیقات سے متعلق مختلف گوشوں کی نشان دہی کی ہے۔ 'کچھ اپنے بارے میں' کے عنوان سے شامل مضمون میں رشید حسن خاں کی زبانی ان کی زندگی کی ترجمانی پیش کی گئی ہے۔ 'حیات نامہ رشید حسن خاں' ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد کا معروضی انداز میں تحریر کیا گیا مضمون ہے۔ جس میں ان کے مکمل اور نامکمل منصوبوں بالخصوص 'فرہنگ' 'غرائب اللغات'، 'گنجینۂ معنی کا طلسم' 'لفظیاتِ غالب'، اور 'قصائد سودا تدوین مقدمہ' کا ذکر کیا گیا ہے۔

کتاب کا دوسرا حصہ تدوین پر مشتمل ہے، اس میں جن اصحابِ قلم کے مضامین شامل کتاب ہیں ان میں نیر مسعود، نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر فیروز احمد، عبدالحق، لطیف صدیقی، گیان چند جین، شان الحق حقی، سید محمد عقیل، ڈاکٹر گوہر نوشاہی، شمیم حنفی، فضیل جعفری، ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر فوزیہ بانو، ڈاکٹر عادل احسان، ڈاکٹر ظفر عالم، ڈاکٹر شمیم طارق، ناصحہ عثمانی، محمد شہزاد اختر بیگ، ڈاکٹر محمد رمضان اور شازیہ پروین کے اسما قابلِ ذکر ہیں۔

مبارکباد کے مستحق ہیں ابراہیم افسر جنھوں نے رشید حسن خاں کی خدمات تمام پہلوؤں سے قارئین کو روشناس کرایا۔ کتاب کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ طباعت عمدہ اور کاغذ اعلیٰ کوالٹی کا ہے۔

وہ ایک کہانی

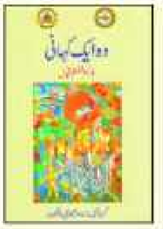

مصنف: ڈاکٹر غضنفر اقبال

صفحات: 320، قیمت: 300 روپے

ناشر: کرناٹک اردو اکادمی بنگلور

مبصر: ڈاکٹر تسنیم بانو، ملکہ گنج، دہلی

فکشن کے اہم تنقید نگار ڈاکٹر غضنفر اقبال سہروردی کا شمار عہد حاضر کے معتبر قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے ادبی اظہار کے لیے تجزیاتی اور تنقیدی ادب کو اولیت دی ہے۔ یوں تو وہ درس و تدریس سے وابستہ ہیں لیکن ان کی مختلف موضوعات پر تقریباً تیرہ کتابیں شائع ہوکر مقبولِ عام ہوچکی ہیں۔ ان کی تحریریں افسانوی تنقید، خاکے، مونوگراف، مضامین، تبصرے اور نظم جیسے موضوعات پر مشتمل ہیں نیز انگریزی زبان میں بھی اہم تصنیف ہے جو گلوبل انفارمیشن پر مبنی ہے۔ انھیں متعدد اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ جن میں مرکزی ساہتیہ اکادمی یوا پرسکار اور اتر پردیش اردو اکادمی جیسے اہم انعامات واعزازات شامل ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'وہ ایک کہانی' یہ اردو فکشن کی تنقید پر مبنی ہے۔ جو پانچ ابواب پر محیط ہے۔ اس کے آغاز 'اپنی پہچان میں' میں ڈاکٹر غضنفر اقبال کا تعارف نور الحسنین نے منفرد انداز میں کیا ہے جس بنا پر کتاب میں دلچسپی پیدا ہوگئی ہے آغاز اسقدر منفرد انداز میں ہوا ہے کہ قاری کو اختتام تک اپنے سحر میں گرفتار رکھتی ہے اور اس طرح ایک ایک کر کے اس تصنیف سے متعلق معلومات فراہم ہوتی رہتی ہیں۔ اول اس کے عنوان 'لکیر در لکیر'، 'سلسلہ در سلسلہ'، 'پیچ در پیچ'، 'دائرہ در دائرہ' اور 'پردہ در پردہ' کے نام سے درج ہیں۔

تصنیف کے ابواب کا عنوان دلکش اور منفرد انداز میں تحریر کیا گیا ہے۔ 'لکیر در لکیر' میں کل چودہ مقالات ہیں جن کے عنوانات 'اک افسانہ بن گئی روشنی'، 'وہ ایک کہانی'، 'علی گڑھ تحریک اور افسانوی ادب'، 'جدید افسانے کی کہانی'، 'اردو افسانوں میں قومی یکجہتی کے عناصر'، 'اردو فکشن: اخلاقی اقدار کی روشنی میں'، 'عصری افسانہ سماجی اور تہذیبی منظر نامہ'، 'نئے افسانے کی تشکیلی شناخت'، 'نئے اردو افسانے کا اظہاریہ'، 'افسانے میں مضمر زبان کی ترقی'، 'ناول تنقید: ایک ناتمام مطالعہ'، 'گلبرگہ میں اردو افسانچہ'، 'افسانچے کے ہفت رنگ' اور 'بچوں کی کہانیاں' ہیں۔ 'علی گڑھ تحریک اور افسانوی ادب' میں علی گڑھ تحریک کے نکات و رموز کے ساتھ اس دور کے اور وہاں سے وابستہ تخلیق کاروں کی تحریروں کے پیش نظر گفتگو کی گئی ہے۔ جس میں سرسید احمد خاں کا گزرا ہوا زمانہ، نذیر احمد اور راشد الخیری کی اصلاحی کہانیاں، حالی کی تخلیقات، عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناول کی روشنی میں تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔ نیز علی گڑھ تحریک نے اردو فکشن کی عمارت کو اصلاحی فکشن کی جو بلندی بخشی ہے اس کو مدلل انداز میں بیان کیا گیا ہے جس کا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس دور کے ادیبوں نے جو اپنے تجربات کے زیر اثر اصلاحی اور اخلاقی فکشن کو ترقی دی ہے وہ نظروں کے سامنے آ گئی ہے۔ 'جدید افسانے کی کہانی' میں جدید اور کلاسیکی افسانے پر مختصر امدلل انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختر یوسف کی علامت نگاری کی اہمیت، مظہر الزماں خاں کے یہاں عصری مسائل کی کارفرمائی، قمر احسن کے یہاں سفید پوش ظالم کی بربریت، اخلاق سرخیل کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ انور خاں کے افسانوں میں سماجی زندگی کی عکاسی کو پیش کیا گیا ہے۔

'سلسلہ در سلسلہ' میں پانچ مضامین شامل ہیں۔ جن میں 'اقبال، فاروقی اور لاہور کا ایک واقعہ' میں شمس الرحمن فاروقی کی کہانی 'لاہور کا ایک واقعہ' کے تناظر میں بحث، مجتبی حسین کے خاکوں میں افسانوی نوعیت پر روشنی، مہدی جعفر کی نئی افسانوی جہت کے تغیرات، سکندر احمد کی فکشن کی تنقید سے روشناسی اور رؤف صادق کی فکشن شناسی سے روبرو کرایا ہے۔ جدید افسانہ نگاروں کی کہانیوں پر دلائل کے ساتھ بات کی گئی ہے۔

حصہ سوم 'پیچ در پیچ' کے عنوان سے ہے۔ جس میں گیارہ مقالات ہیں۔ اس میں سعادت حسن منٹو، فاروق راہب، یوسف عارفی، ساجد رشید، رحمن عباس، بیگ احساس، نور الحسنین، عارف خورشید، عشرت بیتاب، ڈاکٹر داؤد محسن، ارشاد نیازی اور احمد عارف کی افسانوی جہتوں سے روبرو کرایا گیا ہے۔ منٹو کے فکشن میں قومی ہم آہنگی کو بیان کیا ہے جو روش سے ہٹ کر ہے۔

'دائرہ در دائرہ' میں مختلف مصنفوں کی افسانوی تحریروں پر تبصرے کیے گئے ہیں جن میں مشرف عالم ذوقی کی صدی کو الوداع کہتے ہوئے، مقصود اظہر کی کشتن، پروفیسر ناز قادری کی وہ ایک بات، نذیر فتح احمد کی پشاور کی 17 کہانیاں، آفتاب صمدانی کی یثاق، اقبال واجد کی جہات، ڈاکٹر سہیل بیابانی کی قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری، ڈاکٹر سید احمد قادری کی افسانہ نگار اور افسانے، ڈاکٹر عظیم راہی کی اردو میں افسانچہ کی روایت اور ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی کی اردو کے فکشن نگار پر ریویو ہیں۔ یہ تبصرے تنقیدی اور معلوماتی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو ان کے عدل پسند تنقید نگار ہونے کی دلیل ہے۔

پردہ در پردہ میں اہم افسانوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے ان میں پریم چند کا دنیا کا سب سے انمول رتن، کیول دھیر کا لہو کا رنگ، پروفیسر حمید سہروردی کا شکن در شکن، عارف خورشید کا شجر ممنوعہ، احمد رشید کا بن باس کے بعد، ڈاکٹر احمد صغیر کا سمندر جاگ رہا ہے اور اشتیاق سعید کا تشنہ آرزو شامل کیا گیا ہے۔ ان افسانوں کا تجزیہ منفرد نوعیت کا حامل ہے۔ جو بلاشبہ اردو کی تنقیدی فکشن میں اہمیت رکھتا ہے۔

اردو ڈرامے کی تنقید

مصنف: جاوید حسن

ضخامت: 253، قیمت: 130 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

مبصر: خان محمد رضوان، ابوالفضل، انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

'اردو ڈرامے کی تنقید' ڈاکٹر جاوید حسن کی تحقیقی کتاب ہے۔ اس سے پیشتر ان کی ایک کتاب 'محمد حسن کی ڈراما نگاری' کے عنوان سے شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ جس میں انھوں نے محمد حسن کی ڈراما نگاری اور ان کے ڈراموں کا خوبصورت تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کا خاص میدان کار ڈراما تھیٹر اور صحافت ہے۔

'اردو ڈرامے کی تنقید' کے عنوان سے یہ کتاب کئی اعتبار سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں فن ڈراما نگاری، ڈراما کے موضوعات، اسالیب، امکانات، عناصر ڈراما اور ڈراما کے ارتقائی سفر میں درپیش مسائل کا خوبصورت محاکمہ پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب کو مصنف نے تین شق میں تقسیم کیا ہے۔ وہ اس طرح ہیں:

(1) ڈرامے کا فن اور ارتقا۔ اس عنوان کے تحت ڈرامے کی خوبی بحیثیت فن کیا ہے؟ دیگر اصناف فن اور ڈرامے کے مابین اساسی فرق کیا ہے؟ ساتھ ہی ماہرین فن نے ڈرامے کی کیا تعریفیں کی ہیں؟ ڈرامے کے اجزائے ترکیبی کی توضیح بھی کی گئی ہے اور مدلل طریقے سے بتایا گیا ہے کہ ڈرامے کے اجزائے ترکیبی میں پلاٹ کی کیا اہمیت ہوتی ہے؟ اور اس کے ایک ایک جز کی صراحت بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے۔ ڈرامے میں کردار کئی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس میں کرداروں کی اہمیت اور ضرورت کو بھی واضح کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ڈرامے کی روایت اور ارتقا، اردو ڈراما بنگال میں، اردو ڈراما بمبئی میں اور ڈرامے کی اقسام کے تعلق سے مفصل اور مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ اس شق کی خاص بات یہ ہے کہ ذیلی عناوین قائم کر کے ایک ایک جز کو شامل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مصنف نے اس بات کی بھی کوشش کی ہے ڈراما یا اس کے ذیلی عنوانات سے متعلق اگر کوئی مختلف فیہ مسئلہ ہے تو وہ بھی اس بحث کا حصہ بن جائے تاکہ کتاب کو تحقیقی اور تنقیدی حوالے سے اعتبار حاصل ہو سکے۔

(2) 'اردو ڈرامے کی تنقید: پس منظر اور ارتقا' اس ضمن میں ڈاکٹر جاوید حسن نے ڈرامے کے پس منظر کو بیحد خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ تخلیق اور تخلیق کار کے سماج سے رشتے کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور یہ بھی کہ ڈراما کس طرح وجود میں آتا ہے۔ اس سے احساس ہوتا ہے کہ یہ عمل سے معرض وجود میں آنے والا فن ہے۔ اس کی تفصیل کی گنجائش تو نہیں مگر مصنف نے اس کا مطالعہ باریک بینی سے کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ ڈرامے کا پس منظر سماجی، معاشی اور سیاسی بھی ہوتا ہے۔

اس کے بعد ڈرامے کے ارتقا اور اس حوالے سے لکھی گئیں کتابوں پر بھی عمدہ گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف نے دوٹوک انداز میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ابتک ڈرامے کی منصفانہ تنقید نہیں کی گئی ہے اور اس بات پر بھی تاسف کا اظہار کیا ہے کہ بحیثیت فن اس صنف پر زیادہ کام نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس فن کے تئیں بے توجہی برتی گئی ہے۔

پروفیسر کوثر مظہری نے کتاب کی پشت پر لکھا ہے کہ:

"دراصل ڈراما نگاری تکنیکی اعتبار سے شاعری اور فکشن کی بہ نسبت قدرے دشوار ہے۔ جب ڈرامے ہی کم لکھے گئے تو ڈرامے کی تنقید بھلا کہاں لکھی گئی ہوگی لیکن اس فقدان اور بے توجہی کے باوجود گاہے گاہے ڈراموں پر تنقیدی نگارشات منظر عام پر آتی رہی ہیں۔"

مصنف نے اس عنوان کے ذیل میں 19 ویں اور 20 ویں صدی کے حوالے سے ڈرامے پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور اس بات کا اظہار کیا ہے کہ آزادی کے بعد اردو ڈرامے کی تنقید میں واضح طور پر تبدیلی نظر آئی ہے جو کہ خوش آئند پہلو ہے۔

(3) 'اردو ڈرامے کی تنقید: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ' کتاب کا آخری حصہ ہے۔ اس میں انھوں نے سب سے پہلے اردو ڈرامے کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات سے بحث کی ہے اور اسلم قریشی، مسعود حسین رضوی ادیب، ڈاکٹر اخلاق اثر اور ابراہیم یوسف کے نظریات کو بھی نقل کیا ہے۔ مزید برآں ان کے نظریات کے علی الرغم مختلف دیگر ناقدین کے نظریات کو بھی دلیل کے طور پر شامل کیا ہے۔ تاکہ موازنہ کے دوران آسانی ہو، اسی کے ساتھ پارسی تھیٹر کے تحت لکھے گئے اردو ڈراموں کی تنقید اور جدید اردو ڈرامے پر لکھی گئی تنقید کے حوالے سے مبسوط اور مدلل تھیسس قائم کی گئی ہے۔

'اردو ڈرامے کی تنقید' ایک عمدہ کاوش ہے اور ڈرامے کی تنقید پر لکھی گئی کتابوں میں ایک اہم اضافہ بھی تصور کی جائے گی۔

فکشن

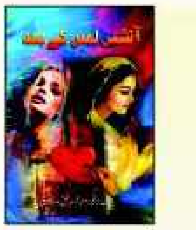

آتشیں لمس کے بعد

مصنف: مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات: 88، قیمت: 100 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد سجان، دہلی

مناظر عاشق ہرگانوی ایک کثیر التصانیف ادیب ہیں۔ وہ بیشتر اصناف ادب میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ شاید ہی کوئی ایسا میدان ہو جسے انھوں نے چھوڑا ہو۔ دراصل وہ ہمہ وقتی ادیب ہیں اور اپنے وقت کا استعمال تصنیف وتالیف میں کرتے ہیں۔ 'آتشیں لمس کے بعد' ان کا تازہ ترین ناول ہے اور اس میں اتنی تخلیقی جودت اور لسانی تخلیقی ہنرمندی ہے کہ قاری اس کی رو میں بہتا چلا جاتا ہے۔

اچھے قلم کار کی یہی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے قلم کا جادو اپنی تحریروں میں اس طرح بکھیرتا ہے کہ قاری ذہنی توانائی کتاب پر مرکوز رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے جسے وہ پڑھ رہا ہے۔ مناظر عاشق ہرگانوی اس فن سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کا قاری ان سے ایسی ہی امید رکھتا ہے۔ ناولٹ 'آتشیں لمس کے بعد' میں کردار نگاری، واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جزئیات نگاری اتنی دلکش اور دلآویز ہے کہ ہر صفحہ پر نظر ٹھہرتی ہے اور تجسس برقرار رہتا ہے۔

اس ناولٹ کے دو اہم کردار 'کوثر' اور 'شنو' خالہ زاد بہنیں ہیں۔ شنو اس ناول کا مرکزی کردار ہے۔ گھر کا ہر فرد اس سے محبت کا دم بھرتا ہے جس میں ارشد امتیاز پیش پیش ہیں۔ حالانکہ شنو کی خالہ کا گھر پڑھا لکھا مہذب ہونے کے ساتھ ساتھ ماڈرن خیالات کا بھی ہے۔ کوثر شنو کی خالہ زاد بہن ہے۔ وہ جوانی اور زندگی کو اپنے ڈھنگ سے جینے کے نظریے پر قائم ہے۔ کوثر اور شنو خالہ زاد بہنیں ہیں۔ کوثر مردوں کو غلط سمجھتی ہے اس کے باوجود بھی مردوں میں ان کی دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ کوثر شنو پر بھی اپنا نظریہ لادنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اس کی بیباکی سے خود کو الگ رکھتی ہے۔ ان دونوں کرداروں کی وجہ سے ناول کا لطف اور تجسس بڑھ گیا ہے اور یقینی طور پر قاری ان دونوں کرداروں کی حرکات وسکنات میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

مناظر عاشق ہرگانوی کا اسلوب الگ ہے۔ وہ خوبصورت جملے تراشنے میں ماہر ہیں۔ اس ناولٹ میں بھی انھوں نے بے حد خوبصورتی سے الفاظ کا استعمال کیا ہے اور کشادہ ذہنی سے کام لیتے ہوئے نثری اسلوب کو احساس سے گزارا ہے۔ جن سے لطف اندوزی ملتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے استعمال کر کے انہوں نے ناولٹ کے حسن کو دوبالا کیا ہے اور اظہار کی صورت کو خاطر نشان بنایا ہے چند جملے ملاحظہ کریں۔

''پیار کے ساتھ ساتھ میں تمھیں بھی اپنانا چاہتا ہوں۔ بغیر تمہارے پیار کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

''رات آپ کو نمائش سے زبردستی لے آیا تھا۔ اس کی تلافی میں یہ تحفہ ہے۔''

''میں تو ہوش میں ہوں لیکن میرا دل بے ہوش ہے۔''

ایسے نہ جانے کتنے جملے ہیں جو اس ناولٹ کو دوسرے ناولوں سے الگ کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں مناظر صاحب نے فیشن پرست اور ترقی یافتہ ہائی فائی گھرانہ کے خیالات اور اطوار کو نہایت خوبصورت انداز سے اس ناولٹ میں پیش کیا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہمارا سماج کتنی ہی ترقی کر لے، ہم کتنے ہی چاند ستارے توڑ لائیں لیکن سماج میں عورت کا احترام اور مقام جداگانہ ہے۔ کیونکہ سماج کو بنانے میں اس کا بڑا حصہ ہے، اس کی بڑی ذمہ داری ہے۔ عورت اگر اپنے اچھے کاموں سے گھر کو جنت بنا سکتی ہے تو ضد میں آ کر اچھے بھلے گھر کو جہنم بھی بنا سکتی ہے۔ شنو اور کوثر کا کردار دونوں رخ کو سامنے لاتا ہے۔

مناظر صاحب نے ناولٹ کے آخر میں قاری کی توجہ اس جانب کرائی ہے کہ ہمیں آخر اس سماج میں اور عورتوں کے درمیان رہنا ہے۔ سماج کے طور طریقوں سے ہٹ کر زندگی گذارنے کا انجام نہ صرف خطرناک ہوتا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

معاصر منظرنامے پر جو ناولٹ لکھے جا رہے ہیں ان میں سماجی اور سیاسی حقائق کی بڑی فنکارانہ عکاسی ملتی ہے۔ اس ناولٹ کے اندر بھی سماج کی بہت سی حقیقتوں کو بیان کیا گیا ہے اور سماج کے بدلتے اور بگڑتے چہرے کی بھی بڑے فنکارانہ انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔

شاعری

آئینہ حیران ہے (شعری مجموعہ)

شاعر: ڈاکٹر مشتاق احمد

صفحات: 104، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر وصی احمد شمشاد

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ (بہار)

عالمی ادب کی تاریخ کے سرسری مطالعے سے یہ عقدہ اجاگر ہو جاتا ہے کہ ہمارا انسانی معاشرہ جب بھی سانحۂ ناگہانی اور وارداتِ وحشت ناک سے دوچار ہوا ہے تو اس کے مضر اثرات ونتائج کی عکاسی ادب میں بھی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیا گیا ہے اور ادیب وفنکار اپنے سماج کا پروردہ ہوتا ہے۔ وہ تغیر حالات کا اثر قبول کرتا ہے اور اسے اپنی فکر ونظر کا حصہ بناتا ہے۔ ادیب وفنکار کے رد وقبول کا یہی تخلیقی عمل ادبی شہ پارے کی صورت میں نمو پذیر ہوتا ہے۔ 'آئینہ حیران ہے' کی نظمیں بھی کورونا کی وحشت ناکی اور پھر لاک ڈاؤن کے عرصۂ بحران کی دین ہے۔ کورونا وبا کی ہولناکی نے جس طرح بنی نوع انسان کو ایک قیامت سے دوچار کیا ہے اور پھر لاک ڈاؤن کی وجہ سے عالمی برادری جس ذہنی اضطراب کی شکار ہوئی ہے اس کا ایک خوبصورت تخلیقی اظہار 'آئینہ حیران ہے' کی نظمیں ہیں۔ اس مجموعہ کلام کے خالق ڈاکٹر

مشتاق احمد جہان اردو ادب کی ایک معتبر آواز ہیں۔ انھوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن نظمیہ شاعری سے انہیں خاص شغف ہے۔

پیشِ نظر شعری مجموعہ 'آئینہ حیران ہے' ان کی تیس نظموں پر مشتمل ہے۔ مشمولہ نظموں کے مطالعے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ کورونا وبا سے پیدا ہونے والے مسائل کے تئیں شاعر نہ صرف سنجیدہ ہے بلکہ ان کے حقیقت پسندانہ اظہار کو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ وہ حصارِ زیست کی اذیت ناکیوں کو شعری قالب میں ڈھال کر اس عرصہ حیات، یعنی کورونا اور لاک ڈاؤن کی تاریخ لکھ رہا ہے۔ شاعر نظریاتی طور پر کسی خاص نظریے کا پیروکار نہیں ہے بلکہ فلاحِ انسانیت کا متمنی ہے اس لیے ہر ایک نظم المیہ حیات کی ترجمان بن گئی ہے۔ انھوں نے شعوری طور پر مصنوعی ادب اور شعری بندش سے پرہیز کرتے ہوئے تجرباتی شاعری کو فوقیت دی ہے۔ آزاد نظم نگاری کے فارم میں ایسی فنی چابکدستی دکھائی ہے کہ ہر ذہنی سطح کے قارئینِ نظم کے زیر و بم سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ 'آئینہ حیران ہے' کی شاعری صرف شاعر کے عرفانِ تخیل کی غماز نہیں ہے بلکہ ان کے تاریخی شعور اور فلسفۂ زیست کی بھی آئینہ دار ہے۔ عام لوگوں کی طرح شاعر بھی وبائی خوف سے اپنے بند کمرے کی زندگی جینے پر مجبور ہے کہ اسے ایک تخلیقی فنکار اور حساس انسان کی ذمے داریوں کا بھی احساس ہے۔ لہٰذا وہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی بدولت حالیہ سماجی اور سیاسی المیہ کو شعری قالب میں ڈھالنے پر مجبور ہے۔

مجموعہ میں مشمولہ بیشتر نظمیں ڈاکٹر مشتاق احمد کے شعری تخیل کے ساتھ ساتھ سماجی مسائل و معمولات کے موضوعات سے لبریز ہیں اور ایک فکر انگیز شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مثلاً کٹھ پتلی، وقت، التجا، نجات، عنکبوت، آئینہ حیران ہے، بدلتے لمحوں کا کرب، کاغذ کی ناؤ، التباسِ حقیقت، عورت اور 'کوزہ گر کی یاد میں' ایسی نظمیں ہیں جن میں سماجی، سیاسی، مذہبی محرکات اور مظلوم انسانوں کی آہ و فغاں تخلیقی روپ اختیار کر گئی ہیں اور شعری مفہوم کی ایک نئی دنیا آباد ہو گئی ہے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد کا یہ شعری مجموعہ کثیر الجہات موضوعات کا آئینہ دار ہے۔ ان کے یہاں شعری، فکری، نظری اور استعاراتی سطحوں پر کہیں بھی تنگلک مفہوم اور لسانی پیچیدگی دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ شاعر نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ نظم فنی تقاضوں کے ساتھ ساتھ غنائیت سے خالی نہ ہو۔ مجموعہ کلام کے آغاز میں پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر محمد علی جوہر اور پروفیسر آفتاب اشرف جیسے شعر فہم ناقدوں نے 'آئینہ حیران ہے' کی نظموں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

امید ہے کہ ادبی حلقے بالخصوص شعری ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے درمیان مجموعہ 'آئینہ حیران ہے' کی پذیرائی ہوگی کہ مشمولہ تمام نظمیں ذہن و دل پر نہ صرف دستک دیتی ہیں بلکہ چشم کشا بھی ہیں۔ واضح ہو کہ 'آئینہ حیران ہے' اردو کے ساتھ ساتھ دیوناگری رسم الخط میں بھی شائع ہو چکا ہے اور ہندی دنیا میں بھی اس کی خوب خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔

شہرِ غزل

مصنف و ناشر: شفیق اعظمی

صفحات: 207، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: احمد نور رضوی، E-68، شاہین باغ، نئی دہلی

اردو ادب میں شاعری کی افادیت اور مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج بھی عام طور پر اگر کسی کو کسی سے محبت اور شناسائی کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو وہ 'شعر' کہہ کر ہی اپنی بات رکھنا چاہتا ہے۔ اردو ادب کی دنیا میں ویسے تو بے شمار دانشوران اور محبانِ اردو نے کارِ نمایاں انجام دیے ہیں، مگر چند ایسے بھی لوگ ہیں جن کا اثر عامۃ الناس پر بے حد واضح نظر آتا ہے۔ روز بہ روز تبدیل ہوتے آج کے دور اور حالات میں جب اردو زبان کی سمجھ رکھنے والوں کی تعداد کم ہوئی ہے بالخصوص غیر مسلموں میں، تو ایسے حالات میں عام فہم زبان میں اپنی بات عام لوگوں تک با آسانی پہنچانے کی صلاحیت رکھنے والے جدید دور کے 'شعرا' میں ڈاکٹر شفیق اعظمی اپنی مثال آپ رکھتے ہیں۔

شفیق صاحب کی کتاب 'شہرِ غزل' کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اک کوزے میں سمندر بھرنے کی کوشش کر رہا ہو اور اس کتاب کے ذریعہ دنیا کے تمام درد اور اسلوب کو سمجھنے اور سمجھانے کا بہترین راستہ بنا رہا ہو۔

شفیق صاحب حمد و نعت میں بھی وہی انداز اور وہی زبان رکھتے ہیں جو با آسانی دلوں تک پہنچے۔ بالخصوص عشقِ نبی کا اظہار بھی اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی سچا عاشقِ رسول ہی کر سکتا ہے۔ ان کے اشعار سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہر گھڑی تصور میں آپ کا مدینہ ہے   اور میں سمجھتا ہوں، میرا جینا جینا ہے
اے صبا یہ آقا سے حرف حرف کہہ دینا   زخم زخم ہستی ہے، داغ داغ سینہ ہے

اچھی بات یہ بھی ہے کہ شفیق نے اپنی غزلوں میں صاف گوئی اور الفاظ کو واضح رکھنے کے ساتھ ساتھ آسان اور سمجھ میں آنے والے جملوں کا استعمال کیا ہے نہ کہ وہ جملے جو عام ذہن و فکر تک پہنچنے سے قاصر ہوں۔

ایک پُر امید انسان کی طرح شفیق بھی دنیا سے ناامید آدمی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اپنی غزل کے ذریعہ اپنے اشعار میں کہتے ہیں کہ

زخم کھاتے رہے مسکراتے رہے   رسم عہد وفا ہم نبھاتے رہے
راہ سیدھی سدا ہم دکھاتے رہے   منزلوں کا پتہ لوگ پاتے رہے
حوصلہ یہ ہمارا ہی تھا اے شفیق   ہم ہوا میں بھی دیپک جلاتے رہے

شفیق اعظمی کے یہاں انسانی درد و سوز بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے، وہ آدمی جو خود کو تنہا محسوس کرتا ہے اور دنیا کی تمام تر دشواریوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے، اس کا بھی درد اپنے اشعار میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

بچھڑ کر اپنے ساتھی سے بچارہ ٹوٹ جاتا ہے
ہے سچ جب آدمی ہوتا ہے تنہا ٹوٹ جاتا ہے
ہو خوش قسمت جو تم آرام سے کھاتے کماتے ہو
یہاں تو بوجھ ڈھوتے ڈھوتے کندھا ٹوٹ جاتا ہے

شفیق اپنی شاعری میں سماجی شعور، سیاسی بصیرت کے ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف بہترین شاعر ہیں بلکہ ایک فکرمند اور دردمند انسان بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں متعدد مرتبہ ٹھہراؤ نظر آتا ہے جو اپنی جانب متوجہ کرتا ہے، رکنے اور سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ان کی شاعری کی عام فہم زبان کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اسے پڑھنے اور سمجھنے میں عام آدمی کو بھی کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ یہیں سے شاعری عام لوگوں تک اپنی رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور معاشرے پر اپنے اثرات مرتب کرتی ہے۔

شفیق اپنی شاعری میں دردمندی اور انسان دوستی کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

مجبوریاں ہیں سامنے کرتا بھی کیا غریب   پردیس یوں ہی جاتا ہے گھر چھوڑ کر کوئی
بے شک نہ پوری ہوتیں ہماری ضرورتیں   آنگن میں پیڑ پیسوں کا ہوتا اگر کوئی

شاعری میں ویسے تو بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں حالاتِ حاضرہ پر اپنی رائے زنی کی ہے مگر شفیق صاحب نے بے حد گہرائی سے جائزہ لیتے ہوئے کہا

گھر سے نکلو تو پتہ بھی ہو فضا کیسی ہے — آ کے دیتی ہے جو دستک وہ ہوا کیسی ہے
تو تو نکلا تھا لیے امن و محبت کا پیام — جسم پر تیرے یہ زخموں کی قبا کیسی ہے

صاف شفاف زبان کے عالم اور عام فہم طرز بیان کے مالک ڈاکٹر شفیق صاحب کی شاعری سے وہ عام لوگ بھی ضرور متاثر ہوں گے جو اب تک شاعری کا مطلب کم ہی سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر شفیق صاحب نے موضوع، طرز زندگی، معاشرہ، حالات اور سیاسیات پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے ظاہر ہے ہر خاص و عام مستفیض ہوں گے۔

بلاشبہ ڈاکٹر شفیق 'شہر غزل' کے شہری ہیں اور امید ہے کہ ان کی یہ پیشکش نہ صرف اہل علم بلکہ عام قارئین کو محبوب ہوگی اور ان کا یہ کارنامہ قابل داد و تحسین ہوگا۔

متاع خواب

مصنف/ ناشر: حبیب سیفی

صفحات: 160، قیمت 80 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: ڈاکٹر عبید الغفار، گوتم بدھ یونیورسٹی، گریٹر نوئیڈا یوپی

زیر نظر شعری مجموعہ متاع خواب حبیب سیفی کی تازہ تصنیف ہے، اس شعری مجموعہ سے لگ بھگ 13 سال پہلے دیدہ ور کے نام سے ان کا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا تھا، اس کے بعد بچوں کے ادب پر کام کیا، کئی برس ہفتہ وار میری نظر کالم کے تحت ایک روزنامہ میں تجزیاتی مضامین لکھے مگر غزلیہ شاعری قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے یہ ہر حال کرتے رہے۔ متاع خواب خالص غزلیات کا مجموعہ ہے۔ آیئے شعریت اور جمالیات سے بھرپور اشعار سے محظوظ ہوا جائے۔

تیرا چہرہ جھلملایا ہے سرِ دشتِ خیال — جب بھی تیری یاد میں ہم جی کو بہلانے گئے
مسکراہٹ، کھلکھلاہٹ، کامیابی اور خوشی — ایک عرصے سے یہ ساری میری مہماں ہو گئیں
کسی کی آہ و زاری بھی اثر رکھتی نہیں اپنا — کسی کی آنکھ کا آنسو مزاج آہ رکھتا ہے

مجموعۂ کلام کا پیش لفظ صدر شعبۂ عربی و اردو اسلامک اسٹڈیز بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری جموں و کشمیر ڈاکٹر شمس کمال انجم کا ہے، یہ مضمون شاعر کی شخصیت اور شاعری دونوں کا بخوبی احاطہ کرتا ہے۔ ایک حمد اور دو نعت رسول، غزلیات سے پہلے ہیں۔ اسی مجموعہ میں حبیب سیفی کی بے حد عمدہ اور تاریخی حوالوں پر محیط نظم 'تاج محل' بھی شامل ہے۔ کتاب کے آخری دو صفحات میں علامہ شمس الرحمن فاروقی، پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، ادیب و مدیر سرسبز کرشن کمار طور، ڈاکٹر الف انصاری اور رفیق شاہین علی گیرین کی آرا شامل ہیں۔ متذکرہ شخصیات کی طویل تحریروں کے اقتباسات کتاب میں شامل ہیں، مگر یہاں نقل نہ کرنے کا مقصد شاعر کے شعری مزاج اور اس کے شعور و فکر کی پرواز کا اندازہ لگانے کے لیے قارئین کو آزاد چھوڑنا ہے۔ یہ فیصلہ وہ خود کریں گے کہ شاعری کیسی ہے۔

تم اپنی خوش مزاجی کو اٹھا کر طاق میں رکھ دو — ہمارے عہد میں عزت تو بس کپڑوں سے ملتی ہے
کوئی بھی دکھ کسی کو ہو عقیدت کام کرتی ہے — دوا سے کب ملے گا وہ سکوں جو گنگا جل دے گا

موجودہ عہد میں شاعری کا رنگ بھی بدلا ہے، اس تبدیلی کی وجہ معاشرے کی بنیادی صفات میں شمار سادگی و صداقت کی جگہ تصنع اور موقع پرستی کا غلبہ ہو جانا ہے۔ ایسے میں مضامین کی اہمیت پر ہم زیادہ توجہ اس لیے بھی نہیں دیتے کہ اب حرف انفرادیت یا ممتاز مقام کی سفارش کسی شاعر کے تعلق سے کرنا خود کو زیر اثر قرار دینا ہے۔ لیکن حالات حاضرہ کی ترجمانی کرنے والے اشعار سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری میں جس صناعی اور صنعت گری یا حسن کاری کے ساتھ حقیقت پسندی کا دخل ہونا چاہیے وہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔

وہ امن بو کر جہاں سے گزرا — زمین کھودی تو سر ملے ہیں
نہیں عبادت سے کم ذرا کچھ — تلاش رزق حلال کرنا

حبیب سیفی کے نزدیک شاعری کو بامعنی ہونا چاہیے، بے معنی شاعری وقت کا زیاں اور اپنی صلاحیت کا قتل بھی ہے۔ کسی بھی مصرع میں معنی کا جو جہان ہوتا ہے وہ اس کی جان ہوتا ہے، اور الفاظ قالب، اسی لیے بات کی ادائیگی سہل بنانے کی فکر کا غلبہ حبیب سیفی کے ذہن پر سوار رہتا ہے۔ قالب کا بگڑنا جان کو خطرہ میں ڈالنے جیسا ہے، اسی لیے وہ اسلوب کی طرف سے ذرا غفلت نہیں برتتے، اپنی بات قاری تک پہنچانے میں نظر معنی پر رہتی ہے، اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ بات واضح ہو جائے، جب بات واضح ہوگی تو پُر اثر بھی یقیناً ہوگی۔ سبھی واقف ہیں غزل کا ہر شعر دوسرے شعر سے مضمون و معنی کے اعتبار سے علیحدہ اور مختلف ہوتا ہے، اس روایت کا احترام حبیب سیفی نے بھی اپنی غزلیہ شاعری میں کیا ہے۔

درِ جاناں مجھے کیوں کر نہ ہو محبوب جاں سے اب
کہ میں نے زندگی پھر سے درِ جاناں سے پائی ہے

حبیب سیفی نے شاعری کو تفریح اور وقت گزاری کا ذریعہ نہیں بنایا بلکہ زندگی سنوارنے کا وسیلہ بنایا ہے۔ میرے نزدیک متاع خواب کی شعری متاع واقعی تعبیر کے رنگ لیے ہوئی ہے۔ حال کے دنوں میں شائع ہونے والا یہ ایک ایسا مجموعہ ہے جسے کچھ روز سرہانے رکھ کر پڑھا جا سکتا ہے۔ بہت سی غزلوں کے اشعار حافظہ میں قید ہو جانے کی بھی خوبی رکھتے ہیں۔

طنز و مزاح

مسکرانا منع ہے

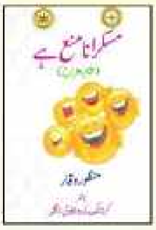

مصنف: منظور وقار

صفحات: 223، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: کرناٹک اردو اکادمی

مبصر: ڈاکٹر لطیف نواز، معاون معلم

سرکاری اردو ہائی اسکول، تالوار، تعلقہ چیتاپور، ضلع کلبرگی، کرناٹک

شاہ دکن حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی سرزمین گلبرگہ ادبی لحاظ سے ہمیشہ سے ہی زرخیز رہی ہے۔ شاعری و نثر کی ایسی کوئی صنف نہیں جن میں یہاں کے فن کاروں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ جہاں غزل و افسانہ جیسی معروف اصناف میں کئی شعرا و ادبا نے ملک گیر شہرت حاصل کی، وہیں اگر ہم انشائیہ کی بات کریں تو ہمیں یہاں فرحت اللہ بیگ اور جناب مجتبیٰ حسین جیسے شہرت یافتہ نام نظر آتے ہیں، جنھوں نے اپنی تخلیقات سے فکر کی ایک نئی طرح ڈالی۔ محترم مجتبیٰ حسین مرحوم کے علاوہ منظور وقار گلبرگہ میں طنز و مزاح کا ایک درخشاں نام ہے۔ انھیں تحریر و قلم سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ ہے۔ افسانے، افسانچے، خاکے اور مزاحیہ مضامین لکھے اور خوب لکھے اور ہندوستان بھر کے مختلف رسائل و جرائد اور اخبارات میں چھپے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 'ہنسنا منع ہے' (1990) منظر عام پر آچکا ہے۔ جب کہ ان کے افسانچوں کا مجموعہ 'کانٹوں کا جھنڈ' (2015) شائع ہو چکا ہے۔ ایک اور مزاحیہ مجموعہ 'مسکرانا منع ہے' 2019 شائع ہوا ہے۔

منظور وقار ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ مذکورہ بالا تصانیف کے علاوہ مختصر افسانے، افسانچے، طنز و مزاح، خاکے، تبصرے اور رپورتاژ پر ان کی تقریباً 14 تصانیف منتظرِ اشاعت ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'مسکرانا منع ہے' طنز و مزاح کے باب میں گراں قدر

اضافہ ہے۔اس میں کل 25 طنزیہ ومزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ کتاب کی ابتدا میں ڈاکٹر جلیل تنویر،مظہر محی الدین اور چاند اکبر کی تحریریں شامل ہیں۔ ڈاکٹر جلیل تنویر نے 'ہمہ جہت قلم کار:منظور وقار' کے عنوان سے صاحب کتاب کا بھرپور تعارف پیش کیا ہے۔مظہر محی الدین اور چاند اکبر نے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے پیش نظر ان کی مقبولیت، زود نویسی اور برق رفتاری کا اعتراف کیا ہے۔

منظور وقار کے انشائیوں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ان کی مزاح نگاری انسانی زندگی سے چنے گئے موضوعات کا عکس ہے۔ان کے بیشتر انشائیے طنز ومزاح کے ساتھ معلومات کا بیش بہا خزانہ ہوتے ہیں۔ داستان دانتوں کی،جلوس ہڑتال بند،بڑے لوگ چھوٹے لوگ،دل ہی تو ہے،ہاتھ پر ہاتھ مارنا،جیسے انشائیوں میں طنز ومزاح کے ساتھ ساتھ قارئین کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ان کے انشائیوں کی انفرادیت یہ ہے کہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کرتے ہیں اور کسی بھی انشائیے کے مطالعے کے بعد قارئین کو تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔منظور وقار کے انشائیوں کی ایک اور خوبی مروجہ نثر سے انحراف کرتے ہوئے ذاتی لفظیات کے ذخیرہ کا بھرپور استعمال ہے۔ وہ محاورات،تشبیہات اور ضرب المثل کا بروقت استعمال جانتے ہیں اور انھیں انشائیوں میں بڑی ہنرمندی سے پیش کرتے ہیں۔ان کا انشائیہ'دل ہی تو ہے' کے آخر میں دل سے منسلک بڑی تعداد میں تشبیہات، محاورے اور ضرب المثل دی گئی ہیں، جنھیں پڑھ کر قارئین ششدر رہ جاتے ہیں کہ کس طرح برجستہ اور رواں زبان کا استعمال کیا ہے۔ان کی اسی خوبی کو سراہتے ہوئے عالمی شہرت یافتہ طنز ومزاح نگار محترم مجتبیٰ حسین مرحوم نے فرمایا تھا کہ:

''منظور وقار کی طنز ومزاح نگاری میں تازگی اور تنوع ہے، برجستہ اور رواں زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ یہی خوبی سب کو متاثر کرتی ہے۔ان کی تازہ تصنیف ''مسکرانا منع ہے'' کی اشاعت کے لیے مبارک باد۔''

منظور وقار کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین ان کے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کے غماز ہیں۔وہ اپنے انشائیوں میں تہذیبی اقدار،عصری اور معاشرتی رجحانات پر چوٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ان کا زور قلم راکٹ کی تیزی سے بھی زیادہ رواں دواں ہے اور جس طرح ملک کے موقر رسائل وجرائد اور خبارات میں اُن کے طنزیہ ومزاحیہ مضامین شائع ہو رہے ہیں، یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کا شمار ان دنوں ملک کے معروف طنز ومزاح نگاروں میں ہونے لگا ہے۔ بلاشبہ منظور وقار ایک معتبر طنز ومزاح نگار ہیں، جن کے قلم نے معاشرے کی کھٹی میٹھی سچائیوں کو ایک وقار دیا ہے، جس کو اہل نظر نے منظور کرتے ہوئے ان کے قلم کو سند عطا کی ہے۔

عبارت مختصر، منظور وقار کے انشائیے 'مسکرانا منع ہے' کو شائقین طنز ومزاح قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

تاریخ و ثقافت

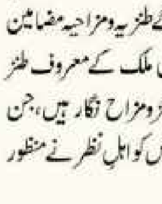

عمانی ثقافت

مترجم: عبدالمبین اعظمی

صفحات: 211، قیمت: 310، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: لیکھنی پرکاشن، شاہین باغ، نئی دہلی

مبصر: امیر حمزہ، K12 تھرڈ فلور، حاجی کالونی، جامعہ نگر، نئی دہلی

عرب اپنی تہذیب وثقافت کی وجہ سے دنیا کے ہر ایک خطہ میں اپنی الگ الگ شناخت قائم کرتے ہیں۔ دنیا کے قدیم ترین شہر عرب ہی میں واقع ہیں جہاں سے منسلک مختلف ثقافتی وتہذیبی داستانیں دنیا کے گوشے میں پائی جاتی ہیں۔عرب ممالک کے ہر شہر کی تاریخ ہے اور وہاں سے منسلک تہذیبی رواتیں بھی قصۃ العوام میں مشہور ہیں۔ اس کتاب میں نشاۃ ثانیہ کے بعد سلطنت عمان کا ذکر زیادہ ہے جس کو وہاں کے کلچرل کلب نے شائع کیا ہے اور اردو میں ترجمہ عبدالمبین اعظمی نے پیش کیا ہے۔یہ کتاب بنیادی طور پر چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصہ میں ان چند نادر کتابوں اور مخطوطات کا ذکر ہے جو عمان میں لکھی گئی ہیں۔سب سے پہلی کتاب عہد نبوی میں لکھی گئی ''فاکہۃ ابن اسبیل'' کا ذکر ہے جو علم طب پر ہے اور اس کے مصنف طبیب راشد بن عمیرہ بن ثانی الہاشی ہیں۔اس کے بعد سید ھا انیسویں صدی میں لکھی گئی 'الفتح المبین فی سیرۃ السادۃ البوسعیدین'' کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چھ اور کتابوں کا ذکر ہے جو مختلف ادوار میں لکھی گئیں ہیں۔ دوسرا حصہ مقالات سے متعلق ہے جس میں چھ مقالات ہیں۔ پہلے مقالے میں شہر مسقط کی ترقی کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد شہری آبادی میں قدیم عمانی تہذیب کی عکاسی پر باتصویر تحریر ہے۔ایک تعارفی تحریر حصن الشموخ لائبریری پر ہے جس کی تفصیلات پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہاں ڈیجیٹل رسائل اور کتابوں پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔عام بچوں کی لائبریری اور قومی میوزیم کا بھی ذکر ہے۔عمان کے بوشر شہر میں عمان کی بڑی مسجد 'مسجد سلطان قابوس اکبر' کا افتتاح 2001 میں ہوا۔اس موقع پر بادشاہ نے جو خطبہ دیا اس کے ترجمہ کے ساتھ پوری مسجد کا تعارف ہے جس کی تعمیر میں اس بات کا خصوصی خیال رکھا گیا ہے کہ اس میں عمانی طرز تعمیر کی جھلک نمایاں نظر آئے۔کتاب کا تیسرا حصہ مقالات ثقافیہ پر ہے جس میں ایک مضمون ''عمانی آرٹس میں عورت روایتی کہانیوں سے موجودہ آرٹس تک'' ڈاکٹر ندی انجمی کا بہت ہی اہم ہے اور اس کتاب کے موضوع سے سب سے قریب ہے جس میں وہ لکھتی ہیں کہ ''عمانی قدیم حکایتوں کی تصویریں متضادانہ ہیں جس میں مختلف النوع صلاحیت ملتی ہیں جو آج کے مبصرین کو موقع دیتی ہیں کہ ان پر دوبارہ غور وفکر کیا جائے اور ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جا سکے جو سماج کی فلاح وبہبود میں مدد کرسکیں۔'' ثقافت سے متعلق ایک اور مضمون ہے جس میں عمان میں عوامی کہانیوں کا دینی رجحان بتایا گیا ہے۔عربی اگر اپنے وطن میں ہی پلا بڑھا ہو تو اس کے اندر اتنی روایتی کہانیاں جمع ہوجاتی ہیں کہ وہ داستان کی جگہ لے سکتی ہیں ساتھ ہی اسلام کے بعد دینی رجحانات کا کہانیوں میں آنا ایک لازمی سا عنصر ہے یہی نہیں بلکہ ادب اطفال تک میں جہاں کہانیاں پانچ سطری اور دس سطری ہوتی ہیں وہاں بھی قرآنی لفظیات ودینی معاملات داخل کردی گئی ہیں جو ماحول کے اعتبار سے بچوں کے لیے مفید بھی ہوں گی۔اس کے بعد ایک دلچسپ مضمون ''محبت اور زندگی کا موسم ......عمان میں'' ہے۔اس قسم کے عنوان سے شائبہ ہوتا ہے کہ اس میں کچھ خاص ہوگا لیکن اس میں وہی ہے جو ہر ملک کے موسموں کے بارے میں ہوتا ہے، اس میں بھی عمان کے تینوں موسم میں ملک کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کا انشا پردازانہ ذکر ہے۔کتاب کا آخری حصہ النصوص الشعریۃ ہے جس میں وہاں کے سات ادیبوں کا ذکر ہے اور ان کی شاعری کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ان میں سے اکثر شاعر ہیں سوائے زہران القاضی کے جن کی چودہ کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ یہ کتاب اگرچہ عمانی ثقافت پر ہے لیکن قاری کو مکمل تشنہ رہنا پڑتا ہے۔ بلکہ وہاں کی تہذیب وثقافت کی نمائندگی کے اعتبار سے ایک ناکافی کتاب ہے جس میں نہ تاریخ ہے، نہ قبائل کا ذکر ہے اور نہ ہی واضح طور پر رسومات وروایات کا ذکر ہے بلکہ چند چھوٹی چھوٹی تحریروں کو جوڑ کر کتاب کی شکل دے دی گئی ہے۔ ایک مضمون ہے جو بچوں کی وطنی (راشٹروادی) شاعری پر ہے لیکن پوری کتاب میں کسی ایسی ادبی کتاب کا ذکر نہیں ملتا جس سے خارج عمانی ثقافت کو سمجھا جا سکے۔ یہاں تک

عوامی کہانیوں کا جہاں ذکر ہوا ہے وہاں بھی دینی رخ سامنے آجاتا ہے۔ اس طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے چند مضامین کی بناء پر اچھی ہے۔ ترجمہ میں معیار کی کمی نظر آتی ہے۔ عربی میں بادشاہ کے نام کے ساتھ یا کسی بھی باثر شخصیت کے ساتھ ''حفظہ اللہ ورعاہ'' کا ذکر لازمی طور پر کیا جاتا ہے، ترجمہ میں بھی اس کا التزام ہے اور کہیں کہیں عربی تراکیب کے انداز میں ہی ترجمہ کیا گیا ہے۔

رسائل و جرائد

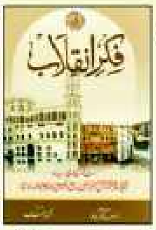

فکر انقلاب (اشاعت خصوصی بیاد مفتی مظفر حسین مظاہری)

مدیر اعلیٰ: اسعد مختار، مدیر: احسن مہتاب

صفحات: 808، قیمت: 500 روپے

ناشر: آل انڈیا تنظیم علماء حق، نئی دہلی، 2019

تبصرہ: مصطفیٰ رضوان شیخ

دینی اداروں سے وابستہ افراد و اشخاص، خصوصا ایشیا کی دو عظیم درس گاہ: دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارن پور کے اکابر و اسلاف اور علما و صلحا کے تذکرہ کو کتابی شکل میں شائع کرنا مجلّہ 'فکر انقلاب' کے اشاعتی منصوبے کا لاینفک حصہ ہے۔ فکر انقلاب کوئی سیاسی مجلّہ نہیں، مشہور ملی آرگنائزیشن آل انڈیا تنظیم علماء حق نئی دہلی کا ترجمان ہے، جس کا شمار ملک کے اہم اور معتبر رسائل میں ہوتا ہے۔ اس رسالے نے مختصر مدت میں اہم ملی اور مذہبی شخصیات کی حیات و آثار کے نقوش کی ترتیب اور اس کی قومی اور عالمی پیمانے پر تشہیر کا جو منفرد کارنامہ انجام دیا ہے، وہ دیگر ملی اداروں اور مذہبی تنظیموں کے لیے مشعل راہ ہے۔ فکر انقلاب نے ایک طویل مدتی اشاعتی منصوبہ کے ذیل میں جو خصوصی شمارے شائع کیے ہیں، اس سے جبین صحافت پر سوانح نگاری کی ایک نئی تاریخ رقم ہوئی ہے۔ زیر نظر ضخیم فقیہ الاسلام مفتی مظفر حسین مظاہری نمبر بھی سوانحی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس سے پہلے بانی دارالعلوم دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، بانی جامعہ ملیہ اسلامیہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مجاہد آزادی مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا قاری محمد طیبؒ، محدث کبیر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور ان کے صاحبزادے مولانا انظر شاہ کشمیریؒ وغیرہ کی حیات و خدمات اور ان کے علمی اور فکری آثار پر مرکوز ضخیم دستاویزی شمارے شائع ہو چکے ہیں، انھیں عوام و خواص کے حلقوں میں بے پناہ مقبولیت ملی ہے۔

نمونۂ اسلاف فقیہ الاسلام مفتی مظفر حسین مظاہری (2003-1929) نابغۂ عصر اور نادرۂ روزگار شخصیت تھے۔ مغربی اتر پردیش میں پیدا ہونے والی اور اسی خطہ کو محور بنا کر قوم و ملت کی عظیم خدمت کرنے والی ایک اہم شخصیت کا نام تھا مظفر حسین، انھوں نے درس و تدریس، دعوت و تبلیغ اور فقہ و فتاویٰ نویسی کے میدان میں اپنے کارناموں کے نقوش ثبت کیے۔ وہ مظاہر علوم سہارن پور کے ایک عرصے تک ناظم و نگراں بھی رہے اور اس ادارے کو اپنا خون جگر پلا کر، ترقی کے مراحل سے ہم کنار کرتے رہے۔ وہ باتوفیق مصنف اور مؤلف بھی تھے، انھوں نے مشغولیتوں کے ہجوم میں کئی اہم دینی موضوعات پر کتابیں تالیف کیں، جو ہمارا اہم مذہبی اثاثہ ہیں۔ وہ اپنی مذہب پسندی کے باوجود، اختلافی مسائل و مباحث اور نزاعی امور سے مجتنب رہتے تھے اور مسلکی عناد کو ملی اتحاد کے لیے سم قاتل یقین کرتے تھے۔

وہ عوام الناس میں اتنے محبوب اور طلبہ میں اتنے مقبول تھے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ہر شخص رنجور و ملول تھا۔ بعد از مرگ ان کے معاصرین اور مستفیدین اور ان کے عقیدت مندوں نے ان پر تعزیتی اور تاثراتی نوعیت کے مضامین لکھے، مگر ہنوز اس کی ضرورت تھی کہ ان کی شخصیت اور کارناموں کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور ان کے نقوش کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جائے، اسی عظیم مقصد کی حصول یابی کے لیے فکر انقلاب کے ادارۂ تحریر نے ان کی شخصیت کو اپنے اشاعتی پروگرام میں شامل کیا اور ملک و بیرون ملک کے چیدہ اور مشہور صاحب علم و قلم افراد سے رابطہ کرکے ان پر مضامین اور مقالے لکھوائے اور ان کو بڑے اہتمام سے دیدہ زیب، خوب صورت و جاذب نظر ٹائٹل کے ساتھ شائع کیا۔ فکر انقلاب کی یہ خصوصی اشاعت، ایک ضخیم اور حافظہ میں نقش رہ جانے والا یادگار نمبر ہے۔ اس کا اہم باب تیسرا باب 'باب فقیہ الاسلام' ہے، جس میں 60 طویل و مختصر مضامین کو معنوی ربط کے ساتھ یک جا کر دیا گیا ہے۔ آخری باب 'منظومات' کا ہے جس میں مفتی مظفر حسین کی شخصیت پر تاثراتی نظموں، مدحیہ قصائد اور مرثیوں کو اختصاصی طور پر جگہ دی گئی ہے۔

جن نامور اصحاب قلم کی تحریریں نثری حصہ میں شامل ہیں، ان کے اسما مندرجہ ذیل ہیں۔ مفتی عبدالعزیز قاسمی، مفتی ناصرالدین مظاہری، مولانا اعجاز عرفی قاسمی، مولانا اطہر حسین، مولانا محمد سعیدی، مولانا اسلام الحق اسعدی، مولانا ریاض الحسن، مولانا نسیم اختر شاہ قیصر، مرغوب الرحمٰن مظاہری، سید نجم الحسن تھانوی، مولانا عبدالخالق مظاہری، مولانا انعام اللہ قاسمی، مولانا عبدالعزیز قاسمی، ڈاکٹر منور حسن کمال، مولانا نسیم احمد مظاہری، مولانا محمد اسلم مظاہری، مولانا انعام الرحمٰن تھانوی، ریاض الحسن مظاہری، ابوریحان مظاہری، مفتی محمد زید مظاہری ندوی، حکیم مولانا محمد مکرم حسین، مولانا محمد اسرار الحق قاسمی، مفتی جمیل الرحمٰن قاسمی، مفتی نذر توحید مظاہری، مفتی عبید اللہ اسعدی، مولانا برہان الدین سنبھلی، مولانا کلیم صدیقی، مفتی محمد اکبر حسنی، مولانا رئیس الدین، مولانا محمد قاسم، مولانا خورشید احمد قاسمی، عبدالمالک بلند شہری، مولانا فرید الدین قاسمی، خان محمد رضوان، پنڈت وید سوم دت، مفتی محمد نعیم الہ آبادی، مولانا ممشاد علی قاسمی، محمد احمد فدا صدیقی مظاہری، مولانا محمود حسن حسنی ندوی، مولانا مفتی خالد سیف اللہ، مفتی ایوب صابر، مولانا عبدالجلیل مظاہری، مرغوب الرحمٰن سہارن پوری، فیضان سرور مظاہری، مولانا عبد اللہ طارق، مولانا محمد یوسف مظاہری، ایم ودود ساجد، عبد اللہ عثمانی دیوبندی، عابد انور، مولانا محمد عمر مظاہری، مولانا یعقوب بلند شہری، مولانا نثار احمد مظاہری، مولانا محمد اصغر۔ مضمون نگاروں میں قدیم اور روایتی اداروں سے فارغ علما و فضلا بھی ہیں اور عصری دانش گاہوں سے سیراب اعلی تعلیم یافتہ اسکالرز بھی۔ یہ تحریریں مختلف اذہان کی رہین منت ہونے کے باوجود مکررات و اعادہ سے بڑی حد تک پاک ہیں۔ منظومات کا حصہ بھی کافی وقیع اور اہم ہے۔

ان مذکور الصدر منظوم و منثور تحریروں سے بیک نظر اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مفتی مظفر مرحوم کو علمی، مدرسی اور سماجی حلقوں میں کتنی پذیرائی حاصل تھی اور ان کی ملی اور سماجی خدمات کا دائرہ کتنا ہمہ گیر اور ہمہ جہت تھا۔

اس اشاعت خصوصی کی دستاویزی نوعیت سے انکار ممکن نہیں، امید ہے کہ فکر انقلاب کے سابقہ شماروں کی طرح اس ضخیم شمارہ کی بھی علمی حلقوں میں پذیرائی ہوگی۔ اور مفتی مظفر صاحب کی زندگی، ان کی سرگرمیوں اور ان کے کارناموں کو مرکز بنا کر تحقیقی اور تالیفی کام کرنے والوں کے لیے یہ خاص نمبر مشعل راہ ثابت ہوگا۔ ان کی علمی، تدریسی، تبلیغی، تربیتی اور فقہی خدمات سے نئی نسل کی آشنائی کا وسیلہ بنے گا، نیز یہ توقع ہے کہ اس پیش کش سے سبق لے کر نئے لوگ بھی اس میدان میں تحقیق کا حوصلہ دکھائیں گے اور مخفی گوشوں کو تحریر کا پیکر عطا کریں گے۔

اس کتابی شمارہ کا ٹائٹل دیدہ زیب، سرورق سادہ و جاذب اور طباعت بھی عمدہ ہے، کاغذ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی معیاری استعمال کیا گیا ہے، آٹھ سو سے زائد صفحات پر مبنی اس شمارہ کی قیمت صرف 500 روپے رکھی گئی ہے، جو گرانی کے اس ہوش ربا دور میں علم دوستوں کے لیے کچھ زیادہ نہیں۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبر نامہ

نئی تعلیمی پالیسی میں اردو زبان کے فروغ کو خاص اہمیت دی گئی ہے

اردو محض ایک زبان نہیں، ہماری مشترکہ وراثت ہے، اردو کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل کی کارکردگی قابلِ اطمینان: سنجے دھوترے

نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی گورننگ کونسل کا 25 واں سالانہ اجلاس منعقد کیا گیا جس کی صدارت وزیر مملکت برائے تعلیم عالی جناب سنجے دھوترے جی نے کی۔ اپنے صدارتی خطاب میں کونسل اور ڈائریکٹر کی کارکردگی کے تئیں اظہار اطمینان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اردو ہمارے لیے محض ایک زبان نہیں بلکہ ہماری مشترکہ وراثت ہے، ہمیں اردو زبان کو ملک کے تمام شہریوں تک پہنچانا چاہیے اور خاص طور پر جدید ٹکنالوجی کو اس زبان کے فروغ و ترقی کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ وزیر اعظم شری نریندر مودی ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ اردو زبان کی ترقی اور فروغ کے حوالے سے بھی سنجیدہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ حکومت کی طرف سے جو نئی تعلیمی پالیسی تیار کی گئی ہے اس میں اردو زبان وادب کے فروغ کا خاص خیال رکھا گیا ہے، کیونکہ اردو ہندوستان کی ایک ایسی زبان ہے جس کے الفاظ کم و بیش اس ملک کی ہر زبان میں پائے جاتے ہیں اور خود اردو میں بھی ہندوستان کی مختلف زبانوں کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ اس پالیسی کے تحت آئین کے آٹھویں شیڈول میں درج اردو سمیت سبھی زبانوں کے فروغ پر توجہ دی جائے گی اور اس مقصد سے اکیڈمیوں کا قیام کیا جائے گا، ساتھ ہی ان کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی جانب سے خصوصی اقدامات کیے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل کے درمیان اردو زبان کو عام کرنے کی خاص ضرورت ہے۔ کچھ ایسا انتظام کیا جانا چاہیے کہ جو لوگ اردو رسم الخط اور اردو الفاظ سے ناواقف ہیں ان کے لیے بھی اردو الفاظ کے معنی و مفہوم کو سمجھنا ممکن ہو سکے۔ انھوں نے خاص اس مقصد سے ایک کارگر میکانزم تشکیل دینے پر زور دیا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو زبان کو شہروں کے ساتھ گاؤں گاؤں تک لے جانے کی ضرورت ہے اور ہندوستان کے کچھ ایسے گاووں کی نشاندہی کی جانی چاہیے جہاں کونسل کی جانب سے اردو کے دلکش پروگراموں کا انعقاد کیا جائے اور وہاں کے اردو جاننے والے لوگوں کی ہمت افزائی کرکے ان کے اندر اردو لکھنے پڑھنے کے تئیں مزید شوق و ذوق پیدا کیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے وزارت تعلیم کو نئی تجاویز پیش کی جائیں تاکہ اردو کے فروغ میں تیزی لانے کے ساتھ اس کے لیے نئے وسائل بھی اختیار کیے جاسکیں۔

کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر نے اظہار تشکر کی رسم ادا کرتے ہوئے وزیر مملکت برائے تعلیم عالی جناب سنجے دھوترے صاحب کے صدارتی کلمات کے دوران پیش کی گئی تجاویز کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ کونسل کے فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد ان تمام تجاویز کو عملی جامہ پہنائیں گے۔ انھوں نے وزیر اعظم عالی جناب نریندر مودی کے تئیں بھی اظہار تشکر کیا کہ انھی کے دور حکومت میں کونسل کا بجٹ دوگونا سے بھی زیادہ ہو گیا اور بلاشبہ موجودہ حکومت اردو کے فروغ کے تئیں کافی سنجیدہ ہے۔

کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد نے کونسل کا ایجنڈہ پیش کرنے سے پہلے وزیر مملکت برائے تعلیم جناب سنجے دھوترے جی، لوک سبھا ایم پی شری جگدمبیکا پال، ہنس راج ہنس اور راجیہ سبھا ایم پی جناب مجیب اللہ صاحب اور تمام ممبران کا خیر مقدم کیا۔ ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد کے ذریعے میٹنگ میں پیش کردہ تمام ایجنڈے اتفاق رائے سے پاس کیے گئے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عقیل احمد نے تمام ممبران سے درخواست کی کہ اردو کے فروغ کے لیے نئی تجاویز اور مشورے کونسل کو لکھ کر بھیجیں تاکہ گورننگ باڈی میں منظوری کے لیے پیش کیا جاسکے۔

وزارت برائے تعلیم کے جوائنٹ سکریٹری جناب سنجے سنہا نے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر، ڈائرکٹر ڈاکٹر عقیل احمد اور دیگر ممبران کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے وزارت تعلیم کی طرف سے تمام ممبران کا خیر مقدم کیا۔

گورننگ کونسل کے ممبران میں راجیہ سبھا ایم پی جناب مجیب اللہ نے اپنی ریاست اوڈیشہ میں اردو زبان کو عام کرنے پر زور دیا جبکہ ڈاکٹر زاہد تماپوری نے ہر ریاست میں اردو اکیڈمی کے قیام کی تجویز پیش کی۔ پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 اگست 2020

یک موضوعی مجلہ 'اندازِ بیاں' کی تقریبِ اجرا

نئی دہلی: حقانی القاسمی اردو کے جینوئن ادیب و ناقد ہیں۔ ان کی تحریروں میں بے پناہ دل کشی اور دل و دماغ پر چھا جانے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کا اسلوبِ نگارش، اظہارِ خیال کا انداز اور لکھنے کا اسٹائل ایسا ہے کہ قاری مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ حقانی مختلف رسالوں سے وابستہ رہے ہیں اور انھوں نے ہر رسالے کو ایک منفرد طور و طرز عطا کیا ہے

اور نئے نئے ادارتی تجربے بھی کیے ہیں جس کی وجہ سے ادبی صحافت میں ان کی شناخت مستحکم اور مسلّم ہے۔ 'اندازِ بیاں' کا ان کا تجربہ بھی بہت منفرد اور اوروں سے الگ ہے۔ انھوں نے فرسودہ موضوعات سے گریز کرتے ہوئے ان موضوعات کو مس کیا ہے جن پہ کم لوگوں کی نظر جاتی ہے جس کا ثبوت 'اندازِ بیاں' کا دوسرا شمارہ 'پولس کا تخلیقی چہرہ' اور تازہ شمارہ 'میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات' ہے۔ ان دونوں موضوعات پر آج تک کوئی بھی تنقیدی و تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے معروف ادیب و ناقد حقانی القاسمی کی ادارت میں شائع ہونے والے یک موضوعی مجلہ 'اندازِ بیاں' کے تازہ شمارے کی تقریبِ اجرا میں خطاب کرتے ہوئے کیا۔ قومی اردو کونسل کے صدر دفتر میں منعقدہ اس تقریب میں انھوں نے حقانی القاسمی سے ذاتی تعلقات کا خصوصی حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ صلاح الدین پرویز کے ساتھ مل کر سہ ماہی 'استعارہ' نامی مجلہ نکالا کرتے تھے اور میں اسی زمانے سے ان کی تحریروں کا خاص قاری ہوں۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ حقانی القاسمی ادب میں ہمیشہ نئے جزیروں کو دریافت کرتے رہے ہیں اور نئے امکانات کی جستجو ان کی سرشت میں شامل ہے۔ اس موقعے پر ڈائرکٹر اور تقریب میں شامل تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے حقانی القاسمی نے اندازِ بیاں کے تازہ شمارے کا تعارف بھی پیش کیا۔ انھوں نے یہ بتایا کہ یہ شمارہ میڈیکل ڈاکٹروں کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کے جائزے پر مشتمل ہے اور ساڑھے پانچ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس مجلے میں دنیا بھر کی درجنوں ایسی شخصیات کی حیات و خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جو ڈاکٹری جیسے مصروف ترین پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود علم و ادب کی دنیا میں امتیازی شناخت رکھتی ہیں۔ انھوں نے ادب اور میڈیسن کے گہرے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ادب کی ثروت مندی میں اضافہ کرنے میں میڈیسن کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ فرائڈ نے نقدِ ادب کو تحلیلِ نفسی جیسا نظریہ دیا تو وہیں جدید اردو کے بانی ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو نثر کو نیا رخ دیا۔ اردو کے شعری منظرنامے پر ڈاکٹر ابرار احمد، انور زاہدی، ثروت زہرا، زبیر فاروق، ارمان نجمی، حنیف ترین وغیرہ ایسے ڈاکٹر ہیں جو معاصر شعری منظرنامے پر اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے فکشن کے حوالے سے رشید جہاں، انور سجاد، حسن منظر، آصف فرخی، خالد سہیل وغیرہ اور تحقیق و تنقید میں راج بہادر گوڑ، تقی عابدی، عبدالمعز شمس وغیرہ کا ذکر کیا۔ خاص طور پر ان افراد کا جو ڈاکٹری پیشے سے زیادہ ادبی منظرنامے میں الگ شناخت رکھتے ہیں۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے ریسرچ اسسٹنٹ محمد افضر نے حقانی القاسمی کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ایک نظم پڑھی جسے سامعین نے بے حد پسند کیا اور داد و تحسین سے نوازا۔

اس تقریب میں قومی اردو کونسل کے تمام سیکشن انچارج اور دیگر اسٹاف سمیت جناب فیروز بخت احمد، ڈاکٹر امتیاز احمد اور ڈاکٹر نعمان قیصر وغیرہ شریک تھے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 3 ستمبر 2020

NEET کی تیاری کے لیے اردو زبان میں مواد کی فراہمی و ترتیب کے سلسلے میں ورکشاپ کا انعقاد

نئی دہلی: میڈیکل کورسز میں داخلے کے خواہش مند طلبا و طالبات کے لیے قومی سطح پر منعقد ہونے والے نیٹ (NEET) امتحانات کے لیے اردو میں مواد کی فراہمی کے سلسلے میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے ایک ورکشاپ کا انعقاد کیا گیا، جس میں اس حوالے سے بایولوجی، کیمسٹری اور فزکس پر طالبات کے لیے مفید کتابیں مرتب کرنے پر غور و خوض کیا گیا۔ اس موقعے پر کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ بہت سے طلبا جو اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور وہ مستقبل میں

ڈاکٹری کے شعبے میں جانا چاہتے ہیں انھیں نیٹ کے امتحانات کی تیاری میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جنھیں دور کرنے کے لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کونسل کی جانب سے ایک ایسا جامع نصاب مرتب کیا جائے جو 'نیٹ' کی تیاری میں اردو طلبا کے لیے معاون ہو اور اس کی مدد سے وہ ان امتحانات میں کامیابی حاصل کرکے میڈیکل کورسز میں داخلہ لے سکیں۔

انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل نہ صرف اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے مختلف قسم کی سرگرمیاں انجام دیتی ہے بلکہ اس کا ایک خاص مقصد یہ بھی ہے کہ اردو طلبا کو جدید تکنیکی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے ساتھ اردو زبان و ادب کے علاوہ ان کی خواہش کے مطابق دیگر علمی شعبوں میں بھی ان کی رہنمائی کی جائے اور اس سلسلے میں ان کی ہر قسم کی علمی و عملی مدد کی جائے تاکہ ان کا مستقبل روشن و محفوظ ہو سکے اور وہ قوم و ملک کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید و کارآمد ثابت ہو سکیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر کونسل کی جانب سے اردو کے علاوہ عربی، فارسی، خطاطی اور کمپیوٹر کے مختلف کورسز کروائے جاتے ہیں اور اب ہم طلبا کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے کونسل کی جانب سے 'نیٹ' کی تیاری کے لیے بھی کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ اس ورکشاپ میں شرکا نے بایولوجی اور کیمسٹری پر تیار شدہ مواد کو دیکھنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے اس کو مزید بہتر بنانے کے امکانات کی نشان دہی کی اور کہا کہ بقیہ مواد بھی جلد از جلد مرتب کروا کے گہرائی سے جائزہ لینے کے بعد اس کی اشاعت کا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس ورکشاپ میں پروفیسر مشاہد حسین، پروفیسر تسنیم فاطمہ، پروفیسر جسیم احمد، ڈاکٹر عطاء الرحمن، محترمہ شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر اکیڈمک)، ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) اور محترمہ ذیشان فاطمہ (ریسرچ اسسٹنٹ) شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 8 ستمبر 2020

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

شبلی اکادمی: ایک صدی کا قصہ

نئی دھلی: علامہ شبلی عارف بھی تھے اور دائرۃ المعارف بھی۔ المامون کے لکھنے والے نے بیت الحکمت کی طرز پر دارالمصنفین شبلی اکادمی کو قائم کیا جس نے علمی ہمہ جہتی کو اردو میں درجہ کمال کو پہنچا دیا۔ پروفیسر اختر الواسع نے ان

خیالات کا اظہار اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام، 'دارالمصنفین شبلی اکادمی: ایک صدی کا قصہ' کے عنوان سے منعقدہ بین الاقوامی ویبینار میں مجلس صدارت کے ایک رکن کی حیثیت سے کیا۔ مجلس صدارت کے اراکین میں پروفیسر خالد محمود اور مولانا محمد طاہر مدنی کے نام نامی شامل ہیں۔ بین الاقوامی ویبینار میں ڈاکٹر انوار غنی (نیوزی لینڈ) بطور مہمان خصوصی شریک ہوئے جبکہ جناب شکیل احمد صبرحدی نے مہمان اعزازی کے طور پر شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں قرآن پاک کی تلاوت ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے کی۔ نظامت کا فریضہ ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دیا۔ تکنیکی امور کی دیکھ بھال راحیل مرزا نے کی۔ حکیم نازش احتشام اعظمی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ آج کے ویبینار کو مصر اور ایران کے دانشوروں کی شمولیت ان پر چلے آ رہے شبلی کے علمی قرض کی ادائیگی کی صورت میں بھی دیکھنا چاہیے۔ کیونکہ انھوں نے اسکندریہ کے کتب خانے کے جلائے جانے پر جو مسکت، مبسوط اور مدلل جواب دیا۔ آج تک مستشرقین اس کا جواب نہیں دے سکے۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اسی طرح 'شعر العجم' اور 'موازنہ انیس و دبیر' نے ایران اور فارسی زبان کو مقبول عام بنایا۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ اور تہذیب کے فروغ و استحکام کا کوئی ذکر شبلی اکادمی کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ ہمارے لیے فخر اور سعادت کی بات ہوگی کہ ایک ایسے تاریخ ساز ادارے کو ہم قائم و دائم رکھیں۔ مجلس صدارت کے فاضل رکن مولانا محمد طاہر مدنی نے کہا کہ نئی نسل کو اکادمی کے لٹریچر سے متعارف کرانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا دیگر زبانوں خصوصاً ہندی میں ترجمہ کیا جائے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر انوار غنی نے کہا کہ اکادمی کی مہتم بالشان تاریخ کو قائم و دائم رکھنے کے لیے اسے معاشی طور پر مستحکم کرنا ہماری اولین ترجیح میں شامل ہونا چاہیے۔ مہمان اعزازی جناب شکیل احمد صبرحدی نے کہا کہ ایک وسیع انسانی اخوت و ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر اس نوع کے کام کرنے کی ضرورت ہے، جس میں کسی طرح کی تفریق کا گزر نہ ہو۔ بین الاقوامی ویبینار سے خطاب کرتے ہوئے حکیم وسیم احمد اعظمی نے کہا کہ دارالمصنفین شبلی اکادمی سے اہم شخصیات کا والہانہ تعلق رہا۔ پروفیسر سراج اجملی نے کہا کہ روز اول سے معارف نے ادبیات کو اپنے یہاں خاص جگہ دی ہے۔ ابتدا سے آج تک کے شماروں کو اگر ملاحظہ کریں تو شعر و ادب کی ایک کہکشاں معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر شبلی کی شعری عظمتوں اور لفظی و معنی رعایتوں کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ اس میں شبلی کی جسارت اور کمال دونوں پنہاں ہیں۔ پروفیسر احمد القاضی (صدر شعبۂ اردو، جامع ازہر، مصر) نے عرب دنیا میں علامہ شبلی کی اہمیت اور ان کی مقبولیت کے ساتھ وہاں کی عملی دنیا سے شبلی کے روابط کا بطور خاص ذکر کیا۔ پروفیسر احمد محفوظ نے کہا کہ اردو تنقید کی ترویج و ترقی میں شبلی کا کارنامہ تو ہے لیکن اسی کے زیر اثر شبلی اکادمی اور ماہنامہ معارف میں جو بہت سے مضامین اردو تنقید سے متعلق شائع ہوئے اردو ادب میں وہ غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر وفا یزداں (شعبۂ اردو، یونیورسٹی آف تہران) نے ایران میں شبلی شناسی کا ذکر کرتے ہوئے فارسی ادبیات میں ان کی خدمات کا احاطہ کیا۔ ڈاکٹر اشہد جمال ندوی نے کہا کہ شبلی کی ایک بڑی آرزو خطہ اعظم گڑھ میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے کی تھی وہ اسے علم و ادب کا گہوارہ بنانا چاہتے تھے۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے دارالمصنفین شبلی اکادمی کی حصولیابیوں کا جائزہ لیا جائے تو متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کو اپنانے اور اس کو باقی رکھنے میں یہ ادارہ سرفہرست ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد اکرم السلام اور ڈاکٹر جمشید احمد ندوی نے عربی زبان و ادب میں علامہ شبلی اور شبلی اکادمی کے اختصاص کو واضح کیا اور بتایا کہ علوم اسلامیہ کا ایک بے حد وقیع خزانہ اردو زبان میں شبلی اکادمی کا رہین منت ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 اگست 2020

اردو: آزادی اور امن کی زبان

دھلی/دوحہ: برصغیر سے باہر یورپ کے مختلف ملکوں میں وہاں کی انتظامیہ اور حکومتیں بھی یہ بات قبول کرتی ہیں کہ اردو سے سماجی ہم آہنگی میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بات برطانیہ کے ممتاز شاعر و ادیب باصر سلطان کاظمی نے بزم صدف انٹرنیشنل کی جانب سے منعقد آن لائن مذاکرہ بہ عنوان 'اردو: آزادی اور امن کی زبان: ایک عالمی تناظر' میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ کو مختلف طبقوں اور اقوام کے درمیان ایشیائی زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا تو برطانیہ اور دوسرے یوروپی ممالک میں اردو کے لیے ماحول سازگار

خبرنامہ

ہے۔ ممتاز ادیب اور دہلی یونیورسٹی کے آرٹ فیکلٹی کے ڈین اور شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے امن اور آزادی کے امور پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ انقلاب اور محبت کی صفات کی آمیزش سے اردو کی عالمی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ انھوں نے اردو کے مزاج کے حوالے سے جگر مرادآبادی کا مصرعہ پیش کیا۔ اپنا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ مذاکرے میں موضوع کا تعارف بزم صدف کے ڈائرکٹر کالج آف کامرس، آرٹس اینڈ سائنس، پٹنہ کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر صفدر امام قادری نے کرایا۔ انھوں نے تاریخی تسلسل کے ساتھ مذاکرے کے موضوع امن اور آزادی کی زبان اردو کے مختلف پہلوؤں کی نشاندہی کی۔ پروفیسر قادری نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی کہ اردو بادشاہوں کی گود اور درباروں میں پلی بڑھی۔ انھوں نے اردو کے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو کی مثال پیش کی کہ دربار سے وابستگی کے باوجود انھوں نے اپنی مثنویوں میں امن و امان اور رعایا کی فلاح کی باتیں کہیں۔ مذاکرے میں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے بزم صدف کے چیئرمین شہاب الدین احمد نے بتایا کہ وبائی صورت حال سے پوری دنیا نبرد آزما ہے اور اس کی زد میں دنیا کے لاکھوں لوگ آتے جارہے ہیں۔ انھوں نے خاص طور سے ممتاز شاعر راحت اندوری کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے مخصوص شاعرانہ مزاج کے پیش نظر اس مذاکرے کا عنوان رکھا گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ راحت اندوری صرف شاعر نہیں تھے بلکہ امن و آزادی کے پیامبر بھی تھے۔ وہ بے امنی اور ظلم و ستم کے دشمن بھی تھے۔ ڈاکٹر واحد نظیر (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے مذاکرے میں اردو کے ابتدائی دور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے صوفیا نے سماج کے مجبور، مقہور اور مظلوم لوگوں کی تربیت اور اصلاح کے لیے اردو زبان کا استعمال کیا اور امن، انصاف، نجات اور آزادی کے پیغامات سے اس زبان کو مالا مال کیا۔ دوبئی سے تشریف فرما ریحان خاں نے اردو کو ایک ایسی زبان کے طور پر پہچاننے کی کوشش کی جو حد بندیوں اور تنگ نظریوں کے حصار کو توڑتی ہے۔

امریکہ میں مقیم ممتاز شاعرہ محترمہ حمیرا رحمان نے کہا کہ یہ دنیا ایک عالمی گاؤں ہے، اس لیے ایک دوسرے کی زبان سیکھنے اور استعمال کرنے کی ایک عام ضرورت ہے۔ کینیڈا سے ممتاز شاعرہ محترمہ شاہدہ حسن نے اپنے معروضات پیش کرتے ہوئے بتایا کہ عالمی سطح پر اردو ہماری امید اور یقین و اعتماد کی ترجمان ہے۔ مذاکرے کی نظامت ڈاکٹر ندیم ظفر جیلانی (برطانیہ) نے کی۔ بزم صدف کے سرپرست اعلیٰ محمد صبیح بخاری نے مہمانوں کا استقبال کیا اور وبائی عہد کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اردو زبان کے انقلابی مزاج اور امن پسند انداز کو یاد کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 اگست 2020

مشاعرہ جشن آزادی

نئی دھلی: 74 ویں یوم آزادی کی مناسبت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ نے 'مشاعرہ جشن آزادی' کے عنوان سے ایک ورچول مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس مشاعرے کی خاص بات یہ رہی ہے کہ اس میں اردو، ہندی، انگریزی کے علاوہ سنسکرت، فارسی اور عربی زبانوں میں بھی کلام پیش کیے گئے۔ منی پور کی گورنر اور جامعہ کی چانسلر ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ مشاعرے کی مہمان خصوصی تھیں۔ جامعہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے صدارت کی۔ اس مشاعرے کی ایک خاص بات یہ بھی رہی کہ اس میں سبھی شعرا جامعہ ہی کے تھے جو یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جامعہ کے شعبۂ اردو کے پروفیسر اور مشہور شاعر شہپر رسول مشاعرہ کے کنوینر تھے۔ جامعہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے مہمان خصوصی کا استقبال کیا اور سبھی کو 74 ویں یوم آزادی کی مبارک باد پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ کورونا وبا کی وجہ سے ایسے خوشگوار پل مشکل سے نصیب ہورہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ این آر آئی ایف رینکنگ میں جامعہ کا ٹاپ ٹین دانش گاہوں کی لسٹ میں آنا اور ایم ایچ آر ڈی کے ذریعے مرکزی یونیورسٹیوں کی کارکردگی میں جامعہ کا نام نمایاں رہنا ہم سب کے لیے فخر کی بات ہے۔ مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے مہمان خصوصی ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے بھی سبھی کو 74 ویں یوم آزادی کی مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انھیں خوشی ہے کہ جامعہ اتنا اچھا مظاہرہ کررہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کی لڑائی میں جامعہ نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کا مقام بہت اونچا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وزیر تعلیم رمیش پوکھریال 'نشنک' سے جامعہ کی بہترین کارکردگی کو لے کر ان کی بات ہوئی تھی اور انھوں نے بھی جامعہ کی بہترین کارکردگی پر خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ہپت اللہ نے کہا کہ ان کی یہ خواہش اور امید ہے کہ آنے والے دنوں میں جامعہ کی کارکردگی میں مزید بہتری آئے گی اور پوری دنیا میں اس ادارے کا نام روشن ہوگا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 اگست 2020

پیغام آفاقی کی تخلیقات کا فلسفیانہ اسلوب

نئی دھلی: عظیم ناول نگار پیغام آفاقی کے یوم وفات پر تسخیر فاؤنڈیشن اور دی ونکس فاؤنڈیشن دہلی کے

زیر اہتمام دو روزہ بین الاقوامی آن لائن سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک و بیرون ممالک کے تقریباً تین درجن سے زائد ناقدوں، دانشوروں اور ریسرچ اسکالروں نے اپنے مقالات اور خطبات پیش کیے۔ ان دانشوروں نے تسلیم کیا کہ پیغام آفاقی کے فکشن میں دانشوری کا ثبوت ملتا ہے۔ اپنی تخلیقات میں انھوں نے فلسفیانہ فکر کو بڑی اہمیت دی۔ جب اردو فکشن میں ماضی پرستی کا زور تھا تو انھوں نے 'مکان' جیسا ناول لکھا۔ آزادی کے بعد کے اکثر ناولوں میں تقسیم وطن کا نوحہ موجود ہے مگر آفاقی نے انحراف کرتے ہوئے 'مکان' جیسا بہترین ناول تخلیق کیا۔ اس سمینار میں پروفیسر غضنفر علی، پروفیسر انور پاشا، پروفیسر شافع قدوائی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر اسلم جمشید پوری، پروفیسر مولا بخش، ڈاکٹر صفدر امام قادری، پروفیسر اشرف کمال پاکستان وغیرہ نے خصوصی طور پر پیغام آفاقی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ان میں سے کئی مقررین نے کہا کہ پیغام آفاقی بے باک تھے۔ انھوں نے باضابطہ تنقید نہیں لکھی مگر ان کی تقریروں اور گاہے گاہے منظر عام پر آنے والی چھوٹی چھوٹی تنقیدی تحریروں میں ان کے تنقیدی نظریات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

مقررین نے کہا کہ پیغام آفاقی کی تخلیقات میں ٹھہراؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ پیغام نے تانیثی مزاحمت کے تناظر میں نیرا جیسا کردار اردو ناول کو دیا۔ اس پروگرام میں تقریباً دو درجن مقالات پیش کیے گئے، چند مقالہ نگاروں کے نام یہ ہیں: ڈاکٹر اسرار محمد جمیل (ناگپور)، نازیہ پروین (پاکستان)، ڈاکٹر جنتی جہاں (سعودیہ)، ڈاکٹر امتیاز احمد علیمی، ڈاکٹر صالحہ صدیقی (جامعہ ملیہ اسلامیہ)،

محبہ وشٹوری، صدام حسین، راحلہ پروین (اے ایم یو)، ڈاکٹر رقیہ نبی، وقار صدیقی، سکینہ اختر، سہیل سالم (کشمیر)، ریاض غوری، نعیم النسا، حارث حمزہ، ذیشان مصطفیٰ (جے این یو)، الیاس انصاری (ڈی یو)، شاہجہاں بیگم (اے پی)، نازیہ (چینئی) وغیرہ۔ جب کہ ڈاکٹر جاوید حسن، عبدالباری صدیقی اور جاوید عالم نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ مقالہ نگاروں نے پیغام آفاقی کی فکر اور ان کی تخلیقات کا بہترین تجزیہ پیش کیا۔

روزنامہ (انقلاب' دہلی، 23 اگست 2020

آزادیِ ہند میں اردو ادب کا کردار

نئی دہلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کی طرف سے دو روزہ آن لائن سمینار بہ عنوان 'آزادیِ ہند میں اردو ادب کا کردار' آن لائن منعقد کیا گیا۔ سمینار کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، چیئرمین ورلڈ اردو ایسوسی ایشن نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جنگ آزادی میں اردو زبان و ادب کے کردار پر جامع گفتگو کی۔ پروفیسر خواجہ اکرام نے کہا کہ جنگ آزادی میں اردو زبان و ادب کی مثالی خدمات رہی ہیں۔ اردو اس وقت رابطے کی زبان تھی۔ اردو ادب اور اخبارات نے ہی ہندستان میں آزادی کا بگل بجایا۔ اردو زبان و ادب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ اس سمینار میں کلیدی خطبہ جناب خلیل الرحمن نے پیش کیا۔ خلیل الرحمن عدالت عظمیٰ، جمہوریہ ہند میں سینئر وکیل ہیں۔ موصوف نے اپنے کلیدی خطبے میں اردو زبان و ادب کی تمام اصناف کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو نے جنگ آزادی میں سب سے اہم اور کلیدی کردار ادا کیا۔

افتتاحی سیشن کی صدارت فرما رہے پروفیسر انور پاشا نے صدارتی خطاب میں کہا کہ اردو زبان و ادب کے بغیر آزادی کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ اس سیشن میں مہمان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر محمد توحید خان، جناب نصر ملک (ڈنمارک) اور جناب ایلدوست ابراہیموف (آذربائیجان) نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کا یہ سمینار تاریخی نوعیت کا ہے۔ آزادیِ ہند میں اردو ادب نے جو گراں قدر کارنامے انجام دیے وہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ 'آزادیِ ہند میں اردو ادب کا کردار' کے عنوان پر پہلی نشست میں مقالہ نگاروں کی حیثیت سے ڈاکٹر سلیم محی الدین (اورنگ آباد)، ڈاکٹر سمیع الدین (بیدر کرناٹک)، ڈاکٹر صوفیہ شیریں (کلکتہ)، ڈاکٹر نعیم مظہر (اسلام آباد) ڈاکٹر رفعت جمال (بھوپال)، ڈاکٹر عثمان غنی (اسلام آباد) پرویز یوسف (کشمیر)، محیا واتموری (کرناٹک)، سیدہ جنیفر رضوی (مرشدآباد)، شافعہ رشید (سرینگر)، محمد سعید اختر (لکھنؤ) اور اسما بدر (کشمیر) نے شرکت کی جب کہ صدارت کے فرائض پروفیسر ندیم احمد جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) اور جناب نصر ملک (ڈنمارک) نے انجام دیے۔

دوسری نشست میں مقالہ نگاروں کی حیثیت سے توصیف احمد ڈار، سجاد رشید، مسرت آرا، سلمان جی کشمیر، عرشیہ اقبال (کلکتہ)، زیب النسا (جے این یو)، ثمن شاہ (مرشدآباد)، جگ موہن سنگھ (پٹیالہ)، تبسم آرا (حیدرآباد)، سید محمد تاج علی (مرشدآباد)، محمد عارف (جے این یو)، نفیس النسا ناصر (مرشدآباد)، عائشہ جے (تمل ناڈو)، تبسم پروین (بنگال) اور محمودہ قریشی (آگرہ) نے شرکت کی۔ جب کہ صدور کی حیثیت سے ڈاکٹر شفیع ایوب (جے این یو)، ڈاکٹر وصی بختیاری (آندھرا پردیش) اور ڈاکٹر مشتاق احمد (پرنسپل ملت کالج دربھنگہ) موجود رہے۔

تیسری اور آخری نشست میں مقالہ نگاروں کی حیثیت سے ڈاکٹر فرحت جہاں (جھارکھنڈ)، حارث حمزہ لون، محمد اشرف، شاہینہ یوسف، محمد فرید اعوان، عبدالقادر، نیرو سید، مسرت جہاں لون، سمیع اللہ آلائی (کشمیر)، قمرالنسا، ریشا قمر (تمل ناڈو)، محمد ارشد (دہلی)، فرحت نازیہ، طلعت پروین (کلکتہ)، سید راشد (بیدر)، شاہ جہاں بیگ (تروپتی)، رضوان الدین فاروقی (بھوپال)، ڈاکٹر ذاکراللہ فردوسی (تلنگانہ) اور ناصرالدین قمرالدین نے شرکت کی جب کہ صدارت کے فرائض پروفیسر ابن کنول (دہلی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر امتیاز وحید (کلکتہ یونیورسٹی کلکتہ) نے انجام دیے۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے جناب مصطفیٰ الپ (ترکی) شامل رہے۔ ان سب کے علاوہ زوم اور فیس بک پر تقریباً پانچ ہزار ناظرین ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے آن لائن سمینار سے وابستہ رہے۔ ایک خوش گوار اضافہ یہ ہوا کہ مشہور نغمہ نگار جناب جاوید اختر نے بھی اس سمینار میں ناظر کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس دو روزہ سمینار کی نظامت محمد رکن الدین، مہوش نور اور لیاقت رضا نے کی۔ کثیر تعداد میں ملک و بیرون ملک کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور اردو احباب شروع سے اخیر تک ایسوسی ایشن کے پروگرام میں حصہ لیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 اگست 2020

اتر پردیش

افسانہ 'بدنصیب ماں' کی پیش کش اور تجزیہ

علی گڑھ: پریم چند پوری زندگی عورتوں کے حقوق کے لیے کوشاں رہے۔ ہندوستانی سماج خصوصاً ہندو معاشرے

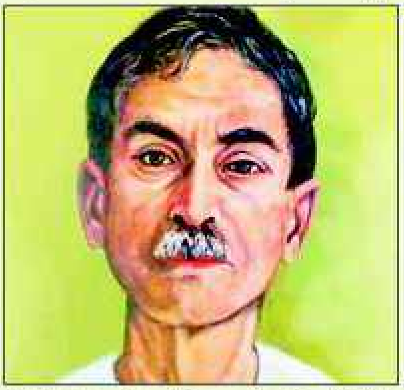

میں عورتوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک اور ظلم و زیادتی کے خلاف انھوں نے شد و مد کے ساتھ لکھا۔ وہ عورتوں کو ان کا جائز حق دلانے کے لیے عملی طور پر بھی سرگرم عمل رہے۔ ان خیالات کا اظہار معروف فکشن نقاد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سبک دوش استاد پروفیسر صغیر افراہیم نے 'بازگشت' آن لائن ادبی فورم کی جانب سے پریم چند کے افسانے 'بدنصیب ماں' کی پیش کش اور تجزیے پر مبنی گوگل میٹ پر منعقدہ پروگرام میں صدارتی خطبے کے دوران کیا۔

اس موقعے پر نئی نسل کی نقاد ڈاکٹر ریشما پروین، ایسوی ایٹ پروفیسر، کھن کھن جی گرلز ڈگری کالج، لکھنؤ نے افسانے کی پیش کش نہایت پراثر انداز میں کی۔ ڈاکٹر مشرف علی، استاد شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی نے افسانے کا باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہوئے اس افسانے کی فنی خصوصیات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ آج ہمارے عہد میں بزرگوں خصوصاً خواتین کو پہلے سے زیادہ نظرانداز کیا جانے لگا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ نئی نسل خواتین خصوصاً بڑی عمر کی عورتوں کا احترام دل و جان سے کرے اور گھر اور سماج میں انھیں ان کے حقوق دیے جائیں۔ ڈاکٹر سید محمود کاظمی استاد شعبۂ ترجمہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، ڈاکٹر احمد خان، استاد مرکز مطالعات اردو ثقافت، مانو، ڈاکٹر محمد کاظم استاد شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، جناب ظہیر انصاری مدیر 'تحریر نو' ممبئی اور ڈاکٹر ناظم علی، سبک دوش استاد، حیدرآباد نے افسانے سے متعلق مباحث میں حصہ لیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 24 اگست 2020

بہار

اردو زبان جدید ٹکنالوجی کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوا رہی ہے: شیخ عقیل احمد

دربھنگہ: سوشل میڈیا میڈیا کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔ سوشل میڈیا نے جہاں کچھ لوگوں کو مقبول کر دیا

ہے وہیں کچھ غیر معیاری چیزیں بھی مختلف گروپوں میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ کسی کے اشعار کسی دوسرے کے نام سے لوگ بھیجتے رہتے ہیں۔ یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کیا آج سوشل میڈیا واقعتاً اتنا مضبوط ہو چکا ہے۔ کیا آج غالب اور ٹیگور کو سوشل میڈیا کی ضرورت ہے؟ بلکہ یوں کہا جائے کہ آج سوشل میڈیا کو ان کی ضرورت ہے۔ یہ باتیں صدر شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ پروفیسر شہزاد انجم نے سی ایم کالج دربھنگہ کے زیر اہتمام 'اردو زبان و ادب کا عصری منظرنامہ اور سوشل میڈیا' کے موضوع پر منعقدہ یک روزہ قومی ویبینار کے افتتاحی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کہیں۔ ویبینار کے مہمان خصوصی ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ اردو زبان جدید ٹکنالوجی کے میدان میں بھی اپنا لوہا منوا رہی ہے۔ آج اردو زبان دنیا کے کونے کونے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور سوشل میڈیا میں بھی اردو زبان و ادب نے ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ کورونا جیسی وبا نے ہمارے جینے کا انداز تبدیل کر دیا ہے اور ہمیں ایک راہ دکھائی کہ ہم ایک دوسرے سے جڑ سکیں اور سوشل میڈیا کی مدد سے اردو زبان و ادب کی خدمت کر سکیں۔ ویبینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ ڈیجیٹل ٹکنالوجی نے ہماری زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے اور مجازی علائم ہماری زندگی کا حصہ بن گئے ہیں۔ یہ صدی امکانات کی صدی ہے اور ہمیں اردو زبان کے حوالے سے کام کرنے کی کوشش کرنی ہوگی تاکہ ہم سوشل میڈیا اور ڈیجیٹل دنیا میں اپنی قابل ذکر موجودگی درج کر سکیں۔ اس سے قبل سی ایم کالج کے پرنسپل اور معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر مشتاق احمد نے بھی مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ڈیجیٹل ٹکنالوجی کی دنیا میں اردو کو مزید فروغ دینے کے لیے اس ویبینار کا اہتمام کیا گیا ہے۔ انھوں نے سی ایم کالج کا مختصر تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ کالج 1938 میں قائم ہوا تھا اور یہ شمالی ہند کے آکسفورڈ کے طور پر مقبول رہا ہے۔ آزادی ہند کے متوالوں کا بھی یہ مرکز رہا ہے۔ آنجہانی کرپوری ٹھاکر، للت نارائن مشرا، یوگیندر جھا جیسے لوگ اس کالج کے طالب علم رہے تھے۔ اردو زبان و ادب کے حوالے سے اگر دیکھیں تو مظہر امام، علقمہ شبلی، منظر شہاب، منظر کاظمی، پروفیسر لطف الرحمن، قمر اعظم ہاشمی، جیسے نامور ادیبوں و شاعروں نے کالج کا نام روشن کیا ہے۔ کالج کے 27 طلبا کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ مل چکا ہے اور 17 لوگوں نے پدم شری جیسا باوقار اعزاز حاصل کیا ہے۔ شعبہ اردو، سی ایم کالج، دربھنگہ کے پروفیسر سید محمد احتشام الدین نے افتتاحی سیشن میں کلمات تشکر ادا کیے۔ ویبینار کے تکنیکی سیشن کی صدارت کرتے ہوئے ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ کے صدر شعبہ اردو پروفیسر آفتاب اشرف نے کہا کہ اردو دنیا کی ممتاز زبانوں میں سے ایک ہے۔ جدید برقی وسائل کا استعمال اردو کو مزید فروغ دینے میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ انھوں نے تمام مقالوں پر بھی اظہار خیال کیا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ندیم احمد نے اپنی تقریر میں کہا کہ آج سوشل میڈیا ایک برانڈ سازی ہے اور اس میں بہت زیادہ امکانات ہیں اور ہمیں اس کے مثبت پہلوؤں پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر محمد کاظم نے اردو زبان و ادب پر سوشل میڈیا کے اثرات کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ معروف ادیب و شاعر ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے اپنے مقالے میں کہا کہ سوشل میڈیا نے ایک شخص کو دوسرے سے جوڑا ہے اور رشتوں کو مضبوطی دی ہے۔ سوشل میڈیا میں صاف ستھری چیزیں پیش کرنی چاہئیں اور اردو رسم الخط کا استعمال زیادہ سے زیادہ کیا جائے تب ہی اردو زبان و ادب کو نئی جہت ملے گی۔ ڈاکٹر نشاں زیدی نے سوشل میڈیا اور اردو افسانہ کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر شاہانہ مریم شان نے اردو زبان کی ترقی اور سوشل میڈیا کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر محمد ارشد حسین نے بھی ڈیجیٹل ٹکنالوجی اور اردو کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ویبینار کے افتتاحی اجلاس کی نظامت عبدالحی نے کی جبکہ تکنیکی اجلاس کی نظامت کی فرائض ڈاکٹر مسرور صغری نے بحسن و خوبی انجام دیے۔ سی ایم کالج دربھنگہ کے شعبہ اردو میں استاد ڈاکٹر نفاست کمالی کے کلمات تشکر سے یہ ویبینار اپنے اختتام کو پہنچا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اگست 2020

تلنگانہ

اردو کی شعری اور نثری اصناف

حیدرآباد: شعبہ اردو نیو کالج، چینئی کے زیر اہتمام دو روزہ بین الاقوامی ویبینار کا انعقاد بعنوان 'اردو کی شعری اور نثری اصناف' منعقد کیا گیا، جس میں ملک و بیرون ملک کے اردو محققین، ناقدین، پروفیسرز اور ریسرچ اسکالروں نے شرکت کی اور اردو کی شعری و نثری اصناف پر اپنے مقالے اور خطبات پیش کیے۔ نیو کالج، میاسی کے چیئرمین، سلطنت والا جاہی خاندان کے چشم و چراغ نواب عبدالعلی عظیم جاہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو سے زیادہ شیریں کوئی زبان نہیں ہے۔ اردو کے تئیں لوگوں کی اس غلط فہمی کو میں دور کر دینا چاہتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے اور آج کے اس عالمی ویبینار سے معلوم ہوا کہ یہ ایک عالمی زبان ہے۔ میاسی کے سابق سکریٹری اے محمد اشرف، میاسی کے خازن الیاس سیٹھ اور نائب سکریٹری منڈی اسلم نے مشترکہ طور پر یہ بات کہی کہ اردو کو فروغ دینے کے لیے شعبہ اردو نیو کالج، چینئی اپنے قیام کے روز اوّل سے ہی کوشاں ہے اور اس کے مثبت نتائج سامنے آ رہے ہیں، ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ پورے تمل ناڈو میں یہ واحد ادارہ ہے جہاں بی اے اردو کی تعلیم کا نظم ہے، لیکن اردو اساتذہ اور دانشوران کو اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ اردو کو روزگار سے جوڑا جائے تاکہ اردو پڑھنے والے طلبا احساس کمتری کا شکار نہ ہوں۔ پروفیسر سید سجاد حسین سابق صدر شعبہ اردو، مدراس یونیورسٹی نے کلیدی خطاب میں تمام اصناف پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کے شعری اصناف دو طرح کے ہیں، ایک بلحاظ موضوع جس میں حمد باری تعالیٰ، نعت شریف، غزل، قصیدہ، مرثیہ وغیرہ شامل ہیں اور دوسرا بلحاظ ہیئت جس میں مثنوی، رباعی، قطعہ، مسمط، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند وغیرہ شامل ہے۔ الازہر یونیورسٹی مصر کے شعبہ اردو کی ایسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر نہا مصطفیٰ محمود سعد نے پیروڈی اور ابن انشا کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پیروڈی نثر اور شعر دونوں میں پائی جاتی ہے، لیکن اشعار میں پیروڈی کرنا نثر

کے مقابلہ میں زیادہ آسان ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ میرا ماننا یہ ہے کہ اردو کی جتنے شعری ونثری اصناف ہیں وہ اپنے ادوار اور اقدار سے جنم لیتی ہیں، جیسا دور اور عہد ہوگا اسی کی مناسبت سے اصناف ادب کا وجود ہوتا رہے گا۔ جیسے داستان نے ناول کی شکل اختیار کرلی، ناول افسانہ کی شکل میں وجود میں آیا اور افسانہ نے افسانچہ کی شکل اختیار کرلی۔ طنطا یونیورسٹی مصر کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر بسنت محمد شکری نے راحت اندوری کی غزل گوئی پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ راحت اندوری جدید غزل کے ایک بہترین شاعر تھے، ان کی غزل میں زندگی کی قوت، حقائق کا ادراک، تہذیبی روایات اور وطن سے محبت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ڈین فیکلٹی آف لینگویجز پروفیسر نسیم الدین فریس نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو کے تمام اصناف کے مبادیات، اصول، ضوابط، حدود اور موضوعات طے ہیں جن سے صنف کو پہچانے میں کافی مدد ملتی ہے لیکن جو بڑا فنکار ہوتا ہے وہ بعض اوقات ان حدود کی پابندی نہیں کرتا، چنانچہ علامہ اقبال نے کئی مقامات پر ان حدود کی پابندی نہیں کی ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو باہر کر کے دیکھا جائے تو وہ غزل کے اشعار معلوم ہوتے ہیں۔ امریکہ کے مہمان خصوصی ڈاکٹر قاضی اظہر نے اردو صنف سخن اور سائنس میں جو ہم آہنگی ہے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور کہا کہ سائنس اور اردو میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اردو صرف گل وبلبل کی شاعری کا نام نہیں ہے بلکہ غور وفکر اور مشاہدے سے بھی عبارت ہے، انھوں نے کہا کہ شاعر اور سائنس داں میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے کیونکہ دونوں گہرے مشاہدے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

روزنامہ صحافت، دہلی، 24 اگست 2020

امجد حیدرآبادی یادگار آن لائن توسیعی لیکچر

حیدرآباد: امجد ایک ہمہ جہت شخصیت تھے، امجد حیدرآبادی نے اپنی رباعیات میں قرآنی آیات کو اسی وزن اور اعتبار سے پرویا ہے۔ یہ امجد کا ہی کمال تھا۔ امجد نے اردو اور فارسی میں رباعیات کہی ہیں، امجد کی رباعیات کے موضوعات مقام انسان، حقوق انسان، فضیلت انسان، انسانیت اور تصوف ہیں۔ موجودہ دور میں امجد کی رباعیات اخلاقی سدھار کا اہم ذریعہ ہیں اور امجد کے پیغام کو عام کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہا ممتاز محقق و ماہر اقبالیات وفیض جناب ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے ''رباعیات امجد حیدرآبادی کی معنویت' کے عنوان پر اردو اسکالرس ایسوسی ایشن تلنگانہ کے زیر اہتمام' امجد حیدرآبادی یادگار' آن لائن توسیعی لیکچر سے کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی کناڈا سے بذریعہ زوم کالنگ خطاب کر رہے تھے اور دنیا بھر سے ریسرچ اسکالرز اساتذہ اور محبان اردو نے ان کے بصیرت افروز خطاب سے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے امجد حیدرآبادی کی حیات کے مختلف گوشوں کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ رباعی گوئی میں امجد حیدرآبادی کو انفرادیت حاصل تھی۔ امجد کی شاعری میں اخلاقیات کا درس پایا جاتا ہے۔ امجد حیدرآبادی کی شاعری میں دل کی آواز پائی جاتی ہے، انسانی زندگی کا رخ نظر آتا ہے۔ امجد کی شاعری پاکیزہ ہے، ان کے خیالات اعلی ہیں۔ امجد کی رباعیات کوہ نور ہیرے کی مانند ہیں۔ اس آن لائن پروگرام میں پروفیسر فاطمہ پروین، سابق صدر شعبہ اردو عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ امجد حیدرآبادی کو اہل حیدرآباد کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ امجد حیدرآبادی پر عثمانیہ یونیورسٹی میں تحقیقی کام ہوا ہے، اس کو شائع کرانے کی ضرورت ہے۔ امجد کی زندگی یگانہ روزگار ہے، حرف شکایت کبھی ان کی زبان پر نہیں آیا۔ امجد نے کسی مصیبت کا گلہ نہیں کیا آج اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم امجد حیدرآبادی کی حیات سے سبق حاصل کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ نوجوان امجد حیدرآبادی کو اپنا رول ماڈل بنائیں، امجد حیدرآبادی کے پیام کو آگے تک پہنچائیں۔ پروگرام کے آغاز میں ڈاکٹر اسلم فاروقی نے تنظیم کے مقاصد کو بیان کیا اور کہا کہ

تلنگانہ ریسرچ اسکالرز ایسوسی ایشن ملک بھر کی جامعات کے اردو ریسرچ اسکالرز کی رہنمائی کررہی ہے۔ پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر سید فضل اللہ مکرم، صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ دنیا بھر سے اس آن لائن پروگرام میں شریک ہونے والوں میں ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، پروفیسر رضا زیدی، ڈاکٹر وصی اللہ بختیاری، ڈاکٹر محمد ناظم علی، ڈاکٹر نثار احمد، ڈاکٹر امین الدین، ڈاکٹر گل رعنا، ڈاکٹر ابرار الباقی، ڈاکٹر حسن سنجری، ایڈوکیٹ خلیق الرحمن، محمد عبدالبصیر پرنسپل، رحمن داؤدی، مصطفیٰ علی سروری، صبیح الدین صبیح رحمانی، ڈاکٹر عظمی تسنیم، ڈاکٹر ریشما پروین، ڈاکٹر حمیرہ سعید، نسا فردوس کے علاوہ ملک بھر کی مختلف جامعات کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس، اور محبان اردو نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: معمار جہاں، 22 اگست 2020

اعزاز واکرام

آذرمیدخت صفوی

علی گڑھ: ممتاز فارسی اسکالر پروفیسر آذرمیدخت صفوی، سابق ڈین، آرٹس فیکلٹی اور سابق صدر، شعبہ فارسی کو حکومت ہند کی وزارت ثقافت نے موقر ٹیگور نیشنل

فیلوشپ برائے ثقافتی تحقیق (ٹی این ایف سی آر) سے سرفراز کیا ہے۔ اس فیلوشپ کے تحت پروفیسر صفوی ہندوستانی ثقافت اور تاریخ سے متعلق فارسی کے قیمتی نسخوں پر کام کریں گی۔ اس فیلوشپ کے دوران 80 ہزار روپے ماہانہ اور سالانہ ڈھائی لاکھ روپے کی ہنگامی گرانٹ دی جاتی ہے۔ یہ اعزاز ان اسکالرز کو دیا جاتا ہے جن کے پاس قابل قدر علمی یا پیشہ ورانہ استاد ہیں اور جن کی علم کے فروغ میں نمایاں حصہ داری ہے۔ پروفیسر صفوی نے کئی اعزاز حاصل کیے ہیں اور اپنی مادر علمی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا نام روشن کیا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر معروف

فارسی اسکالر کی حیثیت سے انھیں کئی موقر اعزازات سے سرفراز کیا جاچکا ہے جن میں پریسیڈنٹ آف انڈیا ایوارڈ، لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، ایران، غالب ایوارڈ اور حکومت ایران کا سعدی ایوارڈ شامل ہیں۔ وہ ہندوستان میں پہلی فارسی اسکالر ہیں جنھوں نے ٹیگور قومی فیلوشپ حاصل کی۔ پروفیسر صفوی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بانی اور سابق ڈائریکٹر ہیں۔ فی الحال وہ اس انسٹی ٹیوٹ کی مشیر ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 4 ستمبر 2020

مشرف عالم ذوقی

نئی دهلی: پچھلی بار ادارہ کسوٹی جدید نے مفکر جمالیات بابا سائیں پروفیسر شکیل الرحمن کو ان کی مجموعی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں معین الدین خاں لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازنے کا شرف حاصل کیا تھا۔ سال 2020 کے لیے یہ ایوارڈ فکشن (ناول، افسانہ اور

ڈرامہ نگاری)، صحافت، خاکہ نگاری جیسی مختلف اردو نثری اصناف میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے اردو ادب کی ہمہ جہت شخصیت مشرف عالم ذوقی کو دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا جو انھیں نومبر کے آخری ہفتہ میں پیش کیا جائے گا۔ مشرف عالم ذوقی ہندوستان کے فکشن نگاروں میں اپنی منفرد تخلیقات کی وجہ سے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اب تک ان کے تیرہ ناول اور افسانوں کے سات مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ خاکہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو چاروں طرف دھوم مچادی۔ یہ بھی کہا گیا کہ ادبی خاکہ نگاری کی تاریخ میں ذوقی کے خاکے اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے دیگر اصناف میں بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں اور ان کی مطبوعات کی کل تعداد 50 سے بھی زیادہ ہے۔ ان کا فکشن اردو تک محدود نہیں ہے بلکہ ہندی اور دوسری زبانوں کے رسائل اور جرائد میں بھی ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ وہ اس عہد کے ان فن کاروں میں ہیں جن کا تخلیقی سفر ہنوز جاری ہے۔ نومبر میں ایوارڈ کے ساتھ مشرف عالم ذوقی کی ادبی خدمات پر کسوٹی جدید کا ایک خصوصی شمارہ بھی شائع کیا جائے گا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اگست 2020

آسیہ

دیوبند: اترپردیش حکومت کی جانب سے اس سال تعلیم کے میدان میں اعلیٰ خدمات انجام دینے والوں کو 'راجیہ پال پرسکار' کے لیے منتخب کیے جانے والے اساتذہ میں ضلع سہارنپور کے پنوار کا بلاک کے تحت آنے والے گاؤں منوہر پور میں واقع پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس بھی منتخب ہوئی ہیں۔ محکمہ تعلیم نے اس اعزاز کے لیے حکومت کو اساتذہ کے نام منتخب کرکے بھیجے تھے۔ محکمہ کے جوائنٹ سکریٹری راجندر سنگھ نے اس ایوارڈ کے لیے ریاست بھر سے منتخب کیے گئے اساتذہ کی فہرست جاری کی جس میں سہارنپور سمیت 73 اضلاع کے اساتذہ کے نام شامل ہیں۔ سہارنپور میں سرساوہ بلاک کے گاؤں موہن پور میں واقع پرائمری اسکول میں تعینات آسیہ کا نام بھی منتخب ہوا ہے۔ بی ایس اے سہارنپور رامندر کمار سنگھ نے بتایا کہ ٹیچر آسیہ نے تعلیمی کارکردگی میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ہے، اس لیے ان کو منتخب کیا گیا ہے۔ ان کے انتخاب پر ضلع کے تمام اساتذہ نے خوشی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے انگلش ٹریننگ حاصل کی۔ آسیہ نے گھریلو معاشی تنگی کے دوران ٹیوشن پڑھا کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ سال پرائمری اسکول میں ہوا۔ بعدازاں سال 2014 میں محکمہ تعلیم نے ان کی تدریسی خدمات کے صلہ میں ترقی دے کر ہیڈ مسٹریس مقرر کیا۔ آسیہ اپنے فرائض منصبی کو ایمانداری، خلوص اور لگن کے ساتھ انجام دینے والی خاتون ہیں۔ ان کی اس شاندار کامیابی اور گورنر کی جانب سے دیے جانے والے اعزاز کے لیے منتخب ہونے پر اردو ٹیچر ایسوسی ایشن سے منسلک تمام اساتذہ کا کہنا ہے کہ آسیہ حقیقی معنوں میں اس اعزاز کی مستحق ہیں کیونکہ انھوں نے نہایت مشکل حالات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہ بھرپور محنت اور لگن کے ساتھ تعلیمی خدمات انجام دینے میں مصروف ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 4 ستمبر 2020

رسم اجرا

نقوش زندگی

رائے بریلی: وکیل احمد انصاری ایک ملی وسماجی شخصیت

تھے، جو ہمہ وقت ملت کی بہی خواہی کے لیے کوشاں رہتے تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے انھیں غیر معمولی محبت وتعلق تھا، وہ خود وکیل تھے مگر ان کا معمول تھا کہ وہ اپنے تمام امور میں مشورہ ضرور کرتے تھے، خوشی کی بات ہے کہ ان کی خودنوشت سوانح حیات منظر عام پر آئی، جس کو ان کے ہونہار فرزند ڈاکٹر انور حفیظ ندوی نے بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ ان خیالات کا اظہار حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی (صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے کتاب کی رسم اجرا کی تقریب میں کیا۔ واضح رہے کہ یہ تقریب حضرت کی قیام گاہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں منعقد ہوئی۔ وکیل صاحب مرحوم کے بڑے صاحبزادے ڈاکٹر اختر سعید انصاری نے اپنے افتتاحی کلمات میں کہا کہ والد ماجد کی ابتدائی زندگی انتہائی تنگی اور مشقت میں گزری، مگر وہ ایک صاحب عزیمت انسان تھے جن کی غیر معمولی جدوجہد سے آج پورے جونپور میں ان کی محنتوں کے نقوش نظر آتے ہیں۔' وکیل صاحب مرحوم کی حیات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی نے کہا کہ وکیل صاحب عالمانہ وقار اور درد وفکر رکھنے والے دانشور تھے، جن کا ہمیشہ علما و مشائخ سے مخلصانہ تعلق رہا، ان کا شمار داعیوں کی صف میں ہوتا تھا۔' کتاب کے مرتب ڈاکٹر انور حفیظ ندوی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ 'والد ماجد نے مختلف رفقا واحباب کے اصرار پر اپنی چند یادیں قلم بند کرادی تھیں، جواب قارئین کی خدمت میں اہم وقیمتی اضافوں کے ساتھ حاضر ہیں۔' اس موقعے پر وکیل صاحب مرحوم کے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر عبدالرحمن مجاہد، مولانا سید جعفر حسنی ندوی، مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی، انجینئر عثمان صاحب، مولوی محمد ارمغان بدایونی ندوی وغیرہ بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اگست 2020

میرے ہم سفر

اورنگ آباد: اورنگ آباد میں 16 اگست کو بابائے اردو مولوی عبدالحق کو ان کے یوم وفات کے موقعے پر ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن کی جانب سے منعقدہ مختصر مگر پروقار تقریب

میں ڈاکٹر یوسف صابر، مدیر عکسِ ادب اورنگ آباد، کی خاکوں پر مشتمل کتاب 'میرے ہم سفر' کی رسم اجرا قاضی نوید صدیقی، صدر شعبۂ اردو مولانا ابوالکلام آزاد کالج اورنگ آباد، کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ تقریب کی صدارت کے فرائض سید عطاء اللہ شاہ، موظف، اکاونٹ آفیسر نے انجام دیے۔ 'میرے ہم سفر' کتاب پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے قاضی نوید نے کہا کہ اردو زبان کے حوالے سے پوری دنیا میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کا نام بڑی عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ ان کی مشہور زمانہ کتاب 'چند ہم عصر' جو خاکوں کا مجموعہ ہے، اس میں ایک عام انسان کو بھی جگہ دی گئی ہے جیسے 'نام دیو مالی' پر ان کا خاکہ بہت مشہور ہے۔ ریڈ اینڈ لیڈ فاونڈیشن کے صدر مرزا عبدالقیوم ندوی نے کہا کہ موجودہ دور میں اردو کتابوں، رسائل و جرائد کی نکاسی بڑا مشکل کام ہے۔ خصوصاً کتابوں کی طباعت و اشاعت کے مسائل، کتاب شائع ہونے کے بعد اس کی تشہیر و ترسیل کے ساتھ کتابوں کا رسم بڑا دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے۔ اس لیے ریڈ اینڈ لیڈ فاؤنڈیشن نے مرزا ورلڈ بک ہاؤس پر ایک گوشہ و سلسلہ 'مصنف سے ملیے' کا شروع کیا ہے۔ جہاں نئے لکھنے والوں کو پلیٹ فارم مہیا کرایا جاتا ہے۔ صدارتی خطاب میں عطاء اللہ شاہ مصنف کو ان کی کتاب پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر یوسف صابر اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ میں غیر مسلم شعرا کی خدمات پر کتابیں لکھی ہیں۔ کتاب کے بارے میں تفصیل بتاتے ہوئے یوسف صابر نے کہا کہ اس کتاب میں کل 27 شخصیتوں پر خاکے ہیں جن میں کچھ وفات پا چکی ہیں اور کچھ ابھی بقید حیات ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ یہ کتاب ان شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے جو میرے ہم سفر رہے۔ پروگرام کی نظامت پربھنی کے مشہور و معروف شاعر شفیع احمد شفیع کی اور کتاب میں ان پر خاکہ لکھنے پر مصنف کا شکریہ بھی ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 17 اگست 2020

آئینہ گر

علی گڑھ: اردو ادب کی توسیع و اشاعت میں خواتین غیر معمولی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار صدر جلسہ پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے بزم ادب خواتین کے زیر اہتمام منعقد جلسہ میں کیا۔ وہ بیگم آصف اظہار علی کے مجموعہ کلام 'آئینہ گر' کی رسم اجرا

تقریب کو خطاب کر رہے تھے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر مولا بخش نے کہا کہ بیگم آصف اظہار علی نے اپنی شاعری میں ماں کے کردار کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔ مسلم یونیورسٹی شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ بیگم آصف اظہار علی کی شاعری میں لہجہ کا دھیما پن، استعجاب کا انداز اور سرگوشی کی کیفیت ان کے اساتذہ خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو ان کے آئیڈیل استاد رہے۔ اس موقعے پر بیگم آصف اظہار علی کی شاعری پر ملک اور بیرون ملک سے بھی آن لائن اظہارِ خیال کیا گیا جس میں پروفیسر سیما صغیر، خلیل الرحمٰن اعظمی کی دختر ہما خلیل، عذرا نقوی (دہلی)، کویت سے مجیب اختر اور دبئی سے فیصل اظہار اور فراز اظہار وغیرہ کے نام شامل ہیں، جلسے کی نظامت کرتے ہوئے معروف افسانہ نگار افشاں ملک نے بھی شرکا کا خیر مقدم کیا اور اردو ادب میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کو بزم ادم خواتین کی جانب سے تہنیتی نشان سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 اگست 2020

ڈاکٹر ناصر کی دو کتابوں کی رسم اجرا

اورنگ آباد: مولانا آزاد کالج، ڈاکٹر رفیق زکریا کیمپس، اورنگ آباد کے پرنسپل ڈاکٹر مظہر احمد فاروقی کے

ہاتھوں ڈاکٹر رفیع الدین ناصر صدر شعبہ نباتات و قومی اعزاز یافتہ معلم کی اردو زبان میں تحریر کردہ دو کتابوں 'اورنگ آباد کے اہم طبی نباتات' اور دوسری 'بنیادی نباتات' کا اجرا ایک پروقار تقریب میں بتاریخ 4 ستمبر بروز جمعہ بمقام مولانا آزاد کالج، ڈاکٹر رفیق زکریا کیمپس، اورنگ آباد (مہاراشٹر) عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر مظہر فاروقی نے فرمایا کہ مولانا آزاد کالج ہمیشہ سے اساتذہ اور طلبا کی تحریری صلاحیت کو منظر عام پر لانے میں اہم کردار ادا کرتا آرہا ہے۔ مرحوم ڈاکٹر زکریا اور موجودہ چیرمین پدم شری محترمہ فاطمہ زکریا اس طرح کی کاوشوں کو ہمیشہ سے سراہتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر نے اردو زبان میں اس طرح کی 34 کتابیں شائع کرکے بہت حد تک اردو قاری کی تشنگی دور کی ہے، میں انھیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

اس موقعے پر وائس پرنسپل ڈاکٹر ایم اے باری نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو میں سائنسی معلومات پیش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر ناصر کو مبارکباد پیش کی اور نیک خیالات کا اظہار کیا۔ اس تقریب میں شمیلا یاسمین، ڈاکٹر موسیٰ رزاق نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور دونوں کتابوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر نے اپنے خطاب میں کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع شدہ کتاب 'اورنگ آباد کے اہم طبی نباتات' دراصل ایک تحقیقی پیشکش ہے جس میں ہمارے ماحول میں پائے جانے والے عام فہم پودوں کے طبی استعمال کے ساتھ ساتھ ان کی ساخت، دستیابی اور سائنسی ناموں کو ہر ایک پودے کی رنگین تصویر کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ جبکہ دوسری کتاب جو مہاراشٹر ا اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکاڈمی ممبئی کے مالی تعاون سے شائع 'بنیادی نباتات' ایک عام اردو قاری کو نباتات کے تعلق سے تمام بنیادی معلومات فراہم کرتی ہے۔ اس میں موجود بہترین اشکال اور تصاویر قاری کو نباتات کی معلومات کو آسانی سے ذہن نشین کراتی ہیں۔ اس پروقار تقریب میں ڈاکٹر ذوالفقار شیخ (صدر شعبہ حیوانیات)، ڈاکٹر محمد الیاس (شعبہ کمپیوٹر)، ڈاکٹر کلیم (شعبہ انگلش)، فزکس کے لیکچرر شیخ عباس کے علاوہ تدریسی اور غیر تدریسی عملہ نے شرکت کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر، اسسٹنٹ پروفیسر مولانا آزاد کالج، ڈاکٹر رفیع زکریا کیمپس، اورنگ آباد، مہاراشٹر 7 ستمبر 2020

وفیات

سابق صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی

نئی دہلی: بھارت رتن سے نوازے گئے سابق صدر پرنب مکھرجی کا طویل علالت کے بعد 31 اگست کو انتقال ہوگیا۔ وہ 84 برس کے تھے۔ ان کے کنبے میں دو بیٹے اور

ایک بیٹی ہیں۔ ان کی اہلیہ شبھا مکھرجی کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔ مسٹر مکھرجی کے انتقال کی خبر ملتے ہی پورے ملک میں صدمہ کی لہر دوڑ گئی۔ صدر رامناتھ کووند، نائب صدر ایم وینکیا نائیڈو اور وزیر اعظم نریندر مودی، لوک سبھا اسپیکر اوم برلا، مرکزی وزیر داخلہ امت شاہ، وزیر دفاع راجناتھ سنگھ، کانگریس کی صدر سونیا گاندھی، کانگریس کے سابق صدر راہل گاندھی سمیت مختلف سیاست دانوں نے مسٹر مکھرجی کے انتقال پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ملک کے لیے اسے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا ہے۔ سابق صدر پرنب مکھرجی 21 دنوں سے فوج کے ریسرچ اینڈ ریفرل اسپتال میں داخل تھے۔ انھیں 10 اگست کو دماغ میں خون جمنے کی جانچ کے دوران کورونا سے متاثر پایا گیا تھا۔ خون کے دھبوں کو ہٹانے کے لیے ان کی زندگی بچانے والی ایمرجنسی سرجری کی گئی تھی اور انھیں گہری نیم بے ہوشی کی حالت میں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تھا۔ اسی درمیان ان کے سینہ اور پھیپھڑوں میں انفیکشن پھیلتا گیا۔ مسٹر مکھرجی کی پیدائش مغربی بنگال ضلع کے کرنبار کے نزدیک مراتی گاؤں کے مسٹر کامدا کنکر مکھرجی اور محترمہ راج لکشمی مکھرجی کے یہاں ایک برہمن کنبہ میں ہوئی تھی۔ انھوں نے سوری ودیا ساگر کالج سے تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے کلکتہ یونیورسٹی سے تاریخ اور پولیٹیکل سائنس میں پوسٹ گریجویٹ اور قانون کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری بھی ملی۔ ان کے مشاغل پڑھنا، باغبانی اور موسیقی سننا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس میں تقریباً پانچ دہائی طویل سیاسی کیریئر کے بعد وہ ہندوستان کے تیرہویں صدر بنے۔ انھیں 26 جنوری 2019 کو بھارت رتن سے نوازا گیا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 1 ستمبر 2020

پروفیسر فضل امام

لکھنؤ: نامور ناقد و ادیب اور الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر فضل امام کا انتقال ہوگیا۔ علالت کے بعد انھیں شہر کے پرائیویٹ اسپتال میں داخل

کیا گیا تھا، جہاں انھوں نے آخری سانسیں لیں۔ ان کی تدفین مچھلی گاؤں امبیڈکر نگر میں ہوئی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ پروفیسر فضل امام الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر تھے۔ ان کی عمر تقریباً 80 برس تھی۔ انھوں نے پی ایچ ڈی امیر اللہ تسلیم اور ڈی لٹ میر انیس پر کی تھی، جو ان کا نمایاں کام ہے۔ تاریخ اسلام اور عالم اسلام پر ان کی گہری نظر تھی۔ قلم کے ساتھ ساتھ وہ گفتگو کے دھنی اور ماہر خطیب بھی تھے۔ رثائی ادب، جدید و قدیم تنقید پر اہم کام انجام دیا۔ وہ بیک وقت نقاد، ادیب، شاعر، خطیب بھی تھے۔ اردو، فارسی اور عربی زبان کے ماہر ہونے کے ساتھ ان زبانوں پر خاصا کام کیا۔ وہیں، سنسکرت اور ہندی پر بھی انھیں دسترس حاصل تھی۔ بھوجپوری اور راجستھانی زبان میں بھی انھوں نے تاریخی کام کیا ہے۔ ان کی زیر نگرانی درجنوں طلبہ نے اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی ہے۔ پروفیسر فضل امام کے مورث اعلیٰ حضرت سید جمال الدین عہد تغلق میں ہندوستان وارد ہوئے تھے اور قاضی القضاۃ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ پروفیسر امام کے والد کا نام سید مشتاق حسین تھا۔ 7 اگست 1940 کو موضع بہاء الدین پور ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ بعد میں اپنی سسرال مچھلی گاؤں امبیڈکر نگر میں منتقل ہوگئے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد انٹر ایس این انٹر کالج اندئی پور فیض آباد سے کیا۔ وہ ایم ایل کے کالج بلرامپور، راجستھان یونیورسٹی جے پور، الہ آباد یونیورسٹی سمیت دیگر تعلیمی اداروں سے منسلک رہے۔ اتر پردیش سیکنڈری ایجوکیشنل کمیشن کے چیئرمین بھی ہوئے۔ الہ آباد یونیورسٹی ٹیچرس ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہ چکے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 ستمبر 2020

مرتضیٰ ساحل تسلیمی

نئی دہلی: ادب اطفال کی مایہ ناز شخصیت مرتضیٰ ساحل تسلیمی کا 21 اگست کی شب گیارہ بجے دہلی کے میٹرو اسپتال لاجپت نگر میں انتقال ہوگیا۔ مرتضیٰ ساحل صاحب 17 اگست کو رامپور کے سائیں اسپتال سے دہلی کے میٹرو اسپتال میں بہت تشویشناک حالت میں داخل کرایا گیا تھا جہاں ان کا کووڈ۔19 کا ٹیسٹ پازیٹو آیا جس کے بعد ان

کو انتہائی نگہداشت والے قرنطینہ وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔ اس سے پہلے مرتضیٰ ساحل پچھلے ایک سال سے سروائیکل کی تکلیف میں مبتلا تھے اور زیر علاج تھے لیکن بقرعید کے دوسرے دن ان کی حالت بگڑنے لگی تھی جس کی وجہ سے انھیں اسپتال میں داخل کرنا پڑا وہاں بھی ان کو افاقہ نہیں ہوا جس کی وجہ سے انھیں دہلی کے میٹرو اسپتال منتقل کیا گیا مگر کووڈ 19 کے انفیکشن کی وجہ سے وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ آخر رات گیارہ بجے زندگی کی آخری سانس لی اور اپنے مالک سے ملنے راہ عدم ہوئے۔ کووڈ 19 کی وجہ سے اسپتال کے پروٹوکول کے تحت ان کو رامپور لے جایا گیا جہاں فجر میں محلے کے املی والے قبرستان میں نماز جنازہ صرف قریبی رشتے داروں نے ادا کی اور ساڑھے سات بجے ان کو سپرد خاک کیا گیا۔ مرتضیٰ ساحل تسلیمی کے انتقال سے اردو دنیا بالخصوص ادب اطفال سے وابستہ ادبا و شعرا مغموم ہیں۔ مرتضیٰ ساحل کو مکتبہ الحسنات رامپور کے بانی عبدالحئی ملک صاحب نے عنوان شباب سنہ 1978 میں

رسالہ نور کا مدیر مقرر کیا اور ان کو بچوں کے لیے لکھنے کی ترغیب دی۔ کچھ دنوں کے بعد مکتبہ الحسنات کے سارے رسالے الحسنات، نور، بتول، ہلال اور ہندی کے رسالہ ہادی کی ادارت بھی ان کو مل گئی۔ مرتضیٰ ساحل کی ادارت میں رسالہ نور ادب اطفال کا برصغیر ہندوستان پاکستان کا مقبول رسالہ بن گیا۔ نور کا ریڈیو نورستان اور خطوط کا کالم ایک منفرد پہچان کی وجہ سے خاص و عام میں بہت دلچسپی سے مطالعہ کیا جاتا تھا۔ مرتضیٰ ساحل تسلیمی کا تخلیقی سفر بہت کامیاب اور روشن رہا۔ انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں نظمیں ڈرامے مضامین مزاحیہ نظمیں خواتین کے لیے اصلاحی افسانے نظمیں اسلامی مضامین اور بہترین اداریے تحریر کیے۔ مرتضیٰ ساحل کی بچوں کے لیے پچاس سے اوپر کتابیں ہیں تقریباً پچیس کتابیں افسانے، شاعری، ناول اور اسلامی و اصلاحی مضامین پر مشتمل ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 23 اگست 2020

مولانا امین عثمانی

نئی دھلی: علمی و تحقیقی ادارہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سکریٹری مولانا امین عثمانی ندوی 2 ستمبر 2020 مطابق 13 محرم 1442ھ بروز بدھ ہمدرد دہلی کے مجیدیہ اسپتال میں اپنی عمر کی تقریباً 68 بہاریں گزار کر راہی ملک عدم ہوگئے۔ وہ گذشتہ ڈیڑھ ماہ سے بیمار چل رہے تھے۔ ان کے انتقال سے علمی و دینی حلقے میں رنج وغم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مولانا امین عثمانی بلا کے ذہین اور باصلاحیت و سنجیدہ عالم دین تھے۔ ندوۃ العلما سے فارغ التحصیل عربی اردو اور انگلش زبانوں میں لکھنے، پڑھنے اور بولنے پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ عالم اسلام اور فکری موضوعات پر انھیں خصوصی امتیاز حاصل تھا۔ وہ فقہ اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کے تربیت یافتہ اور معتمد خاص تھے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام کے وقت سے ہی اس سے وابستہ تھے اور بطور سکریٹری بڑی خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مولانا امین عثمانی صوبہ بہار کے ضلع گیا میں مشہو خانقاہ فردوسیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے پسماندگان میں آپ کی اہلیہ، دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 ستمبر 2020

ڈاکٹر عبدالقادر شمس

نئی دھلی: راشٹریہ سہارا اردو کے سینئر صحافی ڈاکٹر عبدالقادر شمس قاسمی کا 25 اگست کو مجیدیہ اسپتال میں کورونا

انفیکشن کی وجہ سے انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔ وہ گذشتہ تقریباً ایک ماہ سے بیمار تھے۔ وہ کورونا سے متاثر تھے جس کا پتہ بعد میں چلا۔ انھیں چند روز قبل پلازمہ بھی چڑھایا گیا تھا اور اس کے بعد ان کی طبیعت میں کچھ بہتری آرہی تھی لیکن اچانک طبیعت خراب ہونے کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہہ گئے۔ وہ صحافت کے ساتھ سماجی سرگرمیوں میں بھی سرگرم اور بہت فعال تھے۔ سیمانچل کی فلاح و بہبود اور وہاں کے مسائل اٹھانے کے لیے قائم سیمانچل میڈیا منچ کے نائب صدر بھی تھے۔ اس کے علاوہ کئی اداروں سے وابستہ بھی تھے۔ عبدالقادر شمس دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی کی تھی۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ راشٹریہ سہارا میں خدمات انجام دینے سے پہلے وہ کئی ملی تنظیموں میں کام کرنے کے ساتھ ادارتی فرائض بھی انجام دے چکے تھے۔ ان کے انتقال پر صحافی برادری اور مختلف شعبوں سے وابستہ افراد نے تعزیت پیش کی ہے۔ پروفیسر اختر الواسع نے گہرے رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم (عبدالقادر شمس) اردو صحافت کے روشن ستارہ تھے اور نہایت خوش اخلاق، ملنسار، انسان دوست تھے اور مولانا قاضی مجاہدالاسلام جیسی شخصیت کی تربیت میں پروان چڑھے تھے۔ ان کے انتقال سے اردو صحافت کا ایک مضبوط ستون منہدم ہوگیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اگست 2020

عاقل جونپوری

جونپور: شہر کے محلہ شیخ محامد کے رہنے والے شاعر، ادیب، صحافی، عاقل جونپوری کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ شیر والی مسجد کے امام قاری ضیا نے ادا کرائی۔ ان کی موت کی اطلاع ملتے پر ادبی دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ کورونا دور میں ہزاروں مداح اور خیرخواہ چاہ کر بھی ان کی تدفین میں شامل نہ ہوسکے۔ واضح رہے کہ شاعر عاقل جونپوری کا تعلق ادبی گھرانے سے تھا۔ ان کے والد کامل شفیقی کا شمار انقلابی شاعروں میں ہوتا تھا۔ ان کی شہرت ملک ہی نہیں بیرون ممالک میں بھی تھی۔ ادب کی دنیا میں کامل شفیقی کے اشعار لوگ آج بھی احترام سے پڑھتے اور سنتے ہیں۔ کامل شفیقی کے بڑے بیٹے عاقل جونپوری 1955 میں پیدا ہوئے۔ گورکھپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کرنے کے بعد صحافت میں قدم رکھا اور ہندوستان کے مایہ ناز اخباروں میں کام کیا جس میں ممبئی میں 'انقلاب' اخبار میں خدمات انجام دینے کے دوران والدین کی طبیعت خراب ہونے پر جونپور لوٹ آئے۔ 1989 میں قومی آواز میں نائب ایڈیٹر کے طور پر کام کیا۔ اس کے بعد بنارس سے شائع ہونے والے 'آواز ملک' میں آڈیٹوریل ڈیسک انچارج کے عہدے پر فائز رہے۔ موجودہ وقت میں ماہانہ شائع ہونے والی کتاب سے وابستہ تھے۔ اس کے علاوہ شاعری سے دلچسپی تو ان کی وراثت میں ملی تھی۔ 17 سال کی عمر میں اشعار کہنے لگے تھے۔ بہترین نظمانے مشاعرہ میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اگست 2020

اشوک ساحل

کھتونی: مظفرنگر کے معروف شاعر اشوک ساحل کا طویل علالت کے بعد میرٹھ میں علاج کے دوران انتقال ہوگیا۔ اشوک ساحل کے انتقال کی خبر سے شعری و ادبی حلقوں سمیت سیاسی و سماجی حلقوں میں غم واندوہ کی لہر دوڑ گئی۔ اشوک ساحل کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے امام وخطیب مولانا خالد زاہد قاسمی نے کہا کہ اشوک ساحل قومی یکجہتی وفرقہ وارانہ ہم آہنگی کے علمبردار تھے۔ ان کے انتقال سے ادبی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا ناممکن ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ اشوک ساحل اردو کے عاشق اور گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ انھوں نے کہا کہ مراد آباد شہر جگر سے اشوک ساحل کا گہرا تعلق رہا ہے۔ انھوں نے مراد آباد کے کئی مشاعروں میں شرکت کی اور سامعین ان کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے۔ منصور عثمانی نے یہ بھی کہا کہ اشوک ساحل میں بھی راحت اندوری کی طرح قلندر مزاجی تھی اور دونوں ایک دوسرے کے اچھے دوست بھی رہے ہیں۔ ممتاز شاعرہ ڈاکٹر مینا نقوی نے کہا

کہا کہ اشوک ساحل منفرد لب ولہجہ کے شاعر تھے۔ اردو زبان سے بے پناہ عشق رکھنے والے شاعر اشوک ساحل کی کمی ہمیشہ محسوس کی جاتی رہے گی۔ انھوں نے اشوک ساحل کے سانحہ ارتحال پر اپنے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ انور کیفی نے کہا کہ اشوک ساحل کو اردو زبان وادب پر بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ مراد آباد میں ان کے کلام و انداز کو بے حد پسند کیا جاتا تھا۔ ان کے انتقال کی خبر سے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی کے سابق رکن شاعر وصحافی سید محمد ہاشم نے کہا کہ اشوک ساحل کی موجودگی مشاعروں اور سامعین کو تقویت دیتی تھی۔ سامعین ان کی باری کا بے صبری سے انتظار کرتے تھے۔ مشاعروں میں ہمیشہ ان کی کمی محسوس کی جائے گی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 اگست 2020

ڈاکٹر نظر الاسلام

دیوبند: دیوبند کے معروف معالج و صحافی ڈاکٹر نظر الاسلام کا مختصر علالت کے بعد قریب 67 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم غریب پرور اور سماجی خدمات میں پیش پیش رہنے والے انسان تھے اور تقریباً 1971 سے مختلف ہندی اردو اخبارات و میگزینوں میں صحافتی خدمات انجام دے رہے تھے۔ ان کے سانحہ ارتحال پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے اتر پردیش اردو اکادمی کے سابق چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ ان کے وارثین کے غم میں ہم بھی برابر کے شریک ہیں اور اللہ رب العزت سے دعا گو ہیں کہ اللہ مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ

مقام عطا فرمائے۔ معروف ادیب وقلم کار سید وجاہت شاہ، عبداللہ عثمانی، ماسٹر شمیم کرتپوری، دلشاد خوشتر اور عبداللہ نواز خان نے بھی اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 ستمبر 2020

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

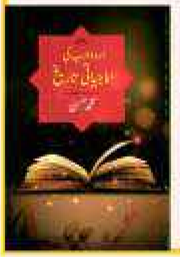

مصنف: محمد حسن

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 334

قیمت: 160 روپے

راسخ عظیم آبادی: کلاسیکیت، شعریت اور انفرادیت

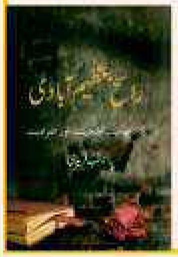

مصنف: ثاقب فریدی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 422

قیمت: 200 روپے

گرونانک: حیات و خدمات

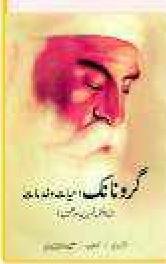

مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے

حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

مصنف/مترجم: حافظ شائق احمد یحییٰ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 132

قیمت: 90 روپے

ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 620

قیمت: 275 روپے

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 364

قیمت: 175 روپے

انیس (سوانح)

مصنف: نیر مسعود

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 427

قیمت: 220 روپے

کلیم عاجز

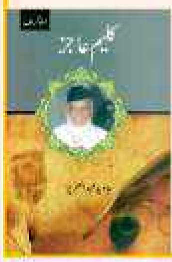

مصنف: جاوید عبدالعزیز

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 124

قیمت: 80 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, October-2020, Vol.22, Issue:10
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:**24/09/2020**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025